۱۸۵۷
نکات اور جہات
حسن مثنیٰ

۱۸۵۷: نکات اور جہات

حسن مثنیٰ

۱۸۵۷: نکات اور جہات

حسن مثنیٰ

1857 Nekat aur Jehat

by

Dr. Hasan Mosanna

Year of Edition : 2008

Price Rs. 400/-

نام کتاب	:	۱۸۵۷ نکات اور جہات
ترتیب وتدوین وناشر	:	ڈاکٹر حسن مثنیٰ
قیمت	:	۴۰۰ روپے
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۸ء
سرورق	:	زہیر حسن (علیگ)، محمد حسن (علیگ)
طبع	:	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006
Mob: 9313972589, Ph. 011-23288452

E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com

انتساب
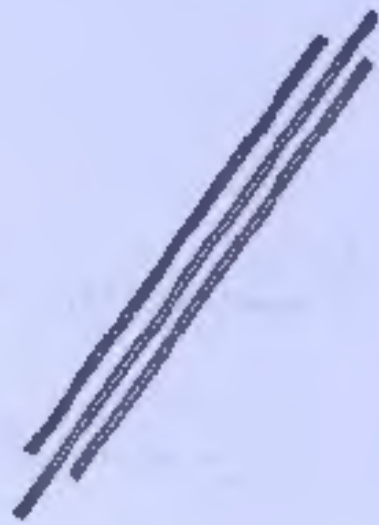
ان حساس لمحوں کے نام جن سے ہم میں حرارت ہے

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

فہرست

۱۸۵۷: نکات اور جہات (1.....145)

سیف و قلم (146.....232)

۱۸۵۷ کی کہانی تصاویر کی زبانی (233۔248)

شعروادب اور دستاویز (249-416)

ذرائع ترسیل وابلاغ اور ۱۸۵۷ (417-456)

۱۸۵۷: نکات اور جہات

"یہ عوامی جنگ ہے اور ہندوستان کی کسی جنگ میں آج تک عوام کی اتنی کثیر تعداد نے حصہ نہیں لیا۔۔ .....لیکن ایک بات کا ہمیں یقین ہے اور وہ یہ کہ خواہ بغاوت دبائی جائے یا نہ دبائی جائے لیکن یہ ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل جانے کی پیش رونقیب ہے"

ارنسٹ جونس

اعتراف

دنیا کی تواریخ اقوام عالم کی عروج وزوال کی کہانی ہے۔ یہ بات اس لئے سچائی پر مبنی ہے کہ ہر دور میں ایک قوم حاکم رہتی ہے تو دوسری محکوم یعنی قومیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ یہ عمل کوئی نیا عمل نہیں ہے بلکہ از آدم تا ایں دم ایسا ہوتا رہا ہے اور شاید آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے۔ بہ فرض محال اگر ایسا نہ ہو تو تاریخ اور تاریخ نویسی دونوں ہی زوال پذیر ہو جائیں گے بلکہ یہ کہیں کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اس کا بین ثبوت بابل ونینوا، یونان ومصر وروم اور ہڑپا موہن جوداڑو یا پھر دیگر تہذیبوں کے احوال وآثار ہیں۔ انہیں کے دامن میں اس دور کی تاریخ پنہاں ہے۔ اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کی ہی بات کریں تو ہمیں اپنی تاریخ کے مختلف تہذیبی آثار آج بھی انہیں حوالوں سے ہاتھ آتے ہیں اور ہم انہیں کے ذریعے اپنی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور فخر ومباہات سے پھولے نہیں سماتے۔ مختصراً یہ کہ تاریخ، سیاسی، معاشی، تہذیبی ومعاشرتی نظام کے شکست وریخت کا ترجمان ہوا کرتا ہے جو مختلف النوع سماجی عمل کے بعد وجود میں آتا ہے اور اس میں اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی عوامل بہر طور کارفرما ہوتے ہیں۔ جب ہی تو تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں، فنا ہوتی ہیں اور اس طرح تاریخیں بھی بننے بگڑنے کے عمل سے گذرتی ہیں۔

اگر آج بھی ہم اپنے انداز سے اپنے ملک کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی حالت کو کہیں یکجا کردیں تو اسے چند دنوں، مہینوں یا پھر چند برسوں کے بعد تاریخی حیثیت مل جائے گی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور شاید اسی سوچ کے تحت ہر زمانے میں تاریخ دانوں اور تاریخ نویسوں نے کام کیا ہوگا جو ہمارے سامنے تاریخ کی شکل میں موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خواہ وہ کسی

بھی ملک وقوم کی تاریخ ہو کچھ اسی طرح وجود میں آئی ہوگی، کیونکہ میرا ماننا ہے کہ تاریخ ہوا میں پیدا ہونے والی کوئی شئے ہرگز نہیں ہے۔ اسے حقائق کو صفحۂ قرطاس پر رقم کر کے ہی وجود میں لایا جاسکتا ہے ورنہ مختلف ادوار میں بادشاہ وسلاطین تاریخ نویسوں کی خدمات نہ لیتے انھیں اعزاز واکرام سے نہ نوازتے، انھیں درباروں میں جگہ نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی سرپرستی کرتے۔

اگر ہم تاریخ ہند کا مطالعہ کریں تو مختلف ادوار میں اس قسم کا عمل دکھائی دیتا ہے جن میں ویدائی عہد، نندا عہد، موریا عہد، گپتا عہد، سلطنت عہد، اور عہد مغلیہ وغیرہ نہایت اہمیت کے حامل دور ہیں جہاں خبر نویسوں اور تاریخ نویسوں، کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اگر عہد مغلیہ کی ہی بات کی جائے تو وہاں بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ آئین اکبری سے مہر نیم روز تک اس کی عمدہ مثالیں ہے۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ جلال الدین اکبر سے عہد مغلیہ کا زرّیں دور شروع ہوتا ہے اور اورنگ زیب تک آتے آتے روز بہ زوال ہونے لگتا ہے اس کا اندازہ بھی ہمیں تاریخ کی کتابوں سے ہی ہوتا ہے۔ اس عہد کی تاریخ اس وقت عجیب سے موڑ سے گزرتی ہے جب ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ یہ دور ہندستان میں سامراجی انگریزوں کی تاریخ کے متشکل ہونے کا دور ہے جس میں ان فرنگیوں کے خلاف حیدر علی، ٹیپو سلطان وغیرہ مزاحم ہوتے ہیں۔ انھیں کامیابی ملتی ہے مگر یہ کامیابی پائیدار نہیں ہوتی اور سوداگر نما سامراجی فرنگی اپنی قوت بڑھانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جبکہ مسلم حکمرانوں کی قوت میں بتدریج کمی آرہی ہے، وجہ صاف ہے کہ نام نہاد اپنوں کی غداری رنگ لارہی ہے۔ سراج الدولہ جیسا جری 1757 میں پلاسی کے میدان میں شکست سے دوچار ہوتا ہے اور انگریز بے مہار ہوجاتے ہیں، اپنی طاقت تیزی سے بڑھانے لگتے ہیں نتیجتاً رفتہ رفتہ پورے ملک پر قابض ہوجاتے ہیں اور مصحفی جیسے شاعر کو کہنا پڑتا ہے کہ:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ شعر اپنے اندر ایک جہان معانی تو رکھتا ہی ہے اسے تاریخی حسیت اور معنویت سے بھرپور شعر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا تاریخیں ایسے نہیں لکھی جاتیں؟ یقیناً تاریخ نویسی اس انداز سے بھی ممکن ہے بلکہ ادب وشعر کا یہی تو کمال ہے کہ اشاروں، کنایوں کے سہارے مدعا حاصل کرلیا جائے۔

اگر اوّلین جنگ آزادی کی ہی بات کی جائے تو اس سلسلے میں مختلف تاریخ نویسوں نے اپنے اپنے طور پر کوشش کی اور تاریخ نگاری کا کام انجام دیا۔ جس میں اردو اور فارسی کے اخبارات، رسالوں، کتابوں، مختلف گواہوں کی شہادتیں، روزنامچوں، دستاویزوں، اشتہاروں، Proclamations، یادداشتوں اور سرکاری رپورٹوں وغیرہ نے اہم مآخذ بن کر ان کا ساتھ نبھایا جس سے ہم پر اس انقلاب کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال W.H.Russel کی رپورٹنگ میں بھی جھلکتی ہے جو The London Times کا نامہ نگار تھا۔ اس نے اپنے طور پر اس جدوجہد کی رپورٹنگ تو کی ہی چند ضروری اطلاعات جسے وہ پردۂ خفا میں رکھنا چاہتا تھا اپنی ذاتی ڈائری میں بھی درج کرلیں جسے ''رسل ڈائری'' کے نام سے شہرت ملی۔ یہ ڈائری جنگ آزادی سے متعلق سامراجی فرنگیوں کی مکروہ حرکتوں کا سچا بیان ہے اور حقیقت حال جاننے کا اہم ذریعہ بھی، اسے حقائق انقلاب کا سرچشمہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔

1857 کی اوّلین جدوجہد آزادی تاریخ ہندوستان کا ایک اہم سنگ میل اور نشان راہ ہے جس کی کہانی مختلف تاریخ نویسوں، تاریخ دانوں، ادباء وشعراء نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے یہاں ہم صرف تاریخ کے حوالے سے گفتگو کریں گے کہ کس طرح ہماری تاریخی جدوجہد کو منفی انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ان میں سے بیشتر افراد نے کسی مجبوری کے تحت یا سستی شہرت کی خاطر اس انقلاب کو جدوجہد آزادی نہیں مانا ہے بلکہ اسے ''غدر'' یا Mutiny کے نام سے موسوم کیا ہے۔

1857 کی جنگ آزادی اگر عام ہندوستانیوں کے لئے اوّلین جنگ آزادی تھی تو اس کی تشریح وتعبیر مورخین نے اپنے اپنے طریقے سے کی ہے مثلاً رائٹ ہومس نے اپنی تصنیف ''ہسٹری آف انڈین میوٹنی'' کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ انقلاب یک ایکی جنگ کے مثل تھی جو فوجیوں میں موجود بے چینی کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ اسے عوام میں موجود کرب کے اظہار کی کوشش کہا جائے گا۔ اس کا ماننا ہے کہ یہ جنگ تعلقداروں، زمینداروں، گوجروں اور بدمعاشوں کی سازش سے ہوئی تھی جن کے مفاد پر انگریزوں نے چوٹ کی تھی۔ اسی قسم کا خیال الگزنڈر ڈف کا بھی ہے اس کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں جو عام لوگ شریک ہوئے وہ بدامنی کا فائدہ اٹھا کر نجی مقاصد کے

حصول کی خاطر کوشاں تھے نہ کہ انہیں اس جنگ سے کچھ لینا دینا تھا، کچھ اسی قسم کا خیال ولیم میور کا بھی ہے اس کی نظر میں یہ جنگ انگریز حکمرانوں اور فوجیوں کے درمیان ایک جنگ تھی۔

1857 کے انقلاب کے ایک اہم مورخ جان ولیم کے نے اپنی مشہور و معروف تصنیف "The History of Sepoy War" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگ صرف فوجی غدر نہیں تھی۔ بلکہ اس میں طبقہ اشرافیہ خصوصا برہموں کا اہم رول تھا اس کی نظر میں اس جدوجہد کے در پردہ کوئی سماجی یا معاشی وجہ کارفرما نہیں تھی جو کہ سراسر غلط ہے۔ ہاں اس کے اس موقف سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس انقلاب کی اہم وجہ مذہبی تھی کیونکہ تمام ہندوؤں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ انگریز ان کے مذہب کے در پے ہیں اور وہ نہ صرف ان کے مذہبی رسوم اور آستھا پر قدغن لگانے کیلئے مختلف چالیں چل رہے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ عوام کو عیسائیت کی جانب راغب کیا جائے۔ اسی قبیل کا ایک اور مورخ ملیسن بھی ہے جو اس جنگ کو صرف فوجی غدر ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔ اس نے اپنی تصنیف The Mutiny Of The Bengal Army کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس جنگ میں فوجی تو شریک تھے ہی اس میں ان کے ہمنوا کچھ ایسے رہنما بھی تھے جو انگریزوں کو اس ملک سے اکھاڑ پھینکنے کی سازش کر رہے تھے جس میں بہادر شاہ ظفر، حضرت محل، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، مولوی احمد اللہ شاہ، جھانسی کی رانی اور ویر کنور سنگھ نے اہم کردار ادا کیا۔ کچھ اسی قسم کا خیال الفرڈ لائل کا بھی ہے لیکن وہ اس جنگ کیلئے مسلمانوں کو مورد الزام قرار دیتا ہے اور فوجیوں کو صرف ان کا آلہ کار۔ انگریزوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اس بغاوت کیلئے ہندوؤں کو ذمہ دار مانتا ہے اور مسلمانوں کو ان کا آلۂ کار۔ یہ تو ان مورخین یا تاریخ نویسوں کا ذکر تھا جو ہماری اولین جدوجہد آزادی کو تعصب کی عینک سے دیکھتے پرکھتے ہیں اور اسے ہی مشتہر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستانی مورخین بھی پیچھے نہیں ہیں بلکہ ان یورپی مورخین سے متاثر مورخین میں رمیش چندر مجمدار، رجنی پام دت، تاراچند، سریندر ناتھ سین وغیرہ کا نام نامی بھی آتا ہے جنھوں نے اپنی اپنی جادو بیانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے محض ایک فوجی بغاوت سے تعبیر کیا ہے حتیٰ کہ وہ اس بات سے بھی انکار کرتے ہیں کہ یہ جنگ اولین جہاد برائے آزادی تھی۔ ان تاریخ نویسوں کو بنجامن ڈزرائیلی سے سبق لینا چاہئے جس نے ہاؤس آف

کامنس میں تقریر کرتے ہوئے اسے عوامی بغاوت کے مماثل قرار دیا تھا۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ ہمارے تاریخ داں جدوجہد آزادی کو قومی بغاوت کی علامت کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ The Indian Mutiny کے مصنف J.W.Forest کی طرح جہادیوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ہاں وہ فارسٹ کی طرح ان جہادیوں کو بے دریغ پھانسی پر لٹکا دیے جانے کی وکالت نہیں کرتے۔

ہماری نظر میں انھیں The Other Side Of The Medal کے مصنف Edward Thompson سے سبق لینا چاہیے تھا جو فارسٹ کے نظریے کا مخالف تھا جس نے اس وقت انگریزوں کے ذریعے روا رکھے جانے والے انتقامی طریقوں کو غلط قرار دیا تھا۔

انگریزوں سے متاثر مورخین نے انقلاب 1857 کی تشریح کرتے وقت اس کے تار وہابی تحریک سے ہوتے ہوئے القاعدہ اور طالبان تک سے جوڑ دیے اس پر منظم احتجاج کرنے کی ضرورت ہے۔ سن 2007 سامراجیت کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی ہماری اولین کوشش یعنی 1857 کی جدوجہد آزادی کا 150 واں سال ہے اس موقع پر ہمیں مزید غور وفکر کرنا ہے تاکہ منفی سوچ رکھنے والوں تک اپنا پیغام پہنچایا جا سکے۔ دراصل یہ کام بہت پہلے مارکس اور ڈزرائیلی نے کیا تھا کہ برطانوی حکمراں جسے غدر اور Mutiny کہہ کر نظر انداز کرنا چاہتے تھے اسے ان لوگوں نے قومی بغاوت یا ہندستان کی اولین جدجہد آزادی گردانا تھا لیکن ان کے اس موقف پر اس قدر بحث نہیں ہو پائی جو کہ اس کا حق تھا۔ آج جب کہ ہمارے ملک کی سیاسی سماجی و معاشی حالت میں کافی تبدیلی آگئی ہے اس ذہنیت پر ضرب کاری لگانا ہمارا فرض ہے، خصوصا ان تاریخ دانوں کی سوچ پر جو ہماری قومی جدوجہد کو غدر جیسے لفظ سے بدنام کرتے ہیں۔

بہر حال اب ہم پر نہ تو کسی قوم وملک کا تسلط ہے اور نہ ہی ہم پر کسی قسم کا جبر روا رکھنے کوئی قوت برسر پیکار ہے کہ اس کے خوف سے ہم سچائی سے دامن بچائیں اور وہ کچھ کہنے پر مجبور نظر آئیں جو ہماری تاریخ کو مسخ کر دے۔ خدا کا شکر ہے کہ برسوں کی غلامی کے بعد ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور اب ہم ان تاریخی حقائق اور ان حالات واقعات کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں جن میں لاکھوں افراد تہہ تیغ کر دیے گئے۔ یہاں کسی قسم کی

مصلحت پسندی کا گزر نہ ہو تو بہتر ہے۔ یقیناً اس جنگ نے ہمیں بہت سارے سبق سکھائے ہیں جن میں متحدہ قومیت کے طور پر ابھرنے کا ہنر نہایت اہم ہے اور یہی آج بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس انقلاب نے ہمیں سامراجیت سے نجات پانے کی راہ دکھائی ہے، اور یہ سکھایا ہے کہ اگر عزم مصمم ہو تو منزل خود ہی قدم چومتی ہے۔ حالانکہ اس جنگ کے بعد ہم پر غلامی کا بار گراں اور بڑھا دیا گیا تھا اور ہم سے ایک خاص جذبہ کے تحت انتقام لیا جانے لگا تھا، ہم پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا، قتل و غارت گری اور دار و رسن کی آزمائش ہندوستانیوں کا مقدر بن گئے تھے لیکن ایسے ماحول میں بھی ہمارے پایۂ استقلال میں کمی نہ آئی۔ اس کا ثبوت وہ پرعزم جیالے ہیں جنھوں نے اس مشن میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس جدوجہد کے لئے تمام ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور ان کے ساتھ حد درجہ زیادتیاں کی گئیں۔ گو کہ اس جدوجہد میں ہندو مسلمان بھی شانہ سے شانہ ملا کر فرنگیوں کو ملک سے باہر کھدیڑنے کے درپے تھے، خواہ اس کی وجہ سیاسی و معاشی ہو کہ مذہبی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تاریخ کے اس اہم موڑ اور مورچے پر سبھی ساتھ تھے ایسا ہونا ایک فطری عمل تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ہندو مسلمان دونوں ہی ایک قوم ہیں اور دونوں نے ہی اس ملک کو اپنا وطن مانا ہے۔ وہ یہاں کی آب و ہوا میں سانس لیتے آئے ہیں، گنگا جمنی تہذیب میں پروان چڑھتے چلے آئے ہیں، دونوں ہی نے ہر ایک کے دکھ سکھ میں ساتھ دیا ہے حتیٰ کہ ان کے طور طریقے اور رسم رواج میں بھی ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو ان کے فلاح و بہبود کی ضامن ہے۔ اسی لئے تو عہد حاضر کے عظیم تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب اسے قومی جدوجہد قرار دیتے ہیں اور ہم بھی یہ ماننے کو قطعی تیار نہیں ہیں کہ یہ واقعہ غدر یا فوجی بغاوت بھر تھا کیونکہ اس جنگ میں دہلی، نواح دہلی اور ہریانہ سے لیکر بہار تک کے عوام نے بلکہ اس سے قطع نظر دیگر دور دراز مقامات کے عوام نے تن من دھن سے شرکت کی تھی بلکہ جان کی بازی لگا دی تھی۔ جبھی تو سامراجیت کے نقیب فرنگیوں کو ایسا لگنے لگا تھا کہ انگریزی سامراج کی بساط الٹنے والی ہے بلکہ چند ماہ کے لئے ایسا ہوا بھی اور بہادر شاہ ظفر کو ان کا کھویا ہوا وقار عطا کیا گیا، انھیں ملک کا بادشاہ اور رہنما بنایا گیا۔ اس کتاب کو ہم اسی عظیم مجاہد کی برسی پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ہماری یہ کوشش اسی مشن کی تاریخ اہمیت کو حقیقت پسندانہ انداز سے اجاگر کرنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے یہ کتاب اردو کے حوالے سے اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں 1857 سے متعلق مختلف نکات اور جہات کا احاطہ کرنے کی عملی سعی کی گئی ہے۔

یہاں یہ مساعی بھی شامل ہے کہ مختلف النوع موضوعات کا کچھ اس قدر احاطہ کیا جائے کہ تشنگی باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ علم کی پیاس کب بجھتی ہے کہ ایسا ممکن ہو پائے گا، ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے۔ بہر حال میں نے اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر ان افراد سے خامہ کی فرسائی کی گزارش کی جو اس انقلاب میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ ان سبھی قلمکاروں نے اپنے مضامین میں کمال ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے موضوع سے پوری طرح انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ کم از کم اس مرحلے پر میں کامیاب و کامران گزرا ہوں اور سبھی مورخین، ادباء اور دیگر قلمکاروں نے حد درجہ جانفشانی سے گزر کر اس کتاب کو دستاویزی شکل عطا کرنے میں میری مدد کی ہے۔ پیش نظر کتاب کی پہلا حصہ ''1857 نکات اور جہات'' ہے جس میں اس انقلاب کے گونا گوں پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جبکہ دوسرے حصے کا عنوان ''سیف و قلم'' ہے جس کے تحت ایسے مضامین یکجا کیے گئے ہیں جس میں ان مجاہدین کا خصوصی ذکر ہے جو سیف و قلم کے دھنی تھے اور اسی کے سہارے انگریزوں سے مقابلہ کر رہے تھے اس حصے میں شامل مضامین کافی وقیع اور کلیدی اہمیت کے حامل ہے۔ ''شعر و ادب اور دستاویز'' کے تحت ان نظموں اور شہ پاروں کو جگہ دی گئی ہے جن کی اہمیت 1857 کے انقلاب کے حوالے سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے جبکہ ''ذرائع ترسیل و ابلاغ 1857'' کے تحت شامل مضامین میں اس زمانے میں رائج ذریعہ ترسیل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز چند اوراق میں ''1857 کی کہانی تصویر کی زبانی'' بھی درج ہے تاکہ ایک غیر جانب دار شخص بھی تصویروں کے حوالے سے سچائی تک پہنچ سکے۔

میرے اس قلمی جہاد میں ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، عابد کرہانی،

ڈاکٹر نجف حیدر، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر رضوان قیصر، مرتضٰی، ہادی سرمدی، عزیز الرحمٰن، اروند، مقصود، ارشاد، راشد اور راہل جیسے دوستوں اور بزرگوں نے ہماری ہر آواز پر لبیک کہا ہے۔ مجھے ان کی محبت اور عنایت پر ناز ہے۔

میں اپنے ان سبھی دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے صرف ایک گزارش پر مقالہ لکھنے اور اسے روانہ کرنے کی حامی بھر لی۔ اس موقع پر استاد محترم پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر عتیق اللہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ہم پر واجب ہے، جنھوں نے کتاب کے سلسلے میں اپنی رائے سے نوازا۔ یہ کتاب شاید اور پہلے منظر عام پر آجاتی لیکن چند ذاتی وجوہات کی بنا پر تاخیر ہوتی چلی گئی اور ایک بار ایسا لگنے لگا کہ اب یہ کام مکمل نہ ہو سکے گا۔ اس موقع پر کتابی دنیا کے پروپرائٹر اور میرے عزیز دوست اقبال علی نے ہمت بندھائی۔ میں ان کی ہمت افزائی کو احترام کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ اس کام میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی اگر اس کٹھن گھڑی میں میرا ساتھ میرے بھائیوں ریحان حسن، زبیر حسن (علیگ) اور محمد حسن (ملیگ) نے مواد فراہم کر کے نہ کیا ہوتا۔ ان سبھی نے مضمون کمپوز کرا کے، ای میل کر کے اور فون کے ذریعے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ میں ان سبھی کی کامیابی و کامرانی کے لئے دعا گو ہوں۔

خدا کرے صف سر دادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

بغاوت کے بیج

آزادی کی جنگ کا آخری دور شروع ہونے کے قریب تھا جب جوش ملیح آبادی نے ایک نظم لکھی تھی: "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" اس میں بدیسی حکمرانوں کو مخاطب کر کے ان کے ہاتھوں ہندوستان کی درگت کا ذکر تھا۔ جنگِ آزادی کے 1857ء والے معرکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا:

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے

اور لکھنؤ پر جو بیتی اسے یوں بیان کیا گیا تھا:

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

اختر تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کا تخلص تھا، اور بہادر شاہ ظفر تخلص کرتے تھے ہندوستان کے بادشاہ تھے، 1857ء کا انقلاب جب ناکام رہنے کی وجہ سے بغاوت بن گیا اور انگریزی حکومت نے اسے 'غدر' قرار دے دیا تو شاہ ظفر کو قید کر لیا گیا اور قیدی کی حیثیت سے ان کو رنگون بھیجنے سے پہلے ان کے سامنے ان کے شاہزادوں کے کٹے ہوئے سر خوان میں رکھ کر پیش کیے گئے تھے۔

انگریز ہندوستان میں سوداگر کی حیثیت سے دہلی کے بادشاہ کی اجازت سے آئے تھے۔ یہ اجازت ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملی تھی جو اپنی مہر میں خود کو شاہ عالم کا 'فدوی' کہتی تھی، اگرچہ بعد کو اس

نے یک طرفہ کاروائی کر کے مہر بدل لی تھی اور شاہ دہلی کو جو نذر پیش کرتی تھی وہ بھی بند کر دی مگر شاہ عالم یا ان کے جانشین اکبر شاہ یا بہادر شاہ ظفر بھی کبھی کسی مرحلے پر کمپنی کے اوپر اپنی حاکمیت یا اقتدار اعلی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ اسی قانون سقم کی وجہ سے لندن کی برطانوی عدالت کے بجائے دہلی کی فوجی عدالت میں چلا گیا اور انگریزی فوج کے افسروں نے من مانا فیصلہ کرلیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسٹ (EAST) یعنی مشرقی ممالک میں تجارتی سرگرمی جاری کرنے کا پروانہ یعنی چارٹر برطانی پارلی منٹ نے دیا تھا لیکن اس کے ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ ظاہر ہونے لگا کہ وہ تجارت کرنے کے بہانے حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ بیو پاریوں کے ساتھ انگلینڈ سے فوجی بھی آئے تھے اور باردی بھی۔ ہندستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے ٹکراؤ سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں اور ڈائرکٹروں کے درمیان بھی ٹکراؤ کے واقعات کا تذکرہ پُرانے ریکارڈ میں ملتا ہے۔ مثلاً 1683ء میں بمبئی کے جزیرے پر تعینات انگریزی فوج کے کمانڈر کپتان رچرڈ کیگ وین اور ان کے ماتحت فوجیوں نے کمپنی کی زیادتیوں کے خلاف بغاوت کردی اور جس علاقے کی حفاظت پر وہ تعینات تھے اس پر قابض ہو گئے اور سال بھر تک قابض رہے۔

کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ بلکہ ان سے زیادہ نمایاں طور پر اس کی سیاسی چیرہ دستیاں بڑھتی گئیں، اس کی فوج میں افسر تو سب انگلستان سے آئے ہوئے (انگریز) ہوتے تھے مگر سپاہیوں میں ہندوستانی بھی بھرتی کیے جانے لگے۔ ان کو روٹی روزی کی طرف سے اطمینان ہوا تو عزت آبرو اور اختیار و اقتدار کا خیال آیا۔ انگریز سب اختیار و اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی طرف سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔

چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی ہوئیں جن میں بعض کچھ "موٹی" ہوگئیں لیکن وہ سختی سے دبا دی گئیں۔ 1857ء کی بغاوت کی طرح پھیلنے نہیں پائیں۔ ہندستانی سپاہ کی پہلی بغاوت جو دھر سے یاد نہ آئی کی گئی تھی 1780ء میں تیلی چیری میں ہوئی جب کنڑ بٹالین سے کہا گیا کہ اس کی جگہ تعیناتی کے لیے بمبئی سے پلٹن آرہی ہے۔ بعد میں یہ خبر افواہ نکلی تو کنڑ بٹالین نے جو مدراس سے لائی گئی تھی کام بند کر دیا اس کے ایک جوان کو حکم عدولی کے لیے دوسروں کو اکسانے کے الزام

میں توپ دم کر دیا گیا اور دو کو ہزار ہزار کوڑوں کی سزا دی گئی۔ چند ہی مہینے بعد وزاگاپٹم میں تعینات پلٹن نے مدارس جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مقامی ڈیوٹی کے لیے بھرتی ہوئی ہے۔ اس پلٹن کے لوگوں نے تین انگریز افسروں کو گولی مار دی۔ یہ بغاوت بھی آہنی اقدام سے دبا دی گئی۔

جنوبی ہند کے مقام ویلور کی 1806ء والی بغاوت پچاس برس بعد ہونے والی شمالی ہند کی 1857ء والی بغاوت سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں نئی رائفل کے ان نئے کارتوسوں کی وجہ سے بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جن کی بابت یہ کہا گیا تھا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی استعمال ہوئی ہے اور ان کو رائفل میں بھرنے سے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مدراس کی پیدل پلٹن سے کہا گیا کہ اسکا کوئی آدمی ذات برادری ظاہر کرنے والا نشان نہ لگائے داڑھی مونچھ نہ رکھائے اور نئی پگڑی لگائے جس پر لگنے والے عہدے اور سرکاری اعزازات کے نشان چمڑے کے ہوں۔ عام لوگوں نے اس ضابطے کو مذہب بدلوانے کی کوشش سے تعبیر کیا۔

ویلور کی بغاوت سے لے کر 1857ء میں میرٹھ کے معرکے تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں تقریباً ایک درجن بغاوتیں ہوئیں جو انگریزوں کے خلاف نفرت اور غم و غصے کے اظہار کے طور پر کی گئی تھیں اس مفر ممکن نہیں۔

باغیوں میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی تھے مگر اس میں کچھ کمپنی کے انگریز ملازم بھی تھے۔ ہندوستانیوں کی بغاوت کے اسباب زیادہ تر معاشی ہوتے تھے اور انگریز باغیوں کو بھی عام طور پر یہ شکایت تھی کہ کمپنی کے ڈائرکٹر اور اعلیٰ عہدے دار لوٹ کی تقسیم میں انھیں اتنا حصہ نہیں دیتے تھے جتنا ان کے خیال میں ان کا حق تھا۔ ہندوستانیوں کی شکایتوں میں کبھی کبھی مذہب کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ اس لیے کہ کمپنی کے ذمہ دار کبھی ان کے مذہبی عقائد کے خلاف ضابطے بناتے اور رائج کرنے کی کوشش کرتے اور کمپنی کی حمایت یافتہ مشنری جس میں زیادہ تر انگریز تھے ہندوستان میں رائج مذہبوں پر جارحانہ انداز کی نکتہ چینی کرتے اور ایسی نکتہ چینی بعض اوقات مذہبی تقریبات کے موقع پر میلوں اور ٹھیلوں میں کی جاتی اور نکتہ چینی کرنے والوں کے ساتھ پولیس یا فوج کے سپاہیوں کی موجودگی لوگوں میں یہ تاثر پیدا کر دیتی کہ یہ نکتہ چینی حکمرانوں کی شہ پر ہو رہی ہے۔ انگریز پادریوں کے انداز سے اس تاثر کو تقویت ملتی اور ہندوستان کے لوگ سمجھتے کہ انگریز ان

کے سیاسی اور معاشی استحصال کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی استحصال کے بھی درپے ہیں۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں کاروبار شروع کرنے کی جو اجازت یہاں کے حکمرانوں نے دی تھی اور اس سلسلے میں جو چارٹر انگلستان کی پارلیامنٹ سے منظور ہوا تھا اس میں اس بات کی صراحت کردی گئی تھی کہ کمپنی یہاں کے عقیدوں اور ریت رواج کا لحاظ اور احترام ملحوظ رکھے گی۔

کمپنی کے چارٹر میں مذہبی سرگرمی پر جو بندش شروع میں لگائی گئی تھی وہ برطانوی پارلیامنٹ نے وہاں کے مذہبی اداروں کے دباؤ میں آکر ہٹا دی۔ اس ڈھیل سے جہاں ایک طرف مذہب کا جارحانہ استعمال کرنے والوں کی ڈھٹائی بڑھ گئی وہاں دوسری طرف ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں اور انکے عقیدت مندوں کی ناراضگی میں اضافہ ہوگیا۔ انھیں یقین ہوگیا کہ ان کی دنیا ہی نہیں، دین دھرم بھی خطرے میں ہے اور اس خطرے سے نکلنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کو دیس سے نکالنا ضروری ہے۔ اور ایک طرف انگریزوں کے قدم جمانے کے جتن کیے جا رہے تھے اور دوسری طرف ان کے قدم اکھاڑنے کے طریقے سوچے جا رہے تھے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں بہ ظاہر انگریزوں کے قدم جمتے جا رہے تھے لیکن ان کے مظالم کے ساتھ ہی ہندوستانیوں کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوتا جا رہا تھا اور آزادی کی جنگ کے ہیرو تیار ہو رہے تھے۔ انھیں میں ایک تھیں جھانسی کی رانی لکشمی بائی۔ وہ 18 برس کی تھیں جب 1842ء میں ان کی شادی جھانسی کے مہاراجہ گنگادھر راؤ بابی راؤ سے ہوگئی نو برس بعد گنگا دھر راؤ کا انتقال ہوگیا۔ انتقال سے پہلے انھوں نے نانا صاحب کو گود بٹھا لیا تھا۔ اس لیے کہ ان کی کوئی سگی اولاد نہیں تھی۔ اس سے پہلے 1818 میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جھانسی کا راج پاٹ ان سے لیا تھا تو ان کی پنشن آٹھ لاکھ روپے سالانہ طے ہوگئی تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد کمپنی نے پنشن دینے کے معاہدے کو یک طرفہ فیصلے سے منسوخ کردیا مگر نانا صاحب پیشوا کی راج گدی پر اپنا حق جتاتے رہے اور اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے انھوں نے عظیم اللہ کو مختار بنا کر انگلستان بھیجا مگر انگریزوں نے ان کی ایک نہ سنی اور نانا صاحب کی پنشن بحال کرنا تو درکنار برہم ورت کے راج پر ان کا حق ملکیت تسلیم کرنے سے بھی انکار کردیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے یہ کہہ کر کہ جھانسی چوں کہ کمپنی کے زیر انتظام علاقے کے بیچ میں واقع ہے اس لیے اس کا انتظام بھی ہماری مرضی کے مطابق ہونا چاہیے اور وہاں کی رعایا کو اس انتظام

سے بہت فائدہ ہوگا رانی جھمی بائی کی جھانسی کو غصب کر لیا مگر اس میں شک نہیں کہ 1853ء میں انگریزوں کو اس پر قبضہ جمانے میں لوہے کے چنے چبانے پڑے۔

کمپنی کے غاصبانہ قبضے سے پہلے جھانسی ایک چھوٹی سی مرہٹہ ریاست کی راجدھانی تھی جو پیشوا کی بڑی مرہٹہ ریاست کی باج گزار تھی۔ انگریزوں نے اسے اپنا محکوم بنانے سے پہلے پیشوا سے ناتا توڑ لینے کی ترغیب دی۔ اس تعلق کے ٹوٹ جانے سے دونوں ریاستیں کمزور ہو گئیں اور بیرونی طاقت کا کام آسان ہو گیا۔ اس نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔ یہی چال اودھ کے ساتھ بھی چلی گئی۔ پہلے یہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ تھا جس پر نواب وزیر دہلی کے بادشاہ کے صوبیدار کی حیثیت سے راج کرتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جو نواب وزیر تھے وہ بادشاہ بن گئے کمپنی نے اس کی بادشاہت تسلیم کر کے ان کو اپنا محکوم بنانے کی سمت میں قدم بڑھایا اور اودھ کی محکومی نے پورے ہندستان پر کمپنی کی حکمرانی کے لیے راہ ہموار کر دی۔ بکسر کی لڑائی کو جو 1764 میں ہوئی اس کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ اس لڑائی میں شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم کے متحدہ محاذ نے، جس میں اندرونی انتشار اور باہمی خود غرضی کی وجہ سے بنیادی کمزوری پائی جاتی تھی، انگریزی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ شاہ عالم کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو دینا پڑی۔ شجاع الدولہ کو بھی دب کر صلح کرنی پڑی، اور تب سے یہ دباؤ برابر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ واجد علی شاہ کو اودھ سے کلکتہ لے جا کر مٹیا برج میں قید کر دیا گیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد کمپنی نے اودھ کے حکمراں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے انگریزی فوج رکھیں اور اس کی تنخواہ اور بھتہ کے لیے 16 لاکھ روپے سالانہ دیا کریں۔ یہ ایک طرح سے اودھ کے خزانے میں نقب لگانے اور اسے لوٹنے کی ابتدا تھی۔ انگریزی فوج جو بہ ظاہر اودھ کی حفاظت کے لیے بلائی نہیں بلکہ زبردستی مسلط کی گئی تھی اس کی تعداد اور بڑھتی ہوئی فوج کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے لیے رقم کا مطالبہ بھی بڑھتا گیا۔ پھر کہا گیا کہ شاہی خزانہ چوں کہ یہ رقم ادا نہیں کر سکتا اس لیے مقررہ رقم کے بجائے مطلوبہ علاقہ کمپنی کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح روہیل کھنڈ اور دوآب کا علاقہ شاہ اودھ کی عملداری سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں چلا گیا۔

1801 کے معاہدے میں کمپنی کے ذمہ داروں کی چالاکی اور شاہ اودھ کے صلاح کاروں

کی نادانی یا غداری کی وجہ سے ایک شق یہ شامل کردی گئی کہ شاہی حکومت رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے گی اور رعایا کے جان و مال کی حفاظت کرے گی۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں کمپنی نے اسی شق کی آڑ لے کر اودھ کے بچے کھچے علاقے اور شاہ اودھ کے باقی ماندہ اختیار و اقتدار پر بھی قبضہ کرلیا۔

میرزا واجد علی بہادر 13 رفروری 1847ء کو واجد علی شاہ بنے۔ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں انھوں نے کاروبار حکومت کا جو تجربہ اور مطالعہ کیا تھا اس میں انھوں نے دیکھا تھا کہ 1801 کے معاہدہ کو منسوخ کرکے کمپنی نے 1873ء میں جو نیا معاہدہ کیا تھا اس نے سلطنت کو اور کمزور کردیا تھا۔ اس کی صحت بحال کرنے کی کوشش انھوں نے فوج کو چاق و چوبند بنانے سے شروع کی۔ ہر پلٹن کے ہر آدمی کے۔ لیے ہر روز پریڈ پر حاضری ضروری قرار دے دی گئی۔ پریڈ میں وہ خود بھی سپہ سالار کی وردی پہن کر آتے اور غیر حاضری پر دوسرے فوجیوں کی طرح وہ خود بھی دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرتے۔

انھوں نے فوج کی از سر نو تنظیم بھی شروع کردی اور اپنی دریا دلی اور عدل گستری سے رعایا میں بھی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر کمپنی کے کارندوں اور خوشامدیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اتفاق سے انھیں دنوں شاہ بیمار پڑ گئے۔ شاہ کو فوج کی پریڈ میں روزانہ شرکت نہ کرنے اور کاروبار سلطنت میں براہ راست حصہ نہ لینے کا مشورہ دیا گیا اور ان کی توجہ تفریحات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش بلکہ سازش کی گئی اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ اودھ کے کسی چپہ پر بھی اور نام کو بھی شاہ کا اقتدار باقی نہ رہے۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کا ایک پیغام جو دراصل حکم نامہ تھا' لے کر ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم واجد علی شاہ کے محل میں گئے جس میں کہا گیا تھا کہ چوں کہ انھوں نے 801. کے معاہدے کی پابندی نہیں کی ہے اس لیے اودھ کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے۔

واجد علی شاہ نے اور ان کی والدہ نے لاکھ کہا کہ سلطنت کی ضبطی کی بات کا 1801 کے معاہدہ میں کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ کہ شاہی خاندان کے کسی دوسرے فرد کو اودھ کی سلطنت سونپ دی جائے لیکن جنرل اوٹرم اپنی بات پر اڑے رہے اور آخر میں انھوں نے یہ بات مان لی کہ اودھ کے تاجدار اپنا معروضہ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرسکتے ہیں مگر ان کو اودھ کی

سلطنت سے دستبردار ہونا پڑیگا چنانچہ واجد علی شاہ اپنے خاندان کے چند افراد اور کچھ وفادار ملازمین کو لے کر لندن جانے کے ارادے سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ پھر بیمار پڑ گئے، ان کی والدہ البتہ لندن گئیں مگر وہاں ان کی کسی نے نہیں سنی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

واجد علی شاہ کی بچی کچھی سلطنت 7/فروری 1856 کو ان سے چھین لی گئی۔ اس وقت دہلی میں مغلیہ سلطنت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ انگریز کم و بیش سو برس سے اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی عمر اس وقت 81 برس کی ہو رہی تھی۔ اودھ کی سلطنت کے انتزاع نے ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا اور ان کی رعایا کو بھی بے چین کر دیا۔ بے چینی کمپنی کی ہندستانی فوج میں بھی پھیلی جس میں اودھ کے لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ اور ایک طرف انگریز اپنی حکومت بڑھائے جانے کی کارروائی میں لگے ہوئے تھے دوسری طرف ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کے بیج بکھیرے جا رہے تھے۔ نانا صاحب نے اپنے نمائندے عظیم اللہ خاں کو اپنے معاملے کی پیروی کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ انھیں وہاں تو کامیابی نہیں ملی مگر انگلستان سے روس جا کر انھوں نے اس کی ہمدردی حاصل کر لی اور مصر سے بھی رابطہ قائم کیا۔

لارڈ رابرٹس نے ہندستان میں بسر کیے ہوئے اپنے چالیس برسوں کا جو حال لکھا ہے اس میں انھوں نے ترکی کے سلطان اور دوسرے ذمہ دار افراد کے ساتھ عظیم اللہ کی خط و کتابت کی بھی تذکرہ کیا ہے جس سے آزادی کی تحریک کا دائرہ ملک کے باہر تک لے جانے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے ملک کے اندر یہ تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر پھیل رہی تھی۔ واجد علی شاہ کے وزیر اعظم علی نقی خاں نے جو جلاوطنی میں ان کے ساتھ تھے، بنگال میں کمپنی کے ملازم سپاہیوں کو بغاوت پر اکسایا اور ان سے وقت ضرورت کام آنے کا وعدہ لے لیا۔ جاسوسوں کو فقیروں اور سنیاسیوں کے بھیس میں ہندوستانی افسروں کے پاس اور عوام میں بھیجا گیا۔ اس طرح بغاوت کے بیج شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہات کے چوپالوں اور کھیت کھلیانوں تک اور فوجی پلٹنوں میں ملازم پنڈتوں اور مولویوں کے ذریعہ سپاہیوں تک پہنچ گئے۔ لوک گیتوں، کٹھ پتلی کے تماشوں، نوٹنکیوں اور ناٹکوں کے وسیلے سے بھی بغاوت کا پرچار کیا گیا۔ مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں مولویوں اور پنڈتوں نے مذہبی تعلیم میں آزادی کے سبق جوڑ دیے۔ بدیسی راج کے خلاف دیس کے باسیوں کو بغاوت کے لیے تیار کرنے کی اس مہم میں جہاد اور دھرم یدھ ہم

معتی اور مسلمان اور ہندو ہم مشرب تھے۔

دیلور کی بغاوت میں چپاتیوں کو پرچار کا ذریعہ بنایا گیا تھا اور اسی ترکیب اور تجربے کو 1857ء کی بغاوت کی تیاری میں استعمال کیا گیا۔ معمولی آٹے کی چپاتیاں غیر معمولی پیغام رسانی کا کام کرتی تھیں۔ ان کے ذریعہ بھیجا جانے والا پیغام صرف وہی لوگ سمجھ پاتے تھے جو ان کو لے جاتے تھے یا پاتے تھے۔ گاؤں کے جس چوکیدار اور بستی کے جس معتبر آدمی کو چپاتی ملتی وہ سمجھ جاتا کہ اسے پہلے سے طے کیے ہوئے پروگرام کو کب اور کس طرح عملی جامہ پہنانا ہے۔ انگریز حکمراں اور ان کے ہندستانی کارندے جس طرح علماء کی چلائی ہوئی ریشمی رومال تحریک کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہے اسی طرح وہ چپاتیوں میں چھپا ہوا معمہ حل نہیں کر سکے۔ جس شخص کو چپاتی ملتی وہ اسے تبرک کی طرح ٹکڑے کر کے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا اور پھر جس بستی میں چپاتیاں جاتیں وہاں اتنی ہی چپاتیاں تیار کر کے دوسری بستیوں میں بھیج دی جاتیں یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور مجاہدین کے ذریعے پیغام رسانی کا عمل انجام پاتا رہا۔ کمپنی کے کچھ کارندوں نے پراسرار چپاتیوں کا اثر دیکھ کر ایسی کچھ چپاتیاں حاصل کرلیں، ان کو کوٹ کر سفوف بنایا، مگر وہ چپاتیوں کا معمہ حل نہیں کر سکے۔

بشکریہ "نیا دور"

سامراجیت اور ۱۸۵۷

اس سے قبل کہ 1857 کی تحریک جنگ آزادی کے اسباب وعلل سے بحث کی جائے یہ جانتے چلیں کہ سامراجیت کیا ہے اور اس کے مضمرات کیا ہیں۔ سامراجیت کے لئے انگریزی میں Imperialism اور Colonialism کے الفاظ مستعمل ہیں جن پر غور کرنے سے بڑی حد تک بات واضح ہو جائے گی۔ سامراجیت کی تعریف کرتے ہوئے The world Book of Encyclopedia میں اس طرح کے الفاظ درج کیے گئے ہیں۔

"Imperialism is the policy or action by which one country controls another country or territory, most such control is achieved by millitary means to gain economic and political advantage"1

سامراجیت کیلئے استعمال میں آنے والے دوسرے لفظ Colonialism سے متعلق بھی یہیں وضاحت کرتے چلیں تو بہتر ہوگا۔ اس لفظ کے متعلق اسی کتاب کے چوتھے حصہ میں صفحہ نمبر 657 پر اس قسم کا بیان ملتا ہے جو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ سامراجیت کیا ہے اور یہ کیوں کر پھلتا پھولتا ہے۔

" Colonialism is a term that usually refers to the rule of a group of people by a foreign power.The people and their land make-up a colony, Most colonies are seperated by an ocean from the ruling nation, the foreign power send people to live in the colony, to govern it and to use it as a source of wealth, The rulers and the people of most colonies belong to different racial groups The rulers also have a more complex civilization and advanced technology than do the people of most colonies."2

ان دونوں اقتباس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی ملک پر اپنے فائدے کے لئے چند افراد یا فوجوں کے ذریعہ کیا گیا قبضہ سامراجیت ہے تاکہ اس سے معاشی اور سیاسی فوائد حاصل کیے جاسکیں۔ اس عمل میں چند افراد اپنی حرفت بازیوں کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ترقی اور برتری کی دھونس جما کر مذہب اور تہذیب و ثقافت پر بھی اثر انداز ہو سکیں۔ ان کے اس عمل میں ان کا ساتھ ان کی حکومت بھی دیتی ہے بعینہ ویسے ہی جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد محسوس کیا جانے لگا تھا۔ سامراجی ذہنیت کوئی خلاء میں پیدا ہونے والی شئے نہیں ہے۔ یہ زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے سماج کی ہی پیداوار ہے اور اسی بناء پر اس کی شناخت بھی بہ آسانی ہو جایا کرتی ہے کہ حکومت کے ذریعہ جو عمل انجام دیا جارہا ہے اس کا مقصد مثبت ہے یا منفی۔ اگر منفی سوچ کے تحت اقتدار کی توسیع و ترقی کی جائے تو اسے سامراجیت ہی کہا جائے گا اور کچھ نہیں۔ انگریزی سامراج نے پہلے پہل میر جعفر کے ذریعہ سراج الدولہ کا تختہ پلٹا، پھر بنگال پر تسلط جمایا اس کے بعد شاہ عالم سے صوبے کی دیوانی حاصل کی، موقع ملتے ہی واجد علی شاہ کو معزول کر دیا۔ انگریزوں نے اسی قسم کی حرفت بازیاں مستقبل میں بھی جاری رکھیں جو انکی سوچ کی غماز ہیں۔ بقول نپولین بوناپارٹ دوکانداروں کی قوم نے اپنی اسی سوچ کے تحت ہندوستان پر قابض ہونے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اور اپنی فوج میں سستے ہندوستانی سپاہی بھرتی کیے جو ان کی فتح کا آلۂ کار بن سکیں۔

اس قسم کی پالیسی کے لئے Expantionism کا لفظ بھی مستعمل ہے لیکن یہ توسیع اقتدار اگر کسی خاص مقصد (لوٹ کھسوٹ) کے لئے نہ ہو تو اسے اچھا بھی تصور کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا انداز توسیع و ترقی یا ان کی Expantionism کی پالیسی جس کا مقصد اکثر و بیشتر مثبت سوچ پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ مغل بادشاہوں بلکہ اس سے قبل بھی ہندوستانی راجاؤں مہاراجاؤں نے اپنے اقتدار کی ترقی و توسیع کے لئے انگنت طریقے اپنائے لیکن ان کا مقصد اس ملک کو کھوکھلا بنانا نہیں تھا بلکہ اسے تمام عالم میں مثالی ملک یعنی سونے کی چڑیا کے طور پر متعارف کرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ہند میں مغلیہ دور حکومت کو بہترین دور حکومت قرار دیا جاتا ہے اور اسے اب بھی ''عہد زرّیں'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں حکومت کی کوششوں سے ہر میدان عمل میں ترقی ہوئی تھی۔ جبکہ انگریزوں نے جب ایسٹ انڈیا کمپنی شروع

کی اسی وقت سے ان کا مقصد اس ملک کو ایک نیا بازار بنانا تھا۔ جہاں وہ اپنے مال کی کھپت کر سکیں ساتھ ہی ساتھ یہاں کے مزدوروں اور خام مواد کو Exploit کر سکیں۔ اپنے اسی مقصد کے تحت انہوں نے آہستہ آہستہ اس ملک پر قبضہ کر لیا اور اس کیلئے انہوں نے فوجی طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے سب سے پہلے تو انہوں نے "Informal Empire" کی بنیاد ڈالی، یہ ہم سبھی جانتے ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً 100 برسوں تک چلا اس دوران انہوں نے ہندوستانیوں سے تہذیبی و نسلی امتیاز بھی برتا۔ اس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے ہاں سر سید کے خیالات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے رسالے میں پیش کئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی اس بات پر برہم تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ برابری کا سلوک تو دور رہا انسانی سلوک بھی نہیں کرتے جب کہ ایک نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی ملکہ عالیہ کے رعایا تھے اور اسی بنا پر دونوں کو برابر حقوق، فرائض اور مراعات ملنی چاہیے تھیں جو اس وقت کے فرمانروا ہرگز نہ کر سکے۔ یہاں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ ان یوروپی باشندوں کا مقصد مساوات و برابری کا پیغام دینا نہ تھا جس کیلئے وہ مشہور تھے بلکہ یہاں ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو بار بار اپنی برتری کا احساس دلایا جائے بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کا احساس دلانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ انہیں یہ برتری خدا کی جانب سے ودیعت کی گئی ہے اور وہ اس کی خوشنودی کے لئے یورپی تہذیب اور عیسائیت کو فروغ دے رہے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہے کہ انگریزوں نے یہ کام کس کس طرح سے انجام دئے۔ ان میں ہندوستانی سپاہیوں کو سور اور گائے کی چربی لگی ہوئی کارتوس کا استعمال کرنے پر مجبور کرنا بھی یک طریقہ تھا۔ 1857 کی بغاوت کی ایک بڑی وجہ ہندوستانیوں کے مذہبی عقائد پر چوٹ کرنا تھا اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی مسٹر ایڈمنڈ کے ذریعہ نشر کئے گئے ایک خط سے ہوتی ہے۔ اس خط سے ایک بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ برصغیر ایک عیسائی طاقت کے قبضہ میں آ گیا ہے اور انگریز اسی زعم میں یہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ کریں جس کی پہلی کڑی وہ ہندوستانی ملازم تھے جو انگریزوں کی عملداری میں مصروف تھے خصوصاً ہندوستانی فوجیں جنہیں انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر بحال کر رکھا تھا۔ اس خط پر سرسید کا ردِ عمل ملاحظہ فرمائیں ’’

اسباب بغاوت ہند میں رقمطراز ہیں کہ:

"جب ہندوستانیوں کو اس گشتی خط کا علم ہوا تو خوف سے ان کی آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا۔"3

یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستانیوں کے اعتقاد و مذہب کو گزند پہنچانے کے لئے ہی ایسا کیا گیا تھا۔ حالات قابو سے باہر جاتے دیکھ کر انگریزوں نے اس کی تردید کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس حقیقت کا اعتراف فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے اپنی مشہور ومعروف تصنیف "Forty One Years in India" میں یوں کیا ہے۔

"حکومت ہند کے سرکاری کاغذات میں مسٹر فاریسٹ کی حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارتوس کی تیاری میں جو روغنی محلول استعمال کیا گیا، واقعی وہ قابل اعتراض اجزاء یعنی گائے اور خنزیر کی چربی سے مرکب تھا، اور ان کارتوسوں کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات اور جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی"۔4

اس مقام پر یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ سامراجی ذہنیت پر روشنی ڈالنے کے لیے انسائیکلو پیڈیا امریکانا سے بھی چند سطریں درج کی جائیں۔ جس سے یہ واضح ہو سکے کہ اس قسم کی سوچ رکھنے والے کس نہج پر کام کرتے تھے۔

" Motive for imperialism was the acquisitive instinct-man's desire to control, dominate, own or crush another people. Racism fed on, and also fed such a desire, and racism usually as an essential element of imperialism in the sense that the imperialist held himself to be superior to other man"5.

تاریخی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس اولین تحریک آزادی کے تین اہم محرکات تھے۔ پہلا کارتوس میں لگی ہوئی چربی، دوسرا تبدیلئ مذہب کے لئے مشنری سرگرمیاں اور تیسری Doctrine of Lapse یعنی راجاؤں کے ذریعہ کسی کو اقتدار کی منتقلی نہ کرنے دینا خواہ وہ ان کے لے پالک اولاد ہی کیوں نہ ہوں۔ اس پس منظر میں اگر ہم انقلاب 1857ء پر نظر ڈالیں تو انگریزوں کی سامراجی پالیسی پر خاطر خواہ روشنی پڑ سکتی ہے اور ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ایک تحریک تھی نہ کہ بغاوت یا

پھر غدر۔ ان الفاظ سے قطع نظر تاریخ عالم اس بات پر متفق ہے کہ 1857ء کی جدوجہد آزادی انگریزی سامراج کے خلاف ہندوستانیوں کا اوّلین جہاد تھا جسے انگریزوں نے بغاوت یا غدر کے نام سے موسوم کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے یا ختم کرنے کی شعوری کوشش کی جبکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت و معنویت پوری دنیا پر آشکارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں اس واقعہ کی تشریح و تعبیر مختلف طرح سے کی گئی اور آج بھی جب کہ ہم اس کا 150 واں جشن منا رہے ہیں اس کے مختلف اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کی سعی کی جارہی ہے۔ حالانکہ آج بھی اس عظیم واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے سامراجی ذہنیت سے متاثر تاریخ داں اسے اولین تحریک آزادی ہند نہیں مانتے بلکہ ان کا ماننا ہے کہ یہ جنگ انگریز حکومت اور چند باغیوں کے درمیان ایک جنگ تھی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سپاہیوں کی بغاوت کے درمیان انہیں افراد یا قوموں نے پیش رفت کی تھی جن کی حکمرانی ختم ہوئی تھی مثلاً تعلقدار، نوابین اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر جن کا ساتھ چند جرائم پیشہ عناصر نے دیا یا پھر اس جنگ میں وہ لوگ شریک ہوئے جن کے مفادات انگریزوں کے ذریعہ مجروح کیے گئے تھے۔ اس قسم کے تاریخ دانوں کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس بغاوت کو جدوجہد آزادی اس لیے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اسے عوام نے پورے طور پر قبول نہیں کیا تھا کیوں کہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف کوئی غم و غصہ نہیں تھا جبکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ جنگ عوام کی جنگ تھی جسے بہادر شاہ ظفر کی قیادت حاصل تھی۔ اس امر پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم یہاں دی لندن ٹائمز The London Times کے نامہ نگار W.H. Russel کے خیالات درج کرتے ہیں جو اس تحریک آزادی کی رپورٹنگ کے لئے یہاں آئے تھے اور یقینی طور پر وہ کسی تاریخ داں کی طرح Sponsored رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے احساسات کو اپنی ڈائری میں من و عن لکھا ہے۔ یہ بات عام طور پر قبول کی جاتی ہے کہ ڈائری لکھنے والے سچی، کھری ڈائری میں لکھا کرتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی اس وقت تک حق تصرف نہیں رکھتا جب تک وہ خود ایسا کرنے کی اجازت نہ دے یا پھر اسے بعد از مرگ اسکی اہمیت کے پیش نظر عام نہ کیا جائے۔ رسل اپنی ڈائری میں اس تحریک آزادی سے متعلق رقم طراز ہیں:

"یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت بپا ہوگئی بلکہ اجنبی حکومت کا جوا اتار پھینکنے، ہندوستانی والیان ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے

اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یہ ایک مذہب کی جنگ، نسل کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ اور قومی عزم کی جنگ تھی۔" 6

تاریخ دانوں کا ایک طبقہ اس بات پر بھی مصر ہے کہ 1857ء کی یہ جنگ اگر کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی تو ہندوستان پر ایک بار پھر سے مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا اسی نہج پر سوچنے والوں میں سے کچھ کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر ہم اس جدو جہد میں کامیاب ہو جاتے تو اس ملک پر برہمنوں کا غلبہ ہو جاتا اور پھر مذہب کا بول بالا ہوتا یعنی ہم دیگر میدان عمل میں پیچھے رہ جاتے۔ ان خیالات سے قطع نظر کچھ لوگ یہ بھی مانتے ہیں کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو ہمارا ملک ویسا نہیں ہوتا جو کہ اس تحریک کی ناکامی کے بعد نظر آیا۔ یعنی ہم ترقی نہیں کر پاتے، ہمارا ملک جدید ٹیکنالوجی کے راستہ پر گامزن نہ ہو پاتا، یہاں نئی تعلیم کی روشنی نہیں پھیل پاتی یعنی ہم پچھڑے کے پچھڑے رہ جاتے۔ مختلف رجحانوں سے متاثر تاریخ نویسوں نے اس طرح کے مزید کئی جواز پیش کئے ہیں اور اپنے اپنے طور پر اس تحریک کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ اس قسم کے جواز قائم کر کے ہم انگریزوں کی سامراجی ذہنیت پر پردہ نہیں ڈال سکتے کیوں کہ اس قوم نے ازل سے ہی "لڑاؤ اور راج کرو" یعنی D.vide & Rule کی پالیسی پر عمل کیا اور ان سے کسی صورت یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک بنا لیتے بلکہ انہوں نے سونے کی چڑیا کہی جانے والی اس دھرتی کو لوٹ کا مال سمجھا اور اپنے ملک کا خزانہ بھرنے کا جتن کرتے رہے۔ جو کہ سامراجیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ یقیناً ان کی اسی ذہنیت کا خمیازہ انہیں بعد میں بھگتنا پڑا اور نہ وہ بھی مغل تاجداروں کی طرح ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر چھائے رہتے اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔

1857ء کی جنگ آزادی (انگریزوں کی نظر میں "بغاوت") یوں ہی نہیں پھوٹ پڑی تھی بلکہ اس کے در پردہ سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی وغیرہ کئی اسباب تھے جس نے اس تحریک میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ ذرا پیچھے چلیں تو اس کے تار تقریباً 100 برس قبل سترہویں صدی سے جڑے نظر آئیں گے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سامراجی ذہنیت رکھنے والے انگریز اس کمپنی کی آڑ میں پورے ملک پر قابض ہوتے چلے گئے۔ اس ملک کی سب سے بڑی طاقت بن بیٹھے۔ اس طرح انگریزوں کی سامراجی حکومت نہ صرف سیاسی جبر پر مبنی حکومت بن کر ابھری بلکہ اس نے نسلی امتیاز کو خوب بڑھاوا دیا جس نے ہر ہندوستانی کے دل

میں طوفان پیدا کر دیا تھا لیکن حالات کے مارے ہندوستانی راجے، مہاراجے، نواب و زمیندار وغیرہ جو کہ اس کے زیر نگیں آ گئے تھے اپنی مطلب برآوری کیلئے ان سے مدد و اعانت کے خواستگار نظر آنے لگے۔ جو کہ ان کے لئے سوہان روح تھا مگر ان راجاؤں، مہاراجاؤں میں ایک قسم کا عجیب سا خوف گھر کر گیا تھا جس کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور ان کے اہلکاروں کے خلاف بولنا تو درکنار سوچنا تک گناہ تصور کیا جانے لگا۔ جس کا فائدہ ان سامراجیوں نے اٹھایا۔ یہ سارے حالات انگریز ریزیڈنٹ کے جلوں اور اس کے جاسوسوں کی بدولت ممکن ہو سکا تھا۔ جس کا دبدبہ کچھ اس قدر تھا کہ ہندوستانی مملکت کی شناخت ''لال قلعہ'' کے اندر بھی اس کا سکہ چلتا تھا۔ یہ حوصلہ انہیں اسی وقت سے ملنا شروع ہو گیا تھا جب 1757ء میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی تھی جس کے ذمہ دار میر جعفر جیسے اپنے ہی تھے کیوں کہ ان کی غداری سے ہی یہ ممکن ہو سکا تھا۔ انگریزوں کی شاطرانہ چالیں یہیں پہلی بار مکمل طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور اس کے بعد تو انہوں نے اپنی طاقت، سازش اور ثقافتی مصلحت غرض کہ ہر سامراجی حربہ کو استعمال کیا خصوصاً دیسی ریاستوں میں رقابت پیدا کر کے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے اندر سے اتحاد ختم کر دیا جائے اور بس! پھر باقی کا کام آسانی سے ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ملاحظہ فرمائیں کارل مارکس (Carl Marx) کی زبانی اس وقت کی صورت حال جسے نیویارک کے اخبار "Daily Tribune" کے حوالے سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

''یوں تو ہندوستان کی تباہی میں خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں، انقلابوں اور قحطوں کا بھی کافی ہاتھ رہا ہے لیکن ان تباہیوں کا اثر عموماً سطحی ہوتا تھا۔ برطانیہ نے تو ہندوستان کے سماجی نظام کو درہم و برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ابھی تک کسی نئے نظام کی داغ بیل پڑنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہندوستان اپنی پرانی دنیا کھو چکا ہے لیکن اسے نئی دنیا نہیں مل پائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کی غلامی میں آ کر موجودہ ہندوستان اپنی گزشتہ روایات اور قدیم تاریخ سے ناتا ہی توڑ چکا ہے''۔7

کارل مارکس کا یہ خیال حد درجہ درست ہے کیوں کہ انگریزی سامراجیت نے اپنے رنگ ڈھنگ کچھ اس طرح اپنائے تھے جس سے عام انسانوں میں بھی بے چینی اور منافرت کا جذبہ کسی زیریں لہر کی مانند موجزن تھا جس کا اظہار اس جنگ آزادی کے وقت بھی دیکھنے کو ملا۔ لیکن یہ بات

بھی درست ہے کہ ایک جانب جہاں اس ملک کے کسان، مزدور اور دیگر افراد قوم انگریزوں سے اپنی بقاء کے لئے برسرپیکار تھے، انھیں نکال باہر کرنے کے درپے تھے اسی وقت بنگال اور کچھ حد تک مہاراشٹر کے تعلیم یافتہ اور دولت مند افراد مختلف مذہبی مقامات پر ان سامراجیوں کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اب یہ وقت کا تقاضا تھا، ان کی منافقت تھی یا مصلحت، خدا ہی جانے لیکن انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ انگریز اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وجہ صاف تھی کہ اس تحریک میں کوئی تنظیم نہیں تھی، نظم و نسق نہیں تھا صرف جوش اور ولولہ تھا جس سے انقلاب تو برپا ہوگیا لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ اس جنگ میں جن سورماؤں نے حصہ لیا وہ کسی ایک قوم یا قبیلہ سے متعلق نہیں تھے بلکہ ان میں ہر رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے افراد شامل تھے، گو کہ ان کی زبانیں الگ تھیں، مذاہب الگ تھے، فرقے الگ تھے لیکن ان کی رگوں میں ہندوستانی خون دوڑ رہا تھا، ان کا ذہن و دل ان سامراجیوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے متحد تھا جنھوں نے ہمارے ملک پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اسی لئے سبھی نے مل کر انگریزوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ سبھی جیالے اتحاد و یگانگت کے رشتہ سے منسلک تھے اور مادر وطن کے سپوت تھے، ان سبھی میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما تھا جبکہ سامراجی ذہنیت رکھنے والے انگریزوں کا مقصد ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے فلسفہ پر عمل پیرا ہونا تھا۔ یہ انگریزوں کی سامراجی پالیسی ہی تھی جس کے تحت انھوں نے جب ٹیپو سلطان سے جنگ کی تو انھوں نے مرہٹوں اور نظام کو اپنا موافق اور حلیف بنالیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ سبھی اگر ایک ہوکر مقابلہ کرنے لگے تو ان کی پالیسی کامیاب نہ ہو سکے گی اور یہی سچ بھی ہے کہ اگر ایک طرف چند راجہ، نواب، زمیندار اور معتقدار مجاہدین کے ساتھ شانہ بہ شانہ مصروف جہاد تھے تو دوسری جانب انکی تعداد سے کہیں زیادہ میر جعفر اور میر صادق کی طرح کے با اقتدار افراد تن من دھن سے انگریزوں کے ساتھ تھے ورنہ یہ سب ممکن تھا کہ ملک میں موجود چالیس ہزار کے قریب انگریز اس ملک گیر بغاوت کو کچل ڈالتے۔ یہاں پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی ہی ان کی ہمنوا تھی۔ انگریزوں کی سامراجی پالیسی کے ثبوت میں سر ہنری الیٹ کی وہ میٹنگ بھی پیش کی جاسکتی ہے جس میں اس نے ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان صدیوں سے ان کا استحصال کر رہے ہیں اور یہی موزوں وقت ہے جب کہ انھیں مسلمانوں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے انگریزوں کا

ساتھ دینا چاہئے۔ دیکھیں اس کا یہ بیان جو اس نے رانی وکٹوریا کو ایک مکتوب میں لکھا تھا۔ اس سے انگریزوں کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے:

> "اگر آپ کی اجازت ہو تو پندرہ فیصد مولوی اور اسی طرح سے پنڈتوں کو دامن اجل میں سلا دیا جائے تو تقریباً پانچ سو ہزار ہندوستانی ویسے ہی کٹ مریں گے اور ہم بہت کم وقت میں پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے"8

اس ذہنیت کے برخلاف ہندوستانیوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کا ایک نمونہ تو اس وقت دیکھنے کو ملا جب بہادر شاہ ظفر نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے 9/ جولائی 1857ء کو گائے کے ذبیحہ پر پابندی عاید کر دی خصوصاً بقرعید کے موقع پر جب بادشاہ نے گائے کے ذبیحہ کی بابت منادی کرادی اور اسے ممنوع قرار دے دیا تو انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چال کے ذریعہ تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے اپنی سامراجی سوچ کے تحت سازش کی اور عبدالرحمن نامی شخص کو پانچ سو روپے دیے کہ وہ حکم عدولی کر گزرے اور کسی طور ہندو مسلم تنازعہ پیدا ہو جائے جسکا وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ جان کے (Kay) کا بیان ہے کہ اس بغاوت کے وقت مسلمان اور ہندو انگریزوں کے خلاف متحد تھے اور اس موقع پر وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار نہ بنا سکے۔ اس وقت اتحاد کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں باغی غلبہ حاصل کر لیتے وہاں فوراً گاؤکشی ممنوع قرار دے دی جاتی تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ جنگ آزادی (بغاوت) ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مہم ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں نے کبھی ہمت نہ ہاری، ہمیشہ ہندو مسلم اور سنی و شیعہ کے درمیان نفاق کا بیج بونے کے درپے رہے۔ اسی طرح کی ایک کوشش اس تحریک کے دوران انہوں نے یہ کی کہ بہادر شاہ ظفر سے متعلق ایک افواہ پھیلائی کہ وہ اپنے مسلک سے منحرف ہو کر شیعہ ہو گئے ہیں۔ انگریزوں کو ان کی اس افواہ سے تقویت اس لئے بھی ملی کہ اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا تھا جس کا مقصد بہادر شاہ کا لکھنؤ کی ریاست سے تقرب حاصل کرنا تھا۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے بات مزید واضح ہو سکے گی:

> "بہادر شاہ اول اول شیعہ ہو گیا۔ لیکن اسکو شیعیت کے اعلان کی جرأت نہ ہوئی بہادر شاہ نہایت کمزور اور توہم پرست آدمی تھا اس کو بھی طرح طرح کی

بے بنیاد اور خیال پرور امیدوں کے ذریعہ گرویدہ کیا جاتا تھا چنانچہ مرزا فیروز (بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بھائی فیروز بخت جنہوں نے شیعیت قبول کر لی تھی) نے قلعہ میں ایک بڑی سازش کی جس کا منشا یہ تھا کہ بہادر شاہ کے ذہن نشین کرایا جائے کہ اگر وہ شیعہ ہو جائیں تو لکھنؤ کی ریاست ان کی اطاعت و خدمت گزاری کیلئے اٹھ کھڑی ہوگی یا کم از کم اس سے کوئی غیر معمولی مقدار دولت کی ملے گی۔"9

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کے لئے یہ افواہ کس قدر اہم تھی اس کا اندازہ تاریخ ہند کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔ اس افواہ کی ایک وجہ بہادر شاہ ظفر کی ضعیف الاعتقادی تھی جس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف یہ وہی زمانہ ہے جب ولی عہد بہادر شاہ کے چھوٹے بھائی فیروز بخت کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ کے مقرب خاص حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں کے علاوہ قلعہ سے متعلق دیگر سربرآوردہ افراد خصوصاً بیگمات نے بھی ان کے خلاف سازش کا بازار گرم کر رکھا تھا جس سے بادشاہ کو صدرجہ نقصان ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر انگریز اپنا کام کر گئے گو کہ بہادر شاہ نے اپنا موقف واضح کرنے کے لئے باضابطہ اعلان بھی کیا کہ "میں سنی ہوں" لیکن انگریز جو پہلے سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے میں مشغول تھے مسلمانوں کو بھی فرقوں کی بنیاد پر بانٹنے کے درپے رہے جو کہ ان کی سامراجی حکمت عملی کا اہم حصہ تھا۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انگریز کس قدر موقع کی تاک میں رہا کرتے تھے اور "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اپنے ان کہے منشور (Unsaid Manifesto) پر عمل پیرا تھے۔ بہر حال انہوں نے اس قسم کی افواہ کو خوب ہوا دی تاکہ انہیں ہر حال میں کامیابی ملے۔ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ اگر یہ افواہ کارگر ثابت ہوئی کہ بہادر شاہ سنی مسلک ترک کر کے شیعہ اثنا عشری ہو گئے ہیں تو سنی ان سے منحرف ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے اس افواہ کی تردید کی جو کہ انہوں نے کی، تو شیعوں میں اسی طرح کا ردعمل ہوگا۔ یعنی کامیابی بہر طور ان کا مقدر بنے گی جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چند افراد کو چھوڑ کر جو مصلحتاً انگریزوں کے ساتھ تھے اس مغل تاجدار کو پوری قوم اپنا بادشاہ اور رہنما مانتی تھی اس میں کسی قسم کی مذہبی یا مسلکی تخصیص نہیں تھی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ تاریخ ہند کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ تاریخ دانوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ایسے مواقع پیدا کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں صرف مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یا ان کے جان و مال، عزت و ناموس کا نقصان ہوا اور زیادہ تر ہندوؤں نے اس جنگ آزادی میں کوئی خاص بڑا کام نہیں کیا جبکہ سچائی اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیوں کہ یہ جنگ آزادی پوری قوم کے اندر پیدا شدہ کرب، بے چینی اور اضطراب کا نتیجہ تھی جس میں گائے اور سور کی چربی منڈھی ہوئی کارتوس کے استعمال والے قضیہ نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ اس موقع پر بیج ناتھ نامی ایک سپاہی نے ہی سب سے پہلے پیش رفت کی تھی اس کے بعد چاند خاں اور خدا بخش وغیرہ نے آواز اٹھائی۔ اس واقعہ کو ہندوستانی رہنماؤں، سیاستدانوں اور اخباروں مثلاً دہلی اردو اخبار، سراج الاخبار، صادق الاخبار وغیرہ نے خوب ہوا دی اور اس طرح آزادی کا بگل بج اٹھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزوں سے نجات پانے کیلئے یہ کوشش 10 رمئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی کے واقعہ سے ہوئی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس معاملہ کو لے کر جنوری 1857ء میں کلکتہ کے قریب ''دمدمہ'' میں بغاوت کی چنگاری پھوٹ چکی تھی جو 10 رمئی 1857 کو میرٹھ سے شعلہ جوالا بن کر ابھری اور جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپے، کنور سنگھ، خان بہادر، حضرت محل، مولوی احمد اللہ وغیرہ نے انگریزوں سے وہ جنگ کی کہ ان کے دانت کھٹے کر دیے۔

حالانکہ کہ ہمیں اس پہلی جنگ آزادی میں کامیابی نصیب نہ ہو سکی لیکن اس جنگ آزادی کا کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستانی قوم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم نہ صرف ایک متحد قوم ہیں بلکہ بڑی سے بڑی سامراجی قوت سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت سے معمور بھی ہیں۔ خواہ اس راہ میں ہمیں کالا پانی کی سزا ہو یا سر تن سے جدا ہو جائے، ہمیں پھانسی کے پھندوں پر لٹکنا پڑے، گولیوں کا نشانہ بننا پڑے یا توپ کے دہانوں سے صف آرائی کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے۔ ظاہر ہے تحریک کی ناکامی کے بعد ہندوستانیوں کو انگریزی سامراج کی غضبناکی کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں بے شمار اذیتیں برداشت کرنی پڑیں جس کے ذکر کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں معروف صحافی Mr Delean کے ایک مضمون کی چند سطریں درج کی جا رہی ہیں جس میں انھوں نے انگریزوں کی منتقمانہ حرکت کا ذکر ان الفاظ میں

کیا ہے۔ان کا بیان ہم یہاں رسل ڈائری کے حوالے سے نقل کر رہے ہیں:

"ہماری گردنیں شرم اور ندامت سے جھک جاتیں ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑیگا۔اس قسم کے دردناک جسمانی اور دماغی سزاؤں کے دینے کا مطلقاً ہمیں کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔"10

انگریزوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لئے اپنی سامراجی پالیسی پر عمل کیا ہی اسے مسلمانوں کے تباہی اور Genocide کا ذریعہ بھی بنایا۔تمام مورخ اور دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ اس تحریک آزادی کے بعد غصہ کی آگ میں جل رہے انگریزوں نے اپنی بددماغی اور بربریت کا جو ثبوت دیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی کہیں ملے۔ان انگریزوں کی سامراجی سوچ پر روشنی ڈالنے کے لئے لارڈ کینگ کے مراسلے کا ایک تراشا ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا اور جس پر ملکہ وکٹوریہ نے بھی گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔کینگ اپنے مراسلے میں رقم طراز ہیں:

"ہماری قوم کے دماغ میں ایک عالم گیر دیوانگی اور انتقام کا جذبہ موجزن ہے اس میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن سے بہتر طرزِ عمل کی توقع تھی ایسی گری ہوئی ذہنیت کو دیکھ کر نا ممکن ہے کہ ان کے ہم قوم ساتھیوں کی گردنیں ندامت اور شرمندگی سے نہ جھک جائیں کیونکہ ہر دس آدمیوں میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں دکھائی دیتا جو چالیس یا پچاس انسانوں کے بے دریغ قتل و پھانسی کو ضروری اور سہی سمجھتا ہو"11

اسے ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جنگ آزادی (بغاوت) کے فرو ہونے کے بعد بھی انھوں نے Appeasement کی پالیسی اپنائی اور لٹے پٹے ہندوستانیوں میں سے پہلے ہندوؤں کو شہر میں آنے کی اجازت دی تا کہ وہ کسی طور ان سے خوش ہو جائیں اور ان کی ہمنوائی کرنے لگیں۔یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب انگریزوں نے 18 اپریل 1857 کو مسلمانوں کو دہلی واپس آنے کی اجازت دی تو بھی ان کی کوشش تھی کہ وہ انہیں معاشی طور پر مفلوج کرنے کی پالیسی پر کاربند رہے۔اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ انھوں نے ایک قانون بنایا کہ یہ قوم جو ابھی تک سیاسی، معاشی، معاشرتی ہر سطح پر پسپائی کا شکار تھی اس پر ٹیکس کا بوجھ لاد دیا گیا اور یہ حکم صادر کیا گیا کہ جو بھی دہلی واپس لوٹنا چاہے گا اسے اپنی جائیداد کا پچیس

فیصد ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ انگریزوں نے اسی قسم کی دوسری پالیسیاں بھی اپنائیں تاکہ پھر کوئی مجاہد آزادی سر نہ اٹھا سکے لیکن ظلم کی ٹہنی سدا پھلتی رہے یہ کب ممکن ہے۔ اس جدوجہد نے اپنا کام کر دیا تھا۔ خصوصاً ہندوستان میں اس جنگ سے انگریزوں کے تئیں متوسط طبقہ کے نظریہ کو تبدیل کرنے میں کافی مدد ملی اور پوری دنیا پر انگریزوں کی سامراجی ذہنیت افشاء ہوگئی۔ کچھ اس طرح کہ اس وتیرہ کی تضحیک ان کے اہل وطن نے برطانوی پارلیمنٹ میں کی۔ برطانوی اخباروں نے اس کارروائی کے خلاف آواز اٹھائی اور انگریزوں کے ایک طبقہ نے کھل کر اس سامراجی عمل کی مخالفت کی۔ آخر وہ ایسا کیوں نہ کرتے کہ ان میں انسانیت کی رمق باقی تھی اور یہ سامراجی بغاوت کے بعد انتہائی درجہ کی مذموم حرکتیں کرنے پر آمادہ تھے۔ اس کی ایک جھلک دی لندن ٹائمز کے مشہور و معروف نامہ نگار ڈبلیو۔ ایچ۔ رسل کی ڈائری کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

> "زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب کبھی اجازت نہیں دیتی۔"12

رسل ڈائری کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے مذہب پر حملہ کیا، ان کو ذہنی طور پر مفلوج کرنے کی خاطر بدترین ہتھکنڈے اپنائے اور ان سے جانوروں کی طرح سلوک روا رکھا۔ اس کے پیچھے صرف ایک مقصد کارفرما تھا کہ وہ اپنی تہذیبی اور نسلی برتری ثابت کر سکیں۔ ایک پیغام دے سکیں کہ ان کی سامراجی قوت کے خلاف جو بھی آواز اٹھائے گا اس کا یہی حشر کیا جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی مختلف روشن دماغ افراد مثلاً ملکہ وکٹوریہ اور برطانوی وزیر اعظم ڈزرائیلی وغیرہ نے انگریزی فوج کے خلاف اظہار برات کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کی اور اپنی قوم کو بربریت سے لبریز اور دیوانہ تک قرار دیا۔ یہاں تک کہ ڈزرائیلی نے یہ بھی کہا کہ اب میری قوم مسیح کے بجائے مولوک (Moloch) کی پیرو ہوگئی ہے جو قتل و غارت گری کا یونانی دیوتا ہوا کرتا تھا۔ دیکھیں چند جملے جو انگلستان کے وزیر اعظم ڈزرائیلی نے 27 جولائی 1857 کو اپنی تقریر میں کہے تھے:

> "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محض فوجی تکلیف کی بنا پر بغاوت نہیں ہوئی بلکہ درپردہ ملک کی عوام سیاسی بے چینی کی حفاظت میں اٹھے تھے۔ دوسری قوموں

کے جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے۔ جس کو گورمنٹ ہند نے گزشتہ چند سالوں سے بالکل خیر باد کہہ دیا ہے۔" 13

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے انگریزی سامراج کے اختتام تک ان سامراجیوں نے آخر دم تک کوشش کی کہ ہندوستانیوں کو کچل کر اپنا معاشی، سیاسی اور تہذیبی مقصد پورا کیا جائے خواہ اس میں ملک پر قابض ہونے کا معاملہ ہو یا جنگ آزادیٔ ہند کو ناکام بنانے کا عمل۔ یہاں تک کہ آزادیٔ ہند کے بعد بھی وہ اپنی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور انہوں نے شعوری کوشش کی کہ آزادیٔ ہند سے متعلق واقعات کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جائے تاکہ اس کی تاریخی اہمیت ختم ہو جائے یا پھر انہیں تاریخ کے صفحات کی زینت ہی نہ بننے دیا جائے۔ لیکن ایسا کب ممکن تھا؟ کیا خون شہیداں آج تک بھی رائیگاں گیا ہے؟ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ خون شہیدان وطن نے یقیناً اپنا رنگ دکھایا اور برسوں بعد ہی سہی سامراجی ذہنیت کے نقیب اپنے حشر کو پہنچے۔ بقول شاعر:

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"

حواشی و آخذ

(1) The world book encyclopedia vol-10, page-76

(2) The world Book Encyclopedia vol-4, page-657

(3) اسباب بغاوت ہند صفحہ 22

(4) Forty one years in India vol-1, Page-431 Published 1908

(5) Encyclopedia Americana-vol-14, page-822

(6) W H Russel -My Diary in India in the year (1858-59) Page164

(7) Daily Tribune, 25 June,1853

(8) - Bhargava & Rizvi Freedom Struggle in Uttarpardesh Voll -2, Page 160

(9) آزادی کی کہانی خود آزادی کی زبانی۔ صفحہ 52-53

(10) Mr. Delean - Russel Diary

(11) مراسلہ لارڈ کیننگ بخدمت ملکہ وکٹوریہ

(12) رسل ڈائری، مئی 1858، صفحہ 43-

(13) جولائی 27 ڈزرائیلی 857.

۱۸۵۷: منظر پس منظر

یہ درست ہے کہ 1857ء میں ہندوستان کے محبان وطن نے آزادی کی پہلی بڑی جدو جہد کی جو میرٹھ کی سرزمین سے شروع ہو کر دھیرے دھیرے پورے ملک میں پھیل گئی۔ بادی النظر میں یہ جدو جہد منظم معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ بات بار بار تاریخ کی کتابوں میں تکرار کے ساتھ لکھی جاتی رہی ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تھی جو ناکام ہوئی۔ جسے انصاف پسند مورخین نے غیر ملکی حکمراں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا نام دیا اور انگریز مورخین اور ان کے پٹھو ہندوستانیوں نے اسے غدر کا نام دیا اور غدر برپا کرنے والوں کو غدار کہا گیا۔ منشی ذکاء اللہ جو انگریزوں کے ایک ایسے ہی پٹھو تھے، اپنی کتاب تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ میں لکھتے ہیں:

"اس وقت انگلش مین کی مردانگی عجب نیرنگی رنگ دکھارہی تھی وہ اپنے خدا پر ایسا توکل کرتے تھے کہ ان کو بڑا استقلال اور صبر تھا۔ بعض انگریز ایمان کے پکے اور سرتاپا خدا کی عبادت میں مستغرق تھے۔"

منشی ذکاءاللہ جنہیں انگریزوں نے وفاداری کے صلے میں خان بہادر شمس العلماء کا خطاب دیا تھا، طنز کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"شہرت ہوئی کہ مسلمانوں کی گئی گزری حکومت پھر سے بحال ہوئی۔ ہاسی کڑھی میں اُبال آیا، ان کا نقلی برائے نام بادشاہ بہادر شاہ سچ مچ کا بادشاہ ہو گیا ہے۔"

منشی ذکاءاللہ کی یہ پوری کتاب اسی طرح کے طنز و تضحیک سے بھری پڑی ہے۔ 1857ء کی ناکام جدو جہد گو کہ ملک گیر تھی لیکن یہ پہلی جدو جہد ہرگز نہیں تھی۔ جنگ پلاسی جو پورے سو سال پہلے لڑی گئی تاریخی اعتبار سے پہلی مسلح جنگ تھی جو 1757 میں بنگال کے نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے بیچ لڑی گئی تھی اور سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کی غداری کے سبب بنگال پر

انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ ادھر 1799 میں میسور کے شیر ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو للکارا اور باوجودیکہ ٹیپو سلطان فن سپہ گری سے پوری طرح واقف تھے، انہیں جنگی مہارت حاصل تھی لیکن یہاں بھی اس محب وطن کو میر صادق، میر غلام علی، قاسم علی اور دیوان پورنیا جیسے غداروں کے سبب آخر شکست ہوئی اور انہوں نے گیدڑ کی صد سالہ زندگی پر شیر کی یک روزہ زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے سری رنگا پٹنم میں موت کو گلے لگالیا۔ بنگال اور میسور پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کے حوصلے بہت زیادہ بلند ہوگئے اور اب وہ ایسٹ انڈیا کمپنی جو 1600 کے آس پاس تجارت کے لیے ہندوستان آئی تھی، پورے ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگی۔ چنانچہ نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد انگریزوں نے اپنی راہ کے دو اور بڑے کانٹے سید برادران اور مرہٹوں کو ٹھکانے لگا کر دہلی کے تخت پر عملاً قبضہ کرلیا اور 1803 میں وقت کا بادشاہ شاہ عالم اپنے ہی ملک میں انگریزوں کا پنشن خوار ہوگیا اور حکم کمپنی بہادر کا چلنے لگا۔ شاہ عالم کے بعد 1806 میں اکبر ثانی کو بادشاہ بنایا گیا اور حکومت انگریز ریزیڈنٹ بہادر کرتا رہا اور اسی طرح بہادر شاہ ظفر پشتینی غلامی کا جوا گلے میں ڈالے 1837ء میں تخت نشین ہوا۔

دراصل ہندوستان کی جائز مغل حکومت اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ہی زوال پذیر ہوگئی تھی۔ اسی وقت سے ملک میں ہر طرف بدامنی، طوائف الملوکی اور انتشار و خلفشار کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس موقعہ کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے طرح طرح کی ریشہ دوانی، چالاکی اور عیاری شروع کردی۔ انگریزوں کی حکمت عملی کی سب سے نمایاں اور اہم بات ہندو مسلمانوں کے بیچ نفاق کا بیج بونا تھا۔ اسی حکمت عملی کے تحت انگریزوں نے مشہور کرنا شروع کردیا کہ اورنگ زیب ہندو کش اور بت شکن تھا نیز یہ کہ وہ ہندوؤں کے مندروں کو توڑتا تھا۔ انگریز اپنی اس حکمت عملی میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن آخر کو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اورنگ زیب نے ان مندروں کو صرف اس وجہ سے توڑا تھا کہ خود اس مندر کے پجاریوں نے اس کے تقدس کو پامال کیا تھا۔ ڈاکٹر پٹابی ستیہ رمیا اور بسمبھر ناتھ پانڈے کے مطابق حقیقت یوں ہے کہ ایک بار کچھ کی آٹھ مہارانیاں کاشی وشوناتھ کے درشن کرنے گئیں اور جب واپس آئیں تو ایک مہارانی غائب تھی۔ دراصل اس ایک حسین رانی کو مہنتوں نے اغوا کرلیا تھا۔ کچھ کے راجہ نے اس واقعہ کی اطلاع اورنگ زیب کو پہنچائی اور جب اورنگ زیب نے اس واقعہ کی تفتیش

کرائی تو پتہ چلا کہ مندر کے خاص بڑے دیوتا کے پیچھے ایک سرنگ ہے جس میں متعدد سڑی گلی لاشوں کے ساتھ مذکورہ رانی کی لاش بھی مل گئی جو برہنہ تھی اور اجتماعی آبروریزی کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اورنگ زیب نے اسی سبب سے مندر کو منہدم کرایا کہ خود پجاریوں نے اس کی حرمت اور تقدس کو برباد کر کے اسے عیاشی کا اڈہ بنا دیا تھا۔

تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ اسی اورنگ زیب نے جس پر مندر شکنی کا الزام لگایا گیا، اس نے کئی مندروں کو جاگیریں بھی عطا کیں اور مندر کی دیکھ ریکھ پر خصوصی توجہ دی۔ بہرحال سردست یہ ہمارا موضوع نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ انگریز ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی اپنی حکمت عملی پر شروع سے ہی پوری طرح کاربند رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں جو کچھ بھی کر رہی تھی وہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت تھی۔ چنانچہ اسی پلاننگ اور حکمت عملی کے تحت اس نے 1801ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی تاکہ انگریز کارندوں اور افسران کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور زبانوں سے واقفیت کرائی جائے۔ انگریزوں نے اسی کالج کے تحت پہلے پہل اردو اور ہندی کا تنازع کھڑا کیا۔ یہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی تھی ورنہ اس سے پہلے ہندی اردو تنازع کا نام ونشان نہیں ملتا۔ ادھر دوسری طرف اسی حکمت عملی کے تحت 1835ء میں انگریزی کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا۔ اس طرح زبان کی سطح پر سنسکرت اور فارسی کو شکست دے کر ہندوستانیوں کو ایک گہرا زخم لگایا گیا۔

بہرحال 1843ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور 1849ء میں پنجاب پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ 13 رفروری 1856ء کو اودھ کا الحاق من مانے ڈھنگ سے انگریزی حکومت میں کر لیا گیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ چلے جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ 1856ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی اتنی مضبوط اور طاقتور ہو چکی تھی کہ ہندوستانی عوام تو خیر ملکۂ برطانیہ کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا جس کا اظہار اس وقت کے برطانوی اخبار میں بھی جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ چنانچہ تاج برطانیہ نے پارلیمنٹ میں ایک ایکٹ پاس کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تحلیل کر دیا اور ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا گیا۔ اس من مانی، لوٹ پاٹ اور ہندوستان کی زبوں حالی پر مصحفی نے پہلے ہی اپنے رنج وغم کا اظہار ان

الفاظ میں کر دیا تھا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اس طرح دیکھا جائے تو1857ء کی ناکام جدوجہد سے پہلے سوڈیڑھ سو سال کا پورا عرصہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے۔ جس میں ہندوستانی نہ صرف غلامی کی ذلت برداشت کرتے رہے بلکہ انگریزوں کے طرح طرح کے ظلم وجبر کا شکار بھی بنتے رہے۔ ایسے ماحول میں ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کے دل ودماغ میں اندر ہی اندر نفرت، عداوت اور غم وغصہ پنپنے لگا اور واضح طور پر اہل وطن میں تین طرح کے لوگ سامنے آئے۔ ایک وہ لوگ جو انگریزوں کو غاصب ور ہندوستان کا ناجائز حکمراں گردانتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں صرف اپنے عیش وآرام اور جاہ ومنصب اور دولت وثروت کی چاہت تھی وہ نہ صرف انگریزوں کو خدا کی طرف سے بھیجا گیا حقیقی حکمراں مانتے تھے بلکہ انگریزوں کے اشارے پر ہمہ وقت جھک جانے بلکہ سجدہ ریز ہو جانے کو اپنی عین خوش نصیبی اور وقت کی ضرورت سمجھتے تھے۔ تیسرے وہ لوگ تھے جو ان تمام حالات کو اللہ کی طرف سے مسلط کردہ فیصلہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ راضی بہ رضا سب کچھ تن بہ تقدیر چھوڑ کر صبر کر کے خاموش بیٹھ گئے۔

مذکورہ پہلی قسم کے لوگ ہی دراصل وہ جانباز اور سچے وطن پرست تھے، جنہوں نے اس پورے عرصے میں انگریزوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ان کے دلوں میں بنگال کی شکست اور ٹیپو سلطان کی شہادت کا درد انہیں ہمیشہ اکساتا اور جوش دلاتا رہتا تھا۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں مختلف سطحوں پر اپنے اپنے طور پر سرفروشان وطن اپنے وطن کی آزادی کے لیے علم بلند کرتے رہے۔ ان میں سے چند ایک بغاوتیں جو 1857 سے پہلے وقوع پذیر ہوئیں، اس طرح ہیں۔ 1806ء میں ویلور کی بغاوت، 1818ء میں کٹک میں بغاوت، 1841ء میں کابل میں بے چینی اور انتشار، 1842ء میں کابل کینٹ پر دیش واسیوں کا حملہ جس کے نتیجے میں انگریزوں کو کابل چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح 1849ء میں پنجاب کے سپاہیوں میں عام بے چینی وغیرہ دھیرے دھیرے کسی چنگاری کی طرح سلگ رہی تھی۔

مولوی احمد اللہ شاہ جو اودھ کے علاقے میں انگریزوں کے لیے زبردست چیلنج بنے ہوئے

تھے۔ ان کا نعرہ ہی بن گیا:

راہ عام پر
وطن کے نام پر
چلے چلو
ہر قوم شان ہند
کوئی بڑی نہ چھوٹی
ہندو کے گھر کنول
مسلم کے گھر روٹی۔

اس نے بظاہر انگریزوں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے وطن پرستوں میں آزادی کی جوت جلائے رکھا۔ بمبئی کے کشف الاخبار سے ایک تراشہ ملاحظہ کریں جو 1857ء کے ہنگامہ کے بعد اسی طرح کا ایک واقعہ رونما ہونے پر شائع ہوا تھا:

"ہنگامہ ہوائے گزشتہ (1857ء) سے پیشتر وسط ہند اور ملک اودھ کی طرف ہر جگہ شہروں سے بستیوں میں روٹیاں تقسیم ہوئی تھیں اور پیش گوئیاں ہوئی تھیں کہ انگریز ہندوستان سے جڑ بنیاد سمیت اکھڑ جائیں گے۔ 'دہلی گزٹ' نے خبر دی ہے کہ اب میرٹھ کی طرف ایک مقام سے دوسری جگہوں میں پکے ہوئے چاول تقسیم کیے جاتے ہیں اور ہر مقام پر خشکہ پہنچاتے ہیں۔ اس مرتبہ ایک ہندو پیش گوئی کے یہ آشکارا ہوا کہ آئندہ تین برس میں کرشٹی لوگ (انگریز) ہندوستان سے فنا ہو جائیں گے۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی کی آزادی کی جدوجہد کی ایک شاندار تحریک رہی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اورنگ زیب کی وفات سے شاہ عالم ثانی تک دہلی کے دس سلاطین کے زوال کا زمانہ دیکھا تھا اور انہیں اپنے ملک کی زبوں حالی پل پل ستاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک منظم تحریک آزادی شروع کی جو ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک سنہری باب ہے۔ اس تحریک کے ارکان بغیر کسی لالچ اور طمع کے ملک کے گوشے گوشے اور قریے قریے میں آزادی کی جوت جلاتے رہے اور طرح طرح کے مصائب جھیلتے رہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی اس تحریک کے ایک نمایاں رکن سید احمد

بریلوی نے پٹنہ میں جو عظیم آباد کے نام سے جانا جاتا تھا ایک مستقل عسکری تنظیم بھی قائم کردی جو انگریزوں کو طرح طرح سے پریشان کرتی رہی۔ اور انگریزوں کی حکومت کو کھلے عام چیلنج کرتی رہی۔ چنانچہ 1864ء میں اس تحریک سے منسلک پنجاب، یوپی اور بہار کے متعدد افراد کو انبالہ میں سازش اور مقدمے میں پھنسا کر انہیں سزائے موت دے دی گئی۔

اسی طرح اہل قلم ادیب وشاعر کا ایک طبقہ اپنے قلم سے انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ خاص طور سے محب وطن شعرا کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے جو اپنے ترانوں اور نغموں سے ہمیشہ دیش کے سپوتوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ایسے شعرا میں دو خاص باتیں دیکھنے کو آتی ہیں۔ ایک وہ جو کسی ڈر اور خوف کے بغیر انگریزوں کو للکارتے رہے اور وطن پرستوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ کسی نامعلوم شاعر کا یہ ترانہ قابل ذکر معلوم ہوتا ہے:[۱]

ہم ہیں اس کے مالک ہندوستان ہمارا
پاک وطن ہے قوم کا جنت سے بھی پیارا
یہ ہے ہماری ملکیت ہندوستان ہمارا
اس کی روحانیت سے، روشن ہے جگ سارا
کتنا قدیم، کتنا نعیم، سب دنیا سے نیارا
کرتی ہے زرخیز جسے گنگ وجمن کی دھارا
اوپر برفیلا پربت پہرے دار ہمارا
نیچے ساحل پر بجتا ساگر کا نقارا
اس کی کانیں اگل رہی ہیں، سونا ہیرا پارا
اس کی شان وشوکت کا دنیا میں جے کارا
آیا فرنگی دور سے ایسا منتر مارا
لوٹا دونوں ہاتھ سے پیارا وطن ہمارا

---

۱ حالانکہ ابھی اس ضمن میں تحقیق باقی ہے کہ یہ ترانہ کس نے لکھا۔ لیکن قوی امکان ہے کہ اس کے خالق عظیم اللہ خان ہیں جو پیشے سے وکیل تھے اور نانا صاحب کے حق کی وکالت کرنے کے لیے برطانیہ گئے تھے۔ مختلف کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترانہ انھیں کے نام سے منسوب ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ ترانہ محض قافیہ پیمائی سے ظہور پذیر نہیں ہوا ہے بلکہ ایسا اکثر تب ہوتا ہے جب کوئی تحریک پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ .... ڈاکٹر حسن مثنیٰ

آج شہیدوں نے ہے تم کو اہل وطن للکارا
توڑ غلامی کی زنجیریں برساؤ انگارا
ہندو مسلماں سکھ ہمارا بھائی بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

دوسری قسم کے وہ شاعر تھے جو کسی بھی نام ونمود کے بغیر نامعلوم طور پر نغمے اور ترانے لکھتے رہے، گاتے رہے۔ اور لوگوں کو آگے بڑھنے کی ترغیب دلاتے رہے۔ ایسے غیر معروف اور نامعلوم شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔

جب ایک بار بغاوت کی چنگاری بھڑک اٹھی اور دھیرے دھیرے شعلہ کی مانند لپکنے لگی تو اس کی تپش جہاں جہاں پہنچی وہاں وہاں لوگوں نے اس بغاوت میں شرکت کو اپنا فرض اولین سمجھا اور مختلف طریقوں سے اس میں شریک ہوتے چلے گئے۔ مختلف مقامات پر جلسے کر کے لوگوں کو جمع کیا جاتا ور باہمی مشاورت سے جنگ آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دی جاتی اس کے لیے اشتہارات بھی تقسیم کیے جاتے۔ 19 مارچ 1857ء کو صادق الاخبار دلی نے کلکتہ کے گلشن اخبار کے حوالے سے یہ خبر شائع کی ہے کہ:

> "گلشن اخبار کلکتہ نے خبر دی ہے کہ آگرہ اور اس کے گرد ونواح کے مولوی انگریزوں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کے لیے مسلمانوں میں اشتہارات تقسیم کر رہے ہیں۔"

بہت سے مقامات پر یہ اشتہارات پوسٹروں کی شکل میں دیواروں پر چپکائے جاتے ہیں۔ مثال کے لیے حیدرآباد کی مکہ مسجد اور چار مینار پر چسپاں کیا گیا ایک پوسٹر ملاحظہ کریں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نصر من اللہ فتح قریب و بشر المومنین

> اگر جو شخص کہ مسلمان ہو کر، کلمہ گو امت رسول ہو کر ارادہ قتل کرنے میں اس کا فر دین یعنی فرنگی تامل کرے گا، اس پر طلاق اور وہ اولاد، دھیڑ اور چمار، گدھے، کتے اور سور کی ہے۔ بلکہ نسل یزید کی اور شمر کی اور بیٹا فرنگی کا ہو تو نہ آوے اور اولاد مسلمان کی ہو کر نہ ٹھہرے، یا امیر یا دیوان یا جاگیردار یا مشائخ یا پیرزادہ یا مولوی، یا قاضی یا مفتی یا صوبہ دار یا کوتوال یا رئیس یا خورد وکلاں کلہم عام خاص ان سب پر قسم ہے اس

اللہ واحد کی اور اس کے حبیب کی اور جو کوئی شریک ہو کر اپنے کو سرخ رو کرے گا۔ البتہ وہ غازی اور قاتل کفار کہلاوے گا۔ اور جو شخص کہ مارا جاوے گا انشاء اللہ تعالیٰ پس تحقیق داخل ہوگا وہ بیچ مجلس سید الشہدا اور شریک مجلس نبی مصطفیٰ کے بے شک واسطے اس کے بہشت اعلیٰ ہے۔ اور قول اللہ کا زبردست بلا دلیل ہے۔ فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم۔ کیوں تامل اور ڈھیل کر رہے ہو۔ یہ وقت فرصت کا ہے۔ ایسا وقت کبھو نہیں میسر ہوگا اور کیوں غافل ہو تم لوگ دیکھو افسوس کرو گے اور ہم کو تمہارے آنے یا نہ آنے سے کچھ اندیشہ نہیں۔ مگر واسطے ہمت دلانے کے، ہم یہاں سب متفق ہو کر ارادہ بذات خود غلبہ کریں گے۔ بلکہ تم سب کو یہ مناسب ہے نشان نبوی لے کر اور سب زیر نشان ہو کر ارادہ قتل کفار کرے تو البتہ دہشت اوپر کافر کے ہو کر بھاگے گا اور دہلی میں عمل بادشاہ جمع وقت شاہ کا ہوا جارہ منزل تنگ اور لازم ہے اوپر رئیس تہنیت علی خاں بہادر افضل الدولہ پرذات سے اپنے نکل کر اور اپنے سایہ اسلام میں لے کر فتیاب اوپر کفار کے ہو کر ارادہ دہلی کا کریں تو بہت مناسب ہے نہیں تو آئندہ بہت قباحت ہے۔ ہم پر واجب تھا، سب مسلمانوں کے جناب میں عرض کیے ہیں، آئندہ مختار ہیں۔ بتاریخ پچیسویں شوال بروز جمعہ یعنی عید المومنین ہے 1273ھ کو مسجد میں جمع ہو کر تم غلبہ اوپر سے کرو ادھر سے ہم غلبہ کرتے ہیں اور اس کو اگر اکھاڑے تو (یعنی یہ کاغذ) وہ نسل یزید کے ہوگا۔"

بہر حال 10 رمئی کو میرٹھ سے انقلابیوں کے دلّی آنے کے بعد عجیب افراتفری کا ماحول رہا۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس صورت حال سے کیوں کر نپٹا جائے۔ ایسے میں بہادر شاہ ظفر کو جنرل بخت خاں کی صورت میں ایک نجات دہندہ نظر آیا جس نے دہلی میں امن وامان قائم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی لیکن وہیں دوسری طرف جنرل بخت خاں کے با اختیار ہونے کے سبب مرزا مغل اور دوسرے شہزادے بہادر شاہ سے نالاں رہنے لگے اور ایک دوسرے کے خلاف شکایتیں کرنے اور سازشیں رچنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں جو انتشار اور ننشار دہلی اور ملک کے دوسرے حصوں میں رہا ہوگا اس کا ذکر تاریخی کتابوں میں بھرا پڑا ہے۔ نواب حیدری بیگم کی کتاب 'غدر کی کہانی' ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں واقعات اس طرح بیان

کیے گئے ہیں کہ کسی فلم کی مانند ہماری نظروں کے سامنے چلتے پھرتے اور متحرک نظر آتے ہیں۔

''میرے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں لال کنوئیں پر دداسو بھا اور پیر بخش غلام کے ہمراہ رتھ میں بیٹھ کر جراح کو دکھانے آئی تھی۔ اس کی دکان سے اتری ہی ہوں گی کہ کچھ سوار علی دین دین کہتے ہوئے ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے کھاری باؤلی کی طرف گھوڑے دوڑاتے چلے گئے، پیر بخش اور دداسو بھا گھبرا کر مجھے ایک کوٹھے پر لے چڑھے۔ اور رتھ بان ایک گلی میں رتھ گھسالے گیا۔ غرض وہاں سے تھوڑی دیر بعد اتر بھاگا بھاگ کر چاوڑی میں سے ہوتے ہوئے نوکری والوں اپنی حویلی پہنچے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حویلی کا پھاٹک بند ہے پیر بخش نے کیواڑ دداسو بھا نے زہرا پھاڑ کو چیخیں ماریں۔ باوا جان جو مارے گھبراہٹ کے بیڑے میں ٹہل رہے تھے اور دو آدمی ہماری خبر لینے کو روانہ کر چکے تھے۔ دوا کی آواز پہچان خود دوڑے ہوئے آئے، کھڑکی کھول ہمیں اندر لیا اور کہا کہ غضب ہوگیا۔ کمپنی کی دیسی فوج بگڑ گئی اور جہاں کہیں بدیسیوں کو پاتی ہے تلوار کے گھاٹ اتارتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھیے کیا نتیجہ ہو۔''

ادھر دہلی کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ بیگم حضرت محل اور احمد اللہ شاہ کی قیادت میں انگریزوں کو زبردست ٹکر دی گئی۔ 1857ء میں لکھنو پر جو کچھ بیتی اس کا نقشہ خواجہ غلام حیدر صفیر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

پہر رات باقی رہی ناگہاں
نہ جھپکی ذرا چشم اہل جہاں
فرنگی جو تھے اندرون حصار
وہ قلعہ سے باہر ہوئے ایک بار
وہاں جتنی توپیں تھیں توڑا انہیں
زن و طفل جو تھے نہ چھوڑا انہیں
''حسن باغ'' کی راہ سے سب گئے
غرض بیلی گارڈ میں وہ جھٹ گئے
بھرا تھا بہت قلعہ میں میگزین

اتارے وہاں گولے دو بلکہ تین
مشبک ہوئی چھت وہ گولہ پھٹا
ہوا شبہ تختہ زمیں کا پھٹا
اڑا ساتھ بارود کے گھر تمام
مع تختہ و سقف و دیوار و بام
صدا وہ ہوئی ہر مکاں ہل گیا
زمیں ہل گئی آسماں ہل گیا
بہت پختہ و خام گھر گر گئے
ہزاروں کھلے بیشتر گر گئے
ہوا غل کہ مچی بھون پھٹ پڑا
ہوا شک کہ چرخ کہن پھٹ پڑا
اڑے اس کے شہ تیر تا آسماں
گھٹا سے بھی کچھ بڑھ گیا وہ دھواں
دروں سے کھلیں جوڑیاں خود بخود
لگ ہوگئیں کنڈیاں خود بخود
ہوئے پیر گردوں کے یوں کان کنڑ
کہ سنتا نہیں نالہ ہائے بشر
لگی جلنے آخر وہ بارہ دری
گئے شعلے تا گنبد اخضری
ہوئے دہشت آلودہ یوں مرد و زن
لرزنے لگے سب کے اعضائے تن
سب اطفال بے خواب ایسے ہوئے
کہ بچے وہ مادر سے سہمے ہوئے
کسی نے کہا یہ اڑی ہے سرنگ

کسی نے کہا ہو گئی ختم جنگ
سرِ راہ تھا غول ہر مرد و زن
کہ خالی ہوا آج مجھی بھون

ادھر حیدر آباد دکن میں بھی محبانِ وطن پیچھے نہیں رہے اور انہوں نے حیدر آباد کی ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ اسی طرح کانپور، بریلی، مراد آباد، جھانسی، پٹنہ اور بہار کے دوسرے مقامات میں بھی بے چینی پھیلتی گئی۔ 1857ء کے واقعات مختلف ادیب و شاعر نے اپنے اپنے طور پر اپنے ادب پاروں میں پیش کیے ہیں اور جس بہتات کے ساتھ اس طرح کے لٹریچر وجود میں آئے وہ ہمارے ادب کا بیش بہا حصہ ہیں۔ کتابوں کے علاوہ مختلف اخباروں نے بھی اپنی اپنی خبروں میں ان واقعات کو پیش کیا ہے۔ اس طرح کے اخبارات میں نور مغربی دہلی، صادق الاخبار، دہلی اردو اخبار، بمبئی کا کشف الاخبار خاص اور اہم ہیں۔

نور مغربی نے اپنے 21 رفروری 1857ء کے شمارے میں ایک خبر اس طرح سے شائع کی ہے:

"علاقہ اودھ میں ایک شاہ صاحب چند روز ہوئے وارد ہوئے تھے۔ مجذوبوں کی طرح بڑ میں یہ بات کرتے تھے کہ دیکھئے عنقریب انتقام لیتا ہوں۔ سب انگریزوں کو نکلوائے دیتا ہوں۔ عوام تو ذرا سی بات میں آجاتے ہیں۔ ایک ہجوم جلد ہی وہاں جمع ہو گئی۔ کپتان اور بڑے صاحب مہتمم شہر کی بھی تجویز ہوئی کہ ان کا اٹھا دینا مناسب ہے۔ خلقت کا ہجوم اچھا نہیں۔ شاہ صاحب کو فہمائش ہوئی کہ اپنا بوریا بستر اٹھاؤ یہاں سے چل دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہ جاؤں گا بلکہ تم سب کو نکلوا دوں گا۔ 16 رفروری کو بہت مُشت مُشت ہوئی۔ آخر کار لڑائی کی نوبت پہنچی۔ شاہ صاحب کے ساتھی بارہ آدمی لڑنے کو تیار ہوئے۔ دو کمپنیاں ان کے مقابلے پر آئیں۔ بندوقیں مارنے لگیں۔ اس مار پیٹ میں لیفٹیننٹ ٹامسن صاحب بہادر 22 رجمنٹ کے سواروں کے دو صاحب اور زخمی ہوئے۔ چند سپاہی مارے گئے۔ شاہ صاحب، کئی آدمیوں سمیت گرفتار ہوئے باقی ساتھی بھاگ گئے۔"

1857ء کی ناکام جدوجہد کے اہم واقعات پر ایک نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے منگل پانڈے نے 29 رمارچ کو چربی لگے کارتوس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور 8 راپریل کو

پھانسی دے دی گئی۔ 9 رمئی 1857ء کو میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے 85 سپاہیوں کا چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کرنے پر کورٹ مارشل کیا گیا اور ان سپاہیوں کو دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ 10 رمئی کو میرٹھ کی تین رجمنٹوں نے بغاوت کردی اور علم بغاوت بلند کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ 11 رمئی کو سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور بہادر شاہ کی شہنشاہیت کا اعلان کردیا۔ 13 رمئی سے یہ بغاوت دہلی سے پھیل کر فیروز پور، علی گڑھ، اٹاوہ، رڑکی، متھرا، لکھنؤ، بریلی اور شاہجہاں پور تک پھیلنی شروع ہوگئی۔ یکم جون سے یہ بغاوت باقی دوسری جگہوں پر پھیلنی شروع ہوئی جس میں مراد آباد، بدایوں، اعظم گڑھ، سیتاپور، بیج، بنارس اور جھانسی شامل ہیں۔ 6 رجون کو نانا صاحب نے کانپور کا محاصرہ کرلیا اور 7 رجون کو جھانسی کے قلعہ پر قبضہ ہوگیا اور رانی لکشمی بائی کی حکومت بحال ہوگئی۔ 9 رجون سے دریاباد، فتح پور، نوگانگ، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوت کی لہر آنی شروع ہوگئی۔ 27 رجون کو نانا صاحب نے کانپور فتح کرلیا۔ یکم جولائی کو بغاوت کی یہ چنگاری اندور اور ہاتھرس میں بھی پھیل گئی۔ 16 رجولائی کو کانپور پر تسلط کی لڑائی شروع ہوئی۔ اور نانا صاحب کی فوج کو بٹھور کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ادھر 27 رجولائی کو کنور سنگھ نے آرہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن 13 راگست کو جگدیش پور میں کنور سنگھ کو شکست ہوئی۔ ادھر 16 راگست کو بٹھور میں تانتیا ٹوپے کو شکست نصیب ہوئی۔ 14 رستمبر کو دہلی میں انگریزوں نے کشمیری دروازہ بارود سے اڑا دیا اور 20 رستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا پھر سے قبضہ ہوگیا۔ 21 رستمبر کو بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرہ میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

> "آہ! دہلی دربار کی نمائش گاہ میں داخل ہوتے ہی ایک تصویر نظر پڑی جس میں بزم تیموری کی گل ہونے والی شمع ابوظفر بہادر شاہ مقبرہ ہمایوں میں میجر ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار کئے جارہے ہیں۔ پشت پر ہمایوں کا مقبرہ نظر آتا ہے جس پر کچھ عجیب دلگیر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ عبا پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے، چہرہ غم والم میں ڈوبا ہوا، بڑھاپے کا رنگ اور متحملانہ یاس کا عالم ہے۔ میجر ہڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑے کھڑے ہیں اور اُن کے دو ہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ میجر ہڈسن کی اس بے باکانہ جرأت پر بادشاہ کا ایک بوڑھا جاں نثار تلوار سونت کر لپکتا ہے۔ ہاتھ میں ڈھال ہے اور بشرہ نڈھال، قریب

پہنچتے پہنچتے برابر والا سولجر پستول سامنے کرکے اس کا بڑھا ہوا حوصلہ پست اور جوش انتقام سرد کر دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ دُنیا کے اس معصیت خیز انجام پر بھی لوگوں کو اس کی ہوس باقی ہے۔ نمائش سے چلتے وقت دہیں دیوانِ حافظ کا خود بخود کھلا ہوا ایک ورق نظر پڑا جس کی پہلی سطر تھی:

"آخر نظرے بہ سوئے ماکن اے دولتِ خاص و حسرت عام"

22 / ستمبر کو بہادر شاہ کے بیٹوں کو گرفتار کرکے ان کو گولی ماردی گئی یا سر قلم کرکے ان کا سر بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ یعنی برطانوی نفرت و دہشت اپنے عروج پر تھی۔ 22/ اکتوبر کو لکھنؤ پر انگریزوں نے پھر قبضہ کرلیا اور 26/ اکتوبر کو تاتیا ٹوپے کو پانڈو کے کنارے انگریزوں نے شکست دی۔ 27/ اکتوبر کو تاتیا ٹوپے نے انگریزوں کو نکال کر ایک بار پھر کانپور پر قبضہ کرلیا۔ 6/ دسمبر یعنی کچھ ہی عرصہ بعد کیمپبل نے تاتیا ٹوپے کو کانپور سے نکال کر پھر سے قبضہ کرلیا۔ ادھر تاتیا ٹوپے وہاں سے فرار ہو کر لکشمی بائی کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ 9/ دسمبر کو کالپی کی لڑائی ہوئی جس میں تاتیا ٹوپے کو پسپا ہونا پڑا۔ 5/ مارچ 1858ء کو مہندی حسین اور گونڈہ اور چہرا کے راجوں کا چندا کے مقام پر برطانوی کیمپ پر حملہ کیا۔ ادھر 21/ مارچ کو لکھنؤ پر انگریزوں نے مکمل کنٹرول حاصل کرلیا۔ 22/ مارچ کو اعظم گڑھ پر کنور سنگھ نے قبضہ کرلیا۔ یکم اپریل کو انگریزوں نے تاتیا ٹوپے کو بیتوا کے کنارے پھر پسپائی پر مجبور کردیا۔ 3/ اپریل کو جھانسی کے قلعہ پر انگریزوں نے دھاوا بولا جہاں سے لکشمی بائی کو بالآخر فرار ہونا پڑا لیکن اعظم گڑھ میں کنور سنگھ کے ہاتھوں انگریزوں کو شکست جھیلنی پڑی اور 23/ اپریل کو جگدیش پور کے مقام پر انگریزوں نے کنور سنگھ سے ایک اور شکست کھائی۔ لیکن افسوس کہ صرف تین دن بعد یعنی 26/ اپریل کو کنور سنگھ کی وفات ہوئی اور انگریزوں کی راہ کا ایک بڑا کانٹا نکل گیا۔ 6/ مئی کو بریلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، 24/ مئی کو کالپی پر انگریزوں نے کنٹرول حاصل کرلیا۔ یکم جون کو رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور نواب باندہ نے گوالیار کے سندھیا کو شکست دی، گوالیار پر قبضہ کیا گیا اور نانا صاحب کو پیشوا بنانے کا اعلان کیا گیا۔ 17/ جون کو انگریزوں کی طرف سے گوالیار کا محاصرہ کرلیا گیا جہاں لڑائی میں رانی لکشمی بائی بالآخر ماری گئی اور تاتیا ٹوپے کو بھاگنا پڑا۔ 20/ جون کو بالآخر گوالیر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ 14/ اگست کو کوٹا اودے پور میں لڑائی ہوئی جہاں تاتیا ٹوپے کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ 17/ اکتوبر کو انگریزوں نے ایک بار

پھر جگدیش پور کا محاصرہ کرلیا اور 19 / اکتوبر کو وہاں کنور سنگھ کے بھائی امر سنگھ کو شکست دی۔ 21 / جنوری 1859ء کو سیکھر کی لڑائی میں انگریزوں نے تاتیا ٹوپے کو شکست دی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن 7 / اپریل کو تاتیا ٹوپے کو گرفتار کرلیا گیا اور 18 / اپریل کو پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح تاتیا ٹوپے اور انگریزوں کے بیچ چوہے بلی کے کھیل کا خاتمہ ہوگیا۔ تاتیا ٹوپے کی پھانسی کے ساتھ ہی انگریزوں کو بڑی حد تک آرام حاصل ہوگیا اور اب وہ پورے ہندوستان پر بلا مزاحمت حکومت کرنے کی پوزیشن میں آگئے۔

جہاں تک 1857ء کی بغاوت یا جدو جہد کا سوال ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہندوستان کی پہلی ملک گیر جنگ آزادی تھی، جو اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی چالاکی اور عیاری کے سبب ناکام ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ 1857ء ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طرف جہاں اس جدوجہد کی ناکامی سے انگریزوں کے پاؤں ہندوستان میں مضبوطی سے جم گئے وہیں دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد مضبوط، مربوط اور قوی تر ہوتی چلی گئی جو 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی کانگریس کے زیر سایہ وطن پرستوں نے کامیاب سیاسی تحریک چلا کر آزادی حاصل کی۔

روداد دار و رسن

1857 کا انقلاب چاہے جن اسباب کی بنا پر ہوا ہو، مگر ایک بات تو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستانیوں کی غرض اس سے یہ تھی کہ ملک کو بدترین غلامی سے نجات دلا کر وطن کی عظمت و آزادی کو پھر سے حاصل کیا جائے۔ یہ تحریک دہلی اور صوبۂ اودھ تک ہی محدود نہیں تھی جیسا کہ چند انگریز مورخین نے اس کی حقیقت کو چھپانے کے لیے کہا ہے بلکہ یہ عام سیاسی بے چینی تھی جو رفتہ رفتہ پشاور سے پٹنہ تک پھیلتی چلی گئی اور تقریباً ملک کا ایک بڑا حصہ اس سے متاثر ہوا۔ اگر یہ عام سیاسی بے چینی نہ ہوتی تو وزیر اعظم انگلستان مسٹر ڈزرائیلی کو 27 رجولائی 1857ء کو یہ نہ کہنا پڑتا:

> ''مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بنگالی دستے کے باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت نہیں کی بلکہ در پردہ وہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اُٹھے تھے''

ہندوستان کے سیاسی اور سماجی زوال کی ابتدا تو اسی دن ہو گئی تھی جس دن سے انگریزوں نے دیسی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کی آپسی لڑائیوں میں مداخلت کرنا شروع کر دی تھی۔ ریاستوں کے ذاتی مفادات نے انگریزوں کی بالادستی کو خود ہی وہ قوت بخشی کہ وہ ان پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ ڈلہوزی کی حکمتِ عملی اور توسیع سلطنت کے لیے ریاستوں کے الحاق نے ہندستان پر ان کی گرفت کو مضبوط کرنے کا سب سے بڑا موقع فراہم کیا ملک کے ایک بڑے حصے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے نے غلام ہندوستان کے تصور کو اودھ کے الحاق سے کچھ اور گہرا کر دیا۔ ہندستانی عوام جو اپنے ملک کے قومی جذبات اور ان کے احترام کو انگریزوں کے ذریعے پامال ہوتے دیکھ کر مشتعل ہوتے جا رہے تھے آخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ انگریزوں کی بدعہدی اور ان کی مکاریوں کا منہ توڑ جواب دیا جائے اگر چہ اسکی ابتدا چربی والے کارتوسوں سے ہوئی لیکن یہ کوئی فوجی بغاوت نہیں تھی، عام لوگوں میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کے جذبات موجود تھے چنانچہ بعض مقامات پر فوجی بغاوت سے پہلے وہاں

کی شہری آبادی نے بھی بغاوت شروع کر دی تھی، چربی والے کارتوسوں کا استعمال اگر چہ ہندوستانیوں کیلئے قابل قبول نہیں تھا تو کئی انصاف پسند انگریز افسر بھی ان کارتوسوں کے استعمال کے خلاف تھے۔

مسٹر ہیلسن نے ایک خط میں لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کو لکھا تھا:

''کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کارتوسوں ایسی چکنی چیز کا استعمال کیا جائے گا۔ یہ بالکل چربی ہے۔ گولی کے دبانے کے بعد بندوق کے منھ کی جالی اسی چربی سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے''

اس کے بعد وہ اپنی رائے کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

''میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل یقین طریق سے ٹھکرا دیا گیا ہے،،

جب اس ناقابل یقین چیز کے استعمال پر اصرار کیا گیا تو ہندوستانی سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور سوار فوج کی پلٹن نمبر 3 کے 85 جوانوں نے اس کے استعمال سے صاف انکار کر دیا، جس پر انھیں فی الفور فوجی عدالت کے روبرو پیش کر کے دس سال عمر قید کی سزا اسی وقت سنادی گئی۔ ان میں سے گیارہ نوجوان سپاہیوں کی سزا میں پانچ سال کی تخفیف کر دی گئی۔ اس انتقامی سزا کا حکم میرٹھ چھاؤنی میں 9 رمئی کو ایسے ذلیل کن طریقے سے سنایا گیا کہ تمام ہندستانی سپاہی برافروختہ ہو گئے۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہیں تھا جس نے اپنے سینے میں اس واقعہ سے نفرت اور رنج کے جذبات اُٹھتے ہوئے محسوس نہ کیے ہوں۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر ہر سپاہی بے حد مشتعل ہوا۔ اس واقعے کے دوسرے دن یعنی 10 رمئی کو یکا یک لاوا پھوٹ پڑا۔

'سواروں کی ایک پلٹن اور دو پیادہ پلٹنوں نے بغاوت کر کے سب سے پہلے جیل توڑا اور اپنے تمام ساتھیوں کو آزاد کرا لیا۔ اس سے فارغ ہو کر اپنے افسروں کے بنگلوں پر حملہ کر کے ہر اس فرنگی کو جو ان کے ہتھے چڑھ گیا، بے دردی سے تہ تیغ کر دیا جس کے بعد انھوں نے دہلی کی طرف یلغار کی،،

11 رمئی کو دہلی میں میرٹھ کی فوجوں کے پہنچنے کے بعد ہر یوروپین بنگلے پر دھاوا بول کرا سے نذر آتش کر دیا۔ جو فرنگی نظر آیا قتل ہوا، عورتیں بچے تک مار ڈالے گئے لکھنؤ، کانپور، جھانسی، باندہ، روہیل

لکھنؤ، غازی پور اور دوسرے مقامات پر بھی دھیرے دھیرے کمپنی کی حکومت کے خلاف محاذ کھلتے گئے بہادر شاہ ظفر کو قائد مان کر انقلابی تحریک کے رہنماؤں نے جا بجا مورچے کھول دیے۔ مگر یہ تحریک اس لیے کامیاب نہیں ہو سکی کہ ہندوستانی ریاستوں نے انقلابیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ زیادہ تر عام شہری آبادی نے اس میں حصہ لیا۔ جنگجو ہندوستانیوں میں ایسے با اثر لوگ بھی موجود تھے جو در پردہ انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ جدید اسلحہ اور سامان جنگ کا فقدان بھی اس انقلاب کی ناکامی کا ایک اور سبب بنا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی فوجوں میں آپسی تال میل کی سخت کمی تھی۔ ہر پلٹن اپنے انداز میں صف آرا تھی۔ جنگی حکمت عملی اور نہ ہی کوئی ایسا منصوبہ تھا جس پر سب متفق ہوں۔ قیادت کی رسہ کشی ایک اور وجہ تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ عام لوگ پہلے ہی شخصی حکومت کے تلخ تجربے اٹھا چکے تھے اور ایک کمزور مرکز سے ان کا یقین پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔

انگلستان سے تازہ دم فوجوں کے آنے سے انگریزی فوج کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ہندستانی فوج کو پسپا کرنا شروع کر دیا۔ ہندستانی فوج پیچھے ہٹتی گئی اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ پیہم شکستوں نے ہندستانی فوج کو اتنا دل شکستہ کیا کہ اس میں مقابلے کی تاب نہ رہی۔ 14 ستمبر کو کشمیری دروازے سے انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ شہر میں پانچ دن لڑائی جاری رہی لیکن شکست کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا شہر میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھاگنے والوں پر گوجروں نے حملہ کر کے انھیں لوٹ لیا۔ بادشاہ اور شہزادے ہمایوں کے مقبرے چلے گئے۔ تمام شہر پھر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں موجود ہیں تو انھوں نے مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ بادشاہ شہر کے باہر نہ جانے پائیں اور انھیں ہر صورت میں انگریزی کیمپ تک پہنچایا جائے۔ الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں ہمایوں کے مقبرے میں جا کر بادشاہ سے ملے۔ حیلے حوالے کر کے بادشاہ ظفر اور چاروں شہزادوں مرزا مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان اور مرزا عبداللہ کو مقبرے سے نکال کر انگریزی کیمپ میں لایا گیا۔ ہڈسن نے دیوان عام کے سامنے جہاں انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا چاروں شہزادوں کو بندوق کا نشانہ بنایا اور ان کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اس سفاکی پر منٹگمری نے ہڈسن کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھا:

> "میرے پیارے ہڈسن! بادشاہ کو گرفتار کر کے اور اس کے بچوں کو قتل کرنے پر تم اور تمہاری پلٹن ہر طرح کی مبارکباد کی مستحق ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسے

معاملات میں تم ہمیشہ کامیاب رہو گے۔"

انگریزوں کا شہر پر قبضہ ہوتے ہی لوٹ مار، قتل اور بربریت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ انگریزوں نے جوش انتقام میں مظالم کی انتہا کردی۔ بغاوت کے شک میں نہ جانے کتنے بے گناہوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کے جرم میں اذیتیں دے دے کر ہندوستانیوں کو ہلاک کیا گیا۔ نکلسن نے ایک افسر ایڈورڈز کو خط میں لکھا:

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں یک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم انھیں زندہ ہی جلا سکیں' یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں' یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کے ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسب ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔"

دہلی پر قبضہ کرنے سے پیشتر ایک افسر لکھتا ہے:

"باغی ہتھیار رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے' اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر موت کی سزا ملنی یقینی ہے' اور نہ ہی اس کے سوا انھیں کوئی امید رکھنی چاہیے تھی۔"

دہلی کے باشندوں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جو مصیبتیں گزریں ان کے لیے افسران نے لکھا ہے کہ:

"باغیوں کے جرائم کے مقابلے میں ہزار گنا سنگین پاداش باشندگان دہلی کو برداشت کرنا پڑی تھیں۔ ہزارہا مرد، عورت اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے تھے، ان سے ہمیشہ کے لیے ان کو ہاتھ دھونے پڑے۔ کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضے میں کرلیا اور باقی سامان توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جس کو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔"

"عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا جن سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا کئی دفعہ ایسی بے کس اور شریف عورتوں

کے غول کے غول ماتمی قافلوں کی شکل دیکھنے میں آئے جن میں سے اکثر بیچاری بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں اور بعض کے ساتھ عمر رسیدہ مرد نظر آتے تھے جو چلتے ہوئے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتے تھے"

"بیگمات کے آنسو" (خواجہ حسن نظامی) میں چند ایسی ہی بے کس شہزادیوں کا تذکرہ ہے جو خانماں برباد ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتی رہیں۔ دہلی کے باشندوں پر کون کون سی قیامت ڈھائی گئی اس کا حال خود منٹگمری سے سنئے:

"ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چار دیواری میں چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں ختم کر دیے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعے سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے، جن کے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیوں کہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا"

چند انگریز مورخین نے شد و مد سے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ 1857ء کی مسلح جدوجہد صرف صوبہ اودھ تک ہی محدود تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقے اس سے متاثر نہ تھے" کھوئی ہوئی سلطنت" The Last Dominion کے مصنف ایل کارتھیل Al Corthill نے بھی اسی بات کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"غدر کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی معنی میں بھی قومی بغاوت نہیں تھی، سوائے صوبہ اودھ کے جو اس وقت مشکل سے انگریزی مملکت کا حصہ کہا جا سکتا تھا"

لیکن خود اس تحریک آزادی کے کچلنے والے افسران کی تحریروں اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ پشاور سے لے کر پٹنہ اور دوسرے مقامات تک انھیں اسی طرح ہندوستانی دستوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا، جس طرح دہلی میں ہوا تھا اور ان پر بھی وہی مظالم ڈھائے گئے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات پر جلد ہی حالات پر قابو پا لیا گیا ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی سخت مقابلے کے بعد ہی کامیابی حاصل ہو سکی۔

10 / جون 1857ء کو پشاور میں سرکاری حکم سے ایک سو بیس افراد کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان ایک سو بیس انسانوں کو قبل از وقت بغاوت کے جرم ماخوذ کیا گیا تھا چنانچہ نکسن نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر ایڈورڈز سے پلٹن میں نمبر 55 کے چند قیدیوں کی جاں بخشی کے لیے سفارش کی۔ سرجان لارنس نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

"چوں کہ یہ ہمارے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے ہیں اس لیے کسی رحم کے مستحق نہیں ہیں"

لیفٹنٹ رابرٹس اپنی ماں کو ایک خط میں اس واقعے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم پشاور سے جہلم تک پیادہ پا سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ "کام" بھی کرتے چلے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور انکو پھانسیوں پر لٹکانا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اُڑا دینے کا جو طریقہ، ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا، یعنی ہماری ہیبت ان کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ یہ سزا کا طریقہ اگرچہ نہایت ہی دل خراش منظر ہے لیکن بہ حالات موجودہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ فوجی عدالت کے حکم سے فی الفور سر قلم کر دیے جاتے ہیں اور یہی پالیسی اس وقت ہر چھاؤنی میں عمل میں لائی جاتی ہے۔"

لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس "کام" کا مقصد یہ ہے کہ:

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندستان پر حکومت کریں گے"

امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کوپر کا بیان ہے کہ ایسے حالات میں ابتداء ہی میں اس قسم کی وحشیانہ سختی کے ساتھ جواب دیا جائے کہ انتقام کا تصور ہی فریق مخالف کو لرزہ براندام کر دے۔ وہ فخر کے ساتھ لکھتا ہے:

"قیدیوں کی دائمی نجات کا راستہ نہایت آسان تھا یعنی باغیوں کو دیکھ کر فی الفور نکلسن کا نعرہ، پھانسی پر لے چلو" بلند کیا جاتا تھا"

13 / مئی کو احتیاط کے طور پر تین ہزار آٹھ سو ہندوستانی سپاہیوں سے لاہور میں ہتھیار چھین لیے گئے اور تقریباً تین مہینے تک چار سو گورے سپاہی رات اور دن ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے۔ 30 / جولائی کے دن تیز آندھی میں وہ بھاگ نکلے لیکن ان میں سے جتنے بھی بھاگ

نہ سکے ان کو چھاؤنی میں ہی گوروں کی توپوں نے ڈھیر کر دیا۔26 نمبر کی اس بٹالین نے دوسرے روز دریائے راوی کو عبور کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کی بروقت مداخلت سے وہ اس مقصد میں ناکام رہے۔یہاں تک کہ کوپر ان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچا دیہاتیوں کی ایک بڑی جماعت نے ان کو گھیر لیا۔ڈیڑھ سو آدمی تو گولیوں سے ہلاک ہوئے باقی دریا عبور کرنے میں کامیاب ہوئے مگر ان کے بیشتر ساتھی ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ایک میل دور جزیرے پر کوپر نے ان کو گھیر لیا اور کشتیوں پر سپاہی بھیج کر ان کو گرفتار کر لیا۔آدھی رات تک دو سو بیاسی آدمیوں کو قید کر کے کوتوالی کے ایک برج میں بند کر دیا گیا اور ان کی باقی تعداد کو دیہاتیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔چونکہ اسی رات بارش ہو گئی تھی اس لیے پھانسیوں کو دوسرے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔دوسرے دن سویرے ایک دستہ رسّے لے کر پہنچا جو درختوں کی کمی کی وجہ سے استعمال نہ کیے گئے۔اتفاق سے یہ دن بقرعید کے تہوار کا تھا۔کوپر کے ساتھ کچھ مسلمان سوار بھی تھے۔چنانچہ باغیوں کو سزا دینے کے لیے اس نے چالاکی سے کام لیا۔

> ”پہلی اگست کو بقرعید کے تہوار کا دن تھا جسے مسلمان ہر سال جانوروں کی قربانی کر کے نہایت دھوم دھام سے مناتے ہیں۔اس لیے مسلمان سواروں کو وہاں سے علاحدہ کرنے کے لیے یہ ایک مفید عذر تھا‘ چنانچہ ان کو اس تہوار کے منانے کے لیے امرتسر بھیج دیا گیا اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کے لیے وہاں اکیلا رہ گیا‘ جو مطلقاً نہ گھبرایا بلکہ پورے حوصلے اور جرأت کے ساتھ اس کام کو بخوبی انجام دیا۔اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ وہاں کے رہنے والوں کی بدبو سے صحت خراب نہ ہو۔لیکن قدرت نے پھر ہماری امداد کی یعنی اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا جس سے اس مشکل کا حل بھی نکل آیا“

قیدیوں کو بازوؤں سے پیچھے کی طرف باندھ کر دس دس کی ٹولیوں میں گولی سے اڑا دینے کے لیے باہر گھسیٹا گیا۔بعد میں باقی قیدیوں نے برج سے باہر آنے سے انکار کر دیا۔اس پر برج کے دروازے کھولے گئے تو ایک نہایت ہی دردناک منظر دیکھنے میں آیا‘ یعنی پینتالیس انسانوں کی لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف‘ گرمی‘ سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک

ہو گئے تھے۔

بنارس اور الہ آباد میں چند لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ باغیوں کی جھنڈیاں اٹھائے ہوئے انھوں نے بازاروں میں منادی کی تھی۔ سہارن پور میں متعدد لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ آگرہ کے دیہات سے متعدد کسانوں کو گرفتار کیا گیا جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ پھر انھیں ان باغی سپاہیوں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا جو قرب و جوار سے پکڑے گئے تھے۔ پٹنہ میں بھی اسی قسم کے واقعات ہوئے۔ بنارس اور الہ آباد میں بے انتہا انسانوں کو قتل کیا گیا یا پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا جب جنرل نیل ان مظالم سے فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے ایک میجر کو کان پور روانہ کیا تو اس نے بھی راستے میں نہایت بے دردی سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ کان پور میں انگریزوں کے قتل نے انگریز افسروں کو کتنا بے رحم بنا دیا تھا اس کی سفاکی بیان کرتے ہوئے کوپر کہتا ہے:

"ایک کنواں تو کان پور میں ہے لیکن ایک دوسرا کنواں بھی ہے جو اجنالہ (ضلع امرتسر) میں ہے"

کان پور کے محصورین کی امداد کے لیے روانہ ہوتے وقت میجر رینالڈ کو جنرل نیل کی طرف سے یہ ہدایات بھیجی گئیں:

"بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لیے منتخب کر دیا گیا ہے، جہاں کی تمام آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتحپور کی تمام آبادی کو محاصرے میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے باغیوں کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اسے وہیں پھانسی دے دی جائے اور اس کے سر کو کاٹ کر وہاں کی سب سے بڑی عمارت پر لٹکایا جائے"

نانا صاحب تو مل نہ سکے لیکن جھانسی کی رانی کو انگریز فوجوں نے گھیر لیا۔ مردانہ وار انگریزی فوجوں سے لڑتے ہوئے اس نے جان دے دی لیکن گرفتار ہونا پسند نہیں کیا۔ 16 رجولائی کو جنرل نے نانا صاحب کو شکست دے کر کان پور پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد مظالم کا انتہائی [illegible] غازی پور، بلیا، دیوریا وغیرہ میں بھی ہندستانیوں پر قہر ڈھایا گیا۔ کثرت کے ساتھ

پھانسیاں دی گئیں۔ جہاں جہاں انگریزی فوج نے پڑاؤ کیا وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلا دیے گئے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلا دینا یا ہندستانیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ فعل قبیح پر مجبور کرنا درندگی کی وہ مثالیں ہیں جو بار بار ہرائی جاتی رہیں۔[1]

ناتھن ہیل، میجر اندرے، وولف ٹون اور پیرس جیسے افسران نے ہندستانیوں پر وہ مظالم ڈھائے جن کا تصور ممکن نہیں۔ لکھنؤ پر سب سے آخر میں انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ فروری 1856ء میں نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد انگریزوں نے اقتدار تو حاصل کر لیا مگر واجد علی شاہ کی موجودگی ان کے لیے سوہان روح تھی چنانچہ 16 مارچ 1856ء میں انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع ہوتے ہی لکھنؤ میں بھی کش مکش کا آغاز ہوا۔ لیکن کسی نے کھل کر قیادت کی ہمت نہیں کی۔ آخر واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے ہمت دکھائی اور اپنے گیارہ برس کے فرزند برجیس قدر کو 5 جولائی 1857ء میں بادشاہ قرار دے کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ انگریز ریزیڈنسی میں محصور ہو گئے۔

اسی دوران مولوی احمد اللہ شاہ بھی اپنی فوج لے کر لکھنؤ آ چکے تھے۔ دونوں فوجوں نے لکھنؤ پر اپنا تسلط جما لیا۔ برجیس قدر کے نام سے احکام جاری ہونا شروع ہوئے اور حضرت محل نے سارا نظم و نسق سنبھال لیا۔ ایک طرف تو احمد اللہ شاہ اور حضرت محل ریزیڈنسی کو گھیرے ہوئے تھے تو دوسری طرف کئی غدار اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ انگریزوں سے برابر پیام و سلام جاری تھے۔ دہلی سے جنرل بخت خاں بھی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ آ گئے تھے۔ نانا صاحب کو بھی حضرت محل نے اپنے امکان بھر امداد دی جب انگریز دوسرے علاقوں پر دوبارہ قابض ہو چکے تو ان کی فوجوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ سر کالن کیمپبل 1858ء میں مع ایک لشکر جرار انگلستان سے

1۔ عراق میں بھی اسی طرح کی ذہنیت اس وقت کارفرما نظر آئی جب امریکی فوجیوں نے انتقام لینے کی غرض سے عراقیوں کے ساتھ کچھ اسی قسم کے مکروہ فعل انجام دیے انھیں کتوں کی طرح گلے میں پھندا لگا کر گھسیٹا گیا، انھیں مادر زاد ننگا کر کے بد فعلی کیلیے مجبور کیا گیا، مذہب کے نام پر دشنام طرازی کی گئی یعنی کہ ہر طرح حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی گئی، اسے پامال کیا گیا جس کی تصویریں بار بار ٹیلی ویژن پر دکھائی گئیں اور پرنٹ میڈیا میں بھی اسے خصوصیت کے ساتھ شائع کیا جس سے دنیا کے مہذب ترین ملک (بہ زعم خاص) کی قلعی کھل گئی ... حسن مثنیٰ

روانہ ہو کر ہندستان پہنچے اور فوراً لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔

عالم باغ اور چار باغ کے مورچوں پر ہندوستانیوں نے سخت مزاحمت کی مگر ایک غدار نے دلکشا کی راہ سے انھیں قیصر باغ تک پہنچنے کا موقع فراہم کر دیا جہاں چولکھی میں حضرت محل اس وقت مقیم تھیں۔ گھروں کی دیواریں توڑ کر چولکھی کو گھیر لیا۔ 16 رمارچ 1858ء کو سخت لڑائی کے بعد حضرت محل مع برجیس قدر کے حسین آباد آ گئیں۔ دو روز حسین آباد میں قیام کرنے کے بعد 18 رمارچ کو لکھنؤ سے رخصت ہو کر بہرائچ کے قریب بونڈی پہنچیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ انگریزوں سے لڑتے رہے۔ آخر ایک دن ان کے سپاہی شرف الدولہ کو گرفتار کر کے لائے "خدنگ غدر" کے مورخ نے لکھا ہے:

> "شرف الدولہ بہ ہمراہی خدمت گار کے پا پیادہ مکان عاشق علی سے نکل کے چھپے راستے میں تلنگے باغیوں نے شناخت کر کے بٹی توپ پر بٹھا لیا۔ احمد اللہ شاہ کے روبرو لے جا کر حاضر کر دیا۔ احمد اللہ شاہ نے بلا استفسار حال و گفتگو اس جرم پر کہ وزیر ہو کر بیگم صاحبہ کے ساتھ کیوں نہ گئے حکم قتل شرف الدولہ کا دیا"

انگریزوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کی پلٹنیں اور نیپال کے راناکی پلٹنیں بھی تھیں، جنھوں نے جی بھر کے لکھنؤ والوں کو لوٹا۔ انسانی خون اس طرح بہا کہ اس سے پہلے لکھنؤ والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا مولوی احمد اللہ شاہ بہادری سے لڑتے ہوئے لکھنؤ سے نکل گئے مگر ایک راجہ نے ان سے غداری کی اور ان کا سر کاٹ کر انگریزوں کو پیش کر دیا۔ حضرت محل ابھی بونڈی ہی میں تھیں کہ جنرل کلائڈ بہرائچ سے اپنی فوج لے کر بونڈی پہنچا۔ ہندستانی فوج نے سخت مقابلہ کیا لیکن انگریزوں کے ایک زبردست حملے سے ان کے پیر اکھڑ گئے۔ حضرت محل اور برجیس قدر مع اپنے چند ساتھیوں کے لڑتے بھڑتے جنگلوں سے ہوتے ہوئے نیپال پہنچ گئے۔ مہاراجہ نیپال نے انھیں پناہ دے دی۔ انگریزوں کو اس پر کوئی تعرض نہ ہوا۔ اپریل 1879ء میں حضرت محل کا نیپال ہی میں انتقال ہوا ان کے انتقال کے بعد مرزا برجیس قدر کو معافی دے دی گئی۔ چنانچہ وہ نیپال سے کلکتہ پہنچ گئے۔

کیوں کہ ایک سال کی خوں ریزیوں کے بعد انگریز لکھنؤ پر قبضہ کر پائے تھے اس لیے انھوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہزاروں لوگ قتل کیے گئے درسیکڑوں کو ریزیڈنسی کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔ ہزاروں لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ چھتر اور موتی باغ کی پلٹنوں

نے ان کے خلاف جنگ کی تھی لہٰذا سیکڑوں سپاہی اس جرم میں گرفتار کر کے قتل کیے گئے۔ وہ شہر جو دہلی کے بعد ہندستان کی آبرو تھا اُسے خاک میں ملا دیا گیا۔ حضرت محل نے اپنے ایک اعلان میں جو یہ کہا تھا کہ:

"کسی شخص نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں دیکھا کہ انگریزوں نے کبھی کسی مجرم کو معاف کیا ہو۔"

اسے انگریزوں نے واقعی ثابت کر دکھایا۔ باغیوں کے ساتھ ہزاروں بے گناہوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کیمپبل خود لکھتا ہے

"میرے خیال میں اس لڑائی کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مجرموں کے مقابلہ میں معصوم اور بے گناہ انسانوں کو زیادہ اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، چنانچہ بزدل باغیوں جن کے ہاتھ بے گناہ عورتوں اور بچوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور اودھ کے غریب دیہاتیوں کے درمیان انتقام لیتے وقت کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ اگرچہ موخر الذکر کے خلاف بھی کسی قدر نا انصافی یا لوٹ مار کا شبہ کیا جاتا تھا۔ پھر بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ بغاوت کے مرتکب نہیں ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بغاوت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی، اس لیے ہم اس جذبہ کو بُرا تو نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ ہمارے حق میں یہ زیادہ مفید اور تسلی بخش ہوتا اگر ہم سپاہیوں کو چھوڑ کر اودھ کے باشندوں کی جان بخشی کر دیتے اور ایسی دردناک سزائیں نہ دیتے۔"

لکھنؤ میں بلا وجہ قتل و غارت کے بارے میں مجینڈی لکھتا ہے:

"لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لیے رسہ اور پیڑ کی شاخ کا استعمال کیا جاتا، یا اگر یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ

وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا"

اودھ کے باشندوں نے نہ تو اس طرح انگریزوں کا قتل عام کیا تھا' جیسا کہ دوسری جگہوں کے بارے میں مشہور ہے پھر بھی ان کے ساتھ جس بے رحمی کا سلوک کیا گیا' اس کی روداد نا قابلِ فراموش ہے۔ انگریزی حکومت کا ایک افسر خود اس کے اعتراف میں لکھتا ہے:

"دس دن کے اندر تمام اندر تمام اودھ سے انگریزی حکومت اس طرح غائب ہوئی کہ ڈھونڈنے سے بھی اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ فوجوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور لوگوں نے بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر ہم سے منھ موڑ لیا۔ لیکن اس تمام عرصے میں نہ کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لائی گئی اور نہ ہی کہیں کسی پر ظلم کیا گیا۔ چنانچہ اودھ کے بہادر اور سرکش باشندوں نے سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر پناہ گزیں انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے ہاں پناہ دی۔ بالخصوص اودھ کے تعلقہ داروں نے تو نہایت فیاضی اور فراخ حوصلگی سے اپنے مفتوح آقاؤں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا۔ حالاں کہ اس سے پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سے انھیں متعدد نقصانات اٹھانا پڑے تھے اور کئی قسم کی نا انصافیوں کا شکار رہ چکے تھے"

اپنے مظالم اور بے گناہ ہندوستانیوں کے قتل کے لیے انگریز افسران نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندوستانی قوم کے لیے ان کے دل میں کس درجہ بے رحمی کے جذبات موجود تھے۔ نکلسن انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کا حوالہ دیتے ہوئے ایڈورڈز کو لکھتا ہے:

"بچوں اور عورتوں کے قاتلوں کو اذیت دینے کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی ایذا دہی کے طریقے مناسب اور صحیح نہ بھی ہوں، پھر بھی ہمیں ان طریقوں کو بالضرور استعمال کرنا چاہیے کیوں کہ یہاں پر اس قسم کے انتقام لینے کے طریقے رائج ہیں۔ دوسری طرف انجیل مقدس میں بھی یہ حکم ہے کہ مجرموں کے اعمال کی مناسبت سے سزا دی جائے گی۔ بنابریں کوئی وجہ نہیں کہ نرم سزا پر اکتفا کیا جائے۔ اگر ایسے قاتلوں کے حق میں پھانسی کی سزا بھی جائے گی تو میرے خیال میں معمولی باغی تو ان سے بدرجہا معمولی سزا کے مستحق ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو،

باوجود اس امر کے کہ مجھے پہلے ہی یہ بتا دیا جاتا کہ میری موت کل واقع ہونے والی ہے
پھر بھی میں ان بدبختوں کو ایسی شدید سزائیں دے کر ہلاک کرتا جہاں تک میرا دماغ
یاوری کرتا"

کمشنر بنارس ہنری ٹکر کے نام ہدایات جاری کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"تمہاری طبیعت چوں کہ فطرتاً نرم واقع ہوئی ہے اس لیے، بحالات موجودہ میں سخت متفکر ہوں، لیکن آپ کو واضح رہنا چاہیے کہ اس قسم کے تمام رقیق جذبات و احساسات کو مطلقاً خیرباد کہنا ہوگا آخر مجسٹریٹوں کو بے فائدہ طور پر تلوار کو بے نیام کرنے کیلئے حکم نہیں دیا گیا۔ نیز واضح رہے کہ خدائی قانون بھی ایک انسانی جان کے ضائع کرنے کی پاداش میں قاتل کیلئے کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں مشرقی ممالک کا تو یہ خاصہ ہے کہ یہاں پر محکوم کے دل میں حاکم کا رعب و دبدبہ ہمیشہ زندہ رکھا جائے کیونکہ ایسے ہی حالات سے زیر محکوم کے نقطۂ نگاہ میں ایک گونہ تبدیلی واقع ہوتی ہے اور وہ حکومت کی موجودگی کو اپنی بقا کیلئے پسندیدہ خیال کرتا ہے"

تاج برطانیہ کے محافظوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ بغیر سرکوبی کے وہ ہندوستان پر حکومت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی عوام کے دل پر ایسی ہیبت بٹھا دی جائے کہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ واجد علی شاہ کو کلکتہ اور بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج کر انھوں نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ 1857ء کی تحریک آزادی نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں جو الاؤ روشن کر دیے ہیں وہ ایک نہ ایک دن یونین جیک کو شعلوں کی نذر کر دیں گے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ملک کے لاکھوں کروڑوں کسان، مزدور کھلے نشان سے ابھی مقتلوں میں موجود ہیں جہاں کبھی جھانسی کی رانی اور مولوی احمد اللہ شاہ کا خون بہا تھا۔ جلیان والا باغ سے چوری چورا تک بندوق کے سامنے سینہ تنے وہی قوم کھڑی تھی جسے کبھی انھوں نے سپارٹیکس (Spartacus) سمجھ کر سولیوں پر لٹکا دیا تھا سائمن گو بیک کے نعروں نے آخر انھیں سمجھا ہی دیا کہ اب ان کے سامنے وہ قوم پھر موجود ہے جو وطن کی خاطر مر تو سکتی ہے لیکن وطن کی غلامی کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ لال قلعہ پر ترنگا لہرانے کی رسم تو 1857ء میں ہی ادا ہو گئی تھی، یہ اور بات ہے کہ ہم نے اسے 1947ء میں دیکھا۔

(بہ شکریہ نیا دور)

مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری

قیمت 200 روپے

ریڈیو نشریات آغاز و ارتقاء

قیمت 300 روپے

فکر فن فنکار

قیمت 200 روپے

ادیب محقق صحافی (چودھری سبط محمد نقوی)

قیمت 300 روپے

تحقیق و تفہیم (مجموعہ مضامین چودھری سبط محمد نقوی)

قیمت 300 روپے

۱۸۵۷: نکات اور جہات

قیمت 400 روپے

حسن مثنیٰ کی دیگر کتابیں کتابی دنیا سے طلب کریں

تاریخ اودھ کا ایک المناک باب

(دستاویزوں کے حوالے سے)

تقسیم وطن اس کے جلو میں ہونے والے فسادات اور مجموعی طور سے کم وبیش ایک کروڑ افراد کی نقل مکانی اور اس عظیم انسانی المیہ سے پیدا ہونے والی صورت سے حکومت ہند کسی حد تک عہدہ برآ ہوئی تو اسے جنگ آزادی کی تاریخ جلد سے جلد رقم کر لینے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے ابتدائی اقدام کے لیے الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر، مشہور مؤرخ اور مشیر وزارت تعلیم کی سربراہی میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ اس کمیٹی کے سپرد کام یہ ہوا کہ ہر ممکن ذریعے سے جنگ آزادی سے متعلق سارا دستیاب مواد یکجا کر لیا جائے۔ اقتدار کی منتقلی سے یہ کام مقابلتاً آسان ہو گیا تھا کیونکہ اب ساری سرکاری دستاویزات حکومت کی دسترس میں تھیں۔ اس کام کا آغاز 1950 میں ہوا لیکن بوجوہ بہت زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی۔

آخر 1953 میں ڈاکٹر سید محمود کی سربراہی میں ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جس کا پہلا جلسہ 3 جنوری کو دہلی میں ہوا۔ اس جلسہ نے ملک کی ساری ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا کہ اس کام کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے علاقائی کمیٹیوں کی تشکیل کی جائے۔ کئی علاقائی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ یوپی اور کشمیر میں اس کام کے لیے ڈاکٹر سید محمود، پروفیسر محمد مجیب اور اچاریہ نریندر دیو پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔

اسی سال، ریاستی سطح پر اس کام میں تیزی لانے کے لیے حکومت اترپردیش نے اچاریہ نریندر دیو کی قیادت میں ایک کمیٹی بنادی لیکن بدقسمتی سے اچاریہ جی کی خرابی صحت، علاج کے سبب ملک سے باہر جانے اور استعفے کے سبب کام میں پیش رفت نہ ہو سکی اور ریاستی حکومت کو 1955 میں ایک 14 رکنی کمیٹی بنانی پڑی جس میں کملاپتی ترپاٹھی، ڈاکٹر سید محمود، اچاریہ بیربل سنگھ، پروفیسر محمد مجیب، آدتیہ نرائن جھا اور صدیق حسن شامل تھے۔

لیکن کام شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ جنگ آزادی سے متعلق ریاست میں اس قدر مواد موجود ہے کہ اسے پڑھنے، چھانٹنے اور ساری معلومات کو مربوط تاریخ کی شکل دینے میں بہت وقت لگے گا۔ اسی وقت مرکزی حکومت نے ہدایت دی کہ 1857ء کے غدر یا بغاوت کے سو سال مکمل ہونے کے سلسلے کی تقریبات کے پیش نظر یہ کام دسمبر 1956 تک بہر صورت مکمل کرلیا جائے۔ اس تبدیل شدہ صورت حال کے پیش نظر محکمۂ تعلیم کے سکریٹری ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی کو افسر خصوصی اور ایم۔ ایل بھارگو کو ریسرچ افسر بنا کر یہ کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ مواد اتنا تھا کہ اس قدر کم وقت میں 1857 کی بغاوت کی مربوط تاریخ تیار نہیں کی جاسکتی تھی چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ متعلقہ دستاویزات کو متعدد جلدوں میں یکجا کر دیا جائے تاکہ مستقبل کا مورخ ان کی بنیاد پر ایک باقاعدہ تاریخ تیار کر سکے۔ ان دستاویزات کی پہلی جلد جو برطانوی اقتدار کے خلاف پہلے تقریباً ملک گیر مسلح احتجاج اور اس کے پس منظر پر مشتمل ہے محکمہ اطلاعات اترپردیش لکھنؤ (پبلی کیشن بیورو) نے 15 اگست 1957ء کو شائع کر دی۔

اس جلد میں جو کم و بیش سوا پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے 1853ء سے 1856ء تک کے کمپنی اور حکومت برطانیہ کے ظلم و ستم اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سطحوں پر کی جانے والی تیاریوں کی داستان بیشتر صورتوں میں دستاویزات کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یہ مربوط تاریخ نہیں ہے بلکہ دستاویزات کے ذریعہ واقعات کا ایسا بیان ہے جو متعلقہ دور کے مطالعے میں معروضی نقطۂ نظر اختیار کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں مؤلف نے، جسے تاریخ سے کوئی خاص علاقہ نہیں واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی یا حکومت برطانیہ کے قبضے سے متعلق ایک مختصر سا بیانیہ ان حقائق کی مدد سے پیش کیا گیا ہے جو پہلی جلد میں موجود ہیں۔ (مؤلف)

اودھ کے ریذیڈنٹ میجر جنرل آؤٹرم نے ان کی معزولی کا حکم نامہ 3 فروری 1956ء کو سرکاری طور پر سپرد کیا لیکن اس کی نقل غیر سرکاری طور پر انھیں دو دن قبل بھیج دی گئی تھی، مقصد شاید یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ سب کچھ نہایت نیک نیتی سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن غالباً اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ دو دن بعد جب یہ فرمان ان کو سرکاری طور پر پیش کیا جائے تو وہ اس دوران نئے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے خود کو نفسیاتی طور پر تیار کر چکے ہوں۔ خیال غالباً یہ بھی رہا ہوگا

کہ اس دوران ان کے وزیر اعظم اور چند دوسرے مشیر انھیں قائل کر چکے ہوں گے کہ اب نئے معاہدے پر دستخط کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

لیکن اس دن ''کمپنی بہادر'' اور حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں نے دھمکیوں اور وظیفہ یا وثیقہ کی لالچ کے ذریعے جو کچھ کرنے کی کوشش کی اس کا بیان کرنے سے قبل کے ڈیڑھ دو سال کے چند واقعات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

24/اگست 1858ء کے ہندو پیٹری آٹ کے مطابق '' باغ سے پھل چرانے'' اور حکمرانوں کو برخاست کر کے ان کی حکومتوں کو اپنے علاقے میں شامل کرنے میں کیا فرق ہے؟ اودھ بدنظمی کا شکار ہے' اس لیے اسے اپنی (برطانوی) سلطنت میں شامل کر لو۔ لیکن یہ منطق پیش کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ اگر دلیل کو اگر پھیلایا جائے تو دنیا کی کوئی حکومت پڑوسی ملک کے حملے سے محفوظ نہ رہ جائے گی۔ اور یہ صورت اس وقت ہے جب حکومت برطانیہ واجد علی شاہ کی مقروض ہے۔ اس باب میں '' الحاق بنام انصاف'' عنوان کے ماتحت ہندو پیٹری آٹ لکھتا ہے'' گورنر ویلزلی ہیسٹنگ نے ان قرضوں کو جو برطانیہ نے اودھ کے بادشاہ سے لیے تھے'' ہماری طاقت کے خوف سے اور رضا ورغبت کے بغیر دیے جانے والے عطیات'' قرار دیا تھا اور برطانوی فوجوں کی تعیناتی کے سلسلے میں گورنر جنرل ڈلہوزی کا دعویٰ ہے کہ ہماری فوجیں نہ ہوتیں تو عوام نے واجد علی شاہ سے پہلے ہی نجات حاصل کر لی ہوتی۔

اودھ کے بارے میں ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ'' اودھ کے نوابوں سے ہمارا تعلق 34 لاکھ روپے سالانہ کی جبراً وصولی کا رہا ہے۔ بشپ ہربر کے مطابق واجد علی شاہ نے حکومت برطانیہ کو جو رقم بہ طور قرض دی اس سے وہ اپنی رعایا کو پریشانیوں سے نجات دلا سکتے تھے۔ ایک دوسرے قرض کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں'' ان کے والد نے بیس لاکھ روپے چھوڑے تھے۔ واجد علی شاہ نے (اس میں سے) دس لاکھ روپے نیپال کی جنگ کے لیے بہ طور قرض لارڈ ہیسٹنگز کو دیے تھے۔ اس رقم پر سود بھی ملنا تھا لیکن بدقسمتی سے واجد علی شاہ نے اس کے بدلے میں دامن ہمالیہ میں ایک ایسا خطہ قبول کر لیا جہاں پیدا کچھ بھی نہیں ہوتا اور وہاں کے باشندے ایسے ہیں کہ جب تک ان پر جبر نہ کیا جائے ٹیکس کی ادائیگی نہیں کرتے اور حکومتِ اودھ کے پاس ٹیکس وصولی کے لیے زور زبردستی کرنا ممکن نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم نے

بادشاہ کو دور دراز کا ایسا علاقہ دے دیا جو دوسروں کا تھا اور الزام یہ لگاتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کا نظم و نسق نہیں سنبھال پا رہے ہیں۔

واجد علی شاہ کی معزولی : نواب واجد علی شاہ اور جنرل آوٹرم کے درمیان اس گفتگو کی روداد جو زرد کوٹھی محل میں 4 رفروری 1956 ء کو ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ انگریزوں کی تیار کی ہوئی ہے۔ جنرل آوٹرم، کیپٹن ہیئس (HAYES) اور کیپٹن ویسٹن کے ہمراہ واجد علی شاہ سے ملاقات کرنے وقتِ مقررہ پر تشریف لائے۔ محل پر توپ کے علاوہ پیادہ دستہ کو پہلے ہی غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ پیادہ دستہ نے اسلحہ کے بغیر سلامی دی۔ درباریوں اور حکومت اودھ کے ان افسران کے پاس جوان کے استقبال کے لیے موجود تھے ایک بھی ہتھیار نہ تھا۔ مقام مقررہ پر بادشاہ سلامت نے جنرل آوٹرم اور ان کے ساتھیوں کا روایتی انداز میں خیر مقدم کیا۔

کانفرنس میں وزیر اعظم کے علاوہ بادشاہ کے بھائی سکندر حشمت، ریزیڈنسی کے وکیل مشیر الدولہ، ان کے نائب صاحب الدولہ اور وزیر مال راجہ بال کشن موجود تھے۔

کانفرنس شروع ہوتے ہی ریزیڈنٹ جنرل آوٹرم نے واجد علی شاہ کو یقین دلایا کہ ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میں نے گورنر جنرل کے خط کی نقل آپ کی خدمت میں دو دن قبل بھیج دی تھی تاکہ بادشاہ سلامت کو اس پر غور و خوض کے لیے کافی وقت مل سکے۔ اب میں اصل خط بہ نفس نفیس آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ بادشاہ سلامت نے خط کو غور سے پڑھنے کے بعد کہا کہ اس کے منشاء و مفہوم اور مشملات کے بارے میں مجھے نہ صرف وزیر بلکہ خط کی نقل سے بھی علم ہو چکا ہے اور اس نوازش کے سلسلے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد واجد علی شاہ نے ریزیڈنٹ کی جانب رُخ کیا اور کہا:

"میرے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے، آخر میں نے کیا کیا ہے"؟

واجد علی شاہ کے اس استفسار کے جواب میں ریزیڈنٹ نے کہا کہ نئی پالیسی اختیار کرنے کے اسباب واضح الفاظ میں اور تفصیل کے ساتھ خط میں درج کر دیے گئے ہیں اور یہ کہ اس موضوع پر نہ میں گفتگو کر سکتا ہوں اور نہ ہدایات سے سرمو انحراف جو مجھے دی گئی ہیں۔ لیکن مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہ سلامت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ برطانوی حکومت نے ان کے گزارہ اور الاؤنس سے سلسلے میں کس قدر فراخدلی کا مظاہر کیا ہے۔ بادشاہ

سلامت ان کی اولاد ذرینہ اور ان کے ورثا کے خطابات' عزت و احترام' عہدے اور درجات ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ خانگی معاملات میں' موت اور زندگی کے علاوہ آپ کا اور آپ کے ورثا کا اقتدار مکمل ہوگا۔ اسی طرح بادشاہ کے ملازمین اعزا و اقربا اور معتمد ملازمین کا بھی ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ بادشاہ سلامت حکومت (برطانیہ و کمپنی) کی خواہشات کا احترام کریں گے۔ آپ کو یہ اطلاع دینا بھی میرا فرض ہے کہ 1801ء کا معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے۔ اس معاہدے کے بعد سے مسلسل ظلم و استبداد بد نظمی اور حالات کی ابتری اور اودھ کے حکمرانوں کے ذریعے ان عہد و پیماں کی خلاف ورزی نے حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی رعایا کی جان و مال کا تحفظ کرے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس پالیسی کو پسند کیا ہے اور ملکۂ معظمہ کے وزرا نے اس کی توثیق کرتے ہوئے گورنر جنرل سے کہا ہے کہ وہ ہندوستان سے واپسی سے قبل اس پر عمل درآمد کریں۔ بادشاہ سلامت تسلیم کریں گے کہ حکومتِ برطانیہ کے لیے اس ہدایت پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ ایک نیا معاہدہ تیار کیا گیا ہے جس کا مسودہ اب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

واجد علی شاہ معاہدہ کا مسودہ قبول کرتے ہوئے بے حد جذباتی ہو گئے۔ انھوں نے مسودہ صاحب الدولہ کی طرف بڑھا دیا اور ان سے کہا کہ اسے بہ الفاظ بلند پڑھیں۔ واجد علی شاہ کا وفادار اور نمک خوار صاحب الدولہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ چند سطروں کے بعد ان سے آگے نہ پڑھا گیا آخر کار واجد علی شاہ نے معاہدہ کی ایک ایک شق خود پڑھی اور پھر بے حد افسردگی کے ساتھ کہا:

> ''معاہدے برابر کے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اب میں رہ ہی کیا گیا ہوں کہ حکومتِ برطانیہ مجھ سے معاہدہ کرے۔ یہ سلسلہ سلاطین اودھ میں سو سال پھلا پھولا۔ حکومتِ برطانیہ نے ہمیشہ اس کا احترام اور تحفظ کیا اور حکومتِ اودھ نے حکومت برطانیہ کے تئیں اپنے فرائض اور ذمّے داریاں پوری کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ یہ بادشاہت حکومت برطانیہ کی تخلیق ہے جو اسے بنانے' بگاڑنے' ترقی دینے یا بے توقیر کرنے کی حقدار ہے۔ حکومتِ برطانیہ کی مرضی و خواہش کی مخالفت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جائے گی۔ میں اور میری رعایا حکومتِ برطانیہ کے غلام ہیں۔

شمس الدولہ نے کہا کہ بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہے کہ ساری توپیں اتار لی جائیں اور سپاہی غیر مسلح کردیے جائیں۔ یہی بات واجد علی شاہ نے بھی کہی کہ ریزیڈنٹ بہادر نے خود محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے سپاہی اور رعایا کس حد تک بے کس و بے بس اور نہتے ہو چکے ہیں''

اس کے بعد بادشاہ نے اپنی بات دہرائی۔ اب معاہدہ کا کوئی فائدہ نہیں اور میں کسی معاہدے پر دستخط کرنے کا اہل نہیں رہ گیا ہوں اپنی عزت و وقار سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔ میں گزارہ یا الاؤنس کے لیے حکومت کو زیر بار نہیں کروں گا اور انگلینڈ جا کر ملکہ معظمہ سے اس فیصلے کے خلاف اپیل کروں گا۔ جنرل آوٹرم نے بادشاہ کے اس خیال پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ نئے معاہدہ پر دستخط نہ ہونے کی صورت میں آپ اور آپ کے خاندان کے لیے کسی قسم کے گذارہ کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ انھوں نے بادشاہ سلامت سے اس مسئلے پر غور وخوض کی درخواست کی کہ کسی بھی غلط قدم کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

وزیر اعظم نے ریزیڈنٹ کے مشورہ کی پر جوش حمایت کی اور کہا کہ میں نے نئے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے بادشاہ سلامت کو آمادہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس پر بادشاہ سلامت کے بھائی سکندر حشمت نے کہا کہ اب وہ آزاد نفس نہیں ہیں اس لیے معاہدہ کا کوئی محل نہیں ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنا صافہ (تاج) ریزیڈنیٹ آوٹرم کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور کہا کہ میں حکومت (برطانیہ) جس نے میرے دادا کو تخت شہنشہی پر بٹھایا تھا' کے اختیار میں ہوں اور وہ اپنی خواہش کے مطابق مجھے بے نام ونشان کر سکتی ہے۔

اس کے جواب میں ریزیڈینٹ نے کہا کہ اگلے تین دنوں میں ہز مجسٹی (واجد علی شاہ) نے حکومت کی مرضی ومنشا کے مطابق کام نہ کیا تو مجھے اودھ کو اپنے قبضۂ اختیار میں لے کر اس پر حکمرانی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا۔

اگلے دن یعنی 5 رفروری کو میجر جنرل آوٹرم نے حکومت ہند کے سکریٹری کو لکھا کہ ہز مجسٹی نے تنک مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دارالسلطنت میں اپنی ساری فوجوں کو فوری طور پر برخاست کر دیا ہے۔ اس سے اسلحہ لے لیے گئے ہیں۔ میں نے ہز میجسٹی کو خط لکھا تو انھوں نے زبانی کہلا بھیجا کہ فوجی تو غیر مسلح کر دیے گئے ہیں لیکن امن وامان کی دیکھ ریکھ پولیس کرے گی۔

اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ فوجی برخاست نہیں کیے گئے ہیں کیونکہ ان کے بقایہ جات ادا کرنے کے لیے روپے نہیں ہیں اور میں نے انھیں مطلع کردیا ہے کہ ان میں سے جو بھی صحت مند ہیں انھیں ان رجمنٹوں میں بھرتی کرلیا جائے گا جو جلدی تیار کی جائیں گی اور جو اس قابل نہیں ہیں کہ فوج میں ملازمت کرسکیں ان کی پنشن مقرر کردی جائے گی یا گریچوٹی ادا کردی جائے گی۔

واجد علی شاہ سے ملاقات کے تیسرے دن یعنی 6 رفروری کو ریزیڈنٹ نے حکومت ہند کے سکریٹری کو دوسرا خط لکھ کر مطلع کیا کہ کل شام (5 فروری) کو وزیر کو طلب کرکے ان کے ذریعے میں نے ہزمجسٹی کو یاددہانی کرادی کہ کل (7 رفروری) کو صبح 9 بجے ان تین دنوں کی مدت ختم ہوجائے گی جو نئے معاہدہ پر غوروخوض کے لیے آپ کو دیے گئے تھے۔

وزیراعظم نے 6 رفروری کی شام میں جنرل آوٹرم سے ملاقات کی تھی اس ملاقات کی روداد کے مطابق جنرل آوٹرم نے ان افواہوں کی تردید کی جن کے مطابق وزیراعظم جلد ہی گرفتار کرلیے جائیں گے اور یقین ظاہر کیا کہ آپ ان پر ذرا کان نہ دھریں گے۔ جواب میں وزیراعظم نے کہا کہ میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس افواہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اور مجھے علم ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ بادشاہ سلامت کو حکومتِ برطانیہ کی خواہشات کے احترام اور نئے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے مشورہ نے میرے بہت سے دشمن پیدا کردیے ہیں جن سے نہ میری جان محفوظ ہے نہ مال۔ سچ پوچھیے تو لوگوں کو اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ مجھے آپ کا تحفظ حاصل ہے تو میرے املاک اور گھر لوٹے جاچکے ہوتے اور میری بے حد توقیر کردی گئی ہوتی۔

ریزیڈنٹ نے چونکہ ریزیڈنسی کے وکیل کے ذریعہ بادشاہ سلامت سے درخواست کی تھی کہ وزیراعظم یا کسی افسر کے ذریعے یہ مطلع فرمادیں کہ ان کی خواہش کیا ہے؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں نئے معاہدہ پر دستخط کے دوران ان کے حضور موجود رہوں یا یہ کہ وہ تحریری طور پر مجھے مطلع فرمائیں گے کہ وہ معاہدہ پر دستخط نہیں کریں گے۔ ریزیڈنٹ نے وزیراعظم کو بھی اطلاع دینے کے لیے زحمت دی ہے کہ کل (7 رفروری) صبح 9 بجے انتظار کی مدت ختم ہوجائے گی۔ وزیر نے کہا کہ میں یہاں سے براہِ راست بادشاہ سلامت کے محل جاکر انھیں معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی ایک اور کوشش کروں گا۔

ریزیڈنٹ نے ایک بار پھر ان نقصانات کا ذکر کیا جو معاہدہ پر دستخط نہ کرنے کی صورت میں

بادشاہ کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ملکہ زمانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور میں نے اپنے طور پر انھیں ایک لاکھ روپے سالانہ کے وثیقہ کی پیش کش کی ہے۔ لیکن یہ وثیقہ معاہدہ پر بادشاہ کے دستخط سے مشروط ہوگا۔

جنرل آؤٹرم نے وزیر اعظم سے التجا کی کہ وہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھیں اور ہز مجسٹی کے گوش گزار کر دیں کہ معاہدہ پر دستخط کے بعد وہ سارے محل اور عمارتیں جن میں ان کی خواتین رہتی ہیں اور جو ان کے آباؤ اجداد کے قبضے میں تھیں حسب سابق ان کے قبضے میں رہیں گی اور صرف سرکاری دفاتر اور عمارتیں برطانوی افسروں کے لیے قبضے میں لی جائیں گی۔

وزیر اعظم نے ریزیڈنسی کے وکیل سے جو اس ساری گفتگو کے درمیان موجود تھا کہا کہ ریزیڈنٹ نے جو بھی وعدے کیے ہیں انھیں تحریری شکل دے دے اور وعدہ کیا کہ ان یقین دہانیوں کو بادشاہ سلامت کے حضور پیش کر کے معاہدہ پر دستخط کرنے کی پرزور سفارش کروں گا۔

7 رفروری کو میجر جنرل آؤٹرم نے حکومت ہند کے سکریٹری کو نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کیا کہ ہز مجسٹی نے معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے اس کی اطلاع آج 8 بجے ایک مختصر سے نوٹ کے ذریعے دی گئی۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ منفی مخالفت اور مجہول مزاحمت کا رویہ اختیار کرنے کے لیے بادشاہ کی ہمت افزائی کانپور کے ایک تاجر مسٹر برانڈی نے کی ہے اور ہز مجسٹی کی یقین دلایا ہے کہ وہ ان کو اپنے ایجنٹ کے طور پر انگلینڈ بھیج دیں تو وہ ان کو بحال کرانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

بادشاہ کی معزولی کے سلسلے میں جو ہدایت نامہ مجھے بھیجا گیا ہے اس کے پیراگراف نمبر 14 میں مجھے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وثیقہ کی رقم معاہدہ کی راہ میں آڑے آتی ہو تو میں وثیقہ کی 12 لاکھ کی رقم کو 15 لاکھ تک بڑھا سکتا ہوں لیکن چونکہ مذاکرات کے دوران بادشاہ یا ان کے کسی وزیر نے وثیقہ کی رقم کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا اس لیے میں نے بھی پیشکش میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ وثیقہ کی رقم میں اضافہ اگر بادشاہ کے پیش نظر ہوتا تو ملکہ زمانی کو ایک لاکھ روپے سالانہ کی پیشکش انھیں اپنا موقف تبدیل کرنے پر آمادہ ضرور کرتی اور وہ یہ معلوم کرنے کے خواہشمند یقیناً ہوتے کہ معاہدہ کرنے کی صورت میں کیا وثیقہ کی رقم بڑھائی جاسکتی ہے۔

ایک فرمان میں بادشاہ نے یہ بتانے کے بعد کہ جب سے لوگوں کو نئی صورت حال کے بارے میں معلوم ہوا ہے انھوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور مسلسل آہ و بکا کر رہے ہیں اور نقل آبادی پر آمادہ ہیں۔ ان کو حکم دیا ہے کہ میں اپیل کرنے یورپ جاؤں تو آپ میرے پیچھے نہ چل پڑیں کیونکہ اس صورت میں حکومت کا بہت نقصان ہوگا۔

میں نے فرمان کے آخری حصے پر اعتراض کیا لیکن بادشاہ اپنے چاپلوسوں سے نجات نہیں حاصل کر پا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نقل مکانی کی بات یورپ میں بادشاہ کے لیے ہمدردی جگانے کے مقصد سے کی جا رہی ہے۔

جنرل آوٹرم نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ گزرے دو دن سے شہر میں ایک اعلانیہ پر دستخط لیے جا رہے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ لوگ بادشاہ کی حکومت سے خوش ہیں۔ خیال ہے کہ اس کوشش کو خاصی کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ لکھنؤ کے باشندوں کے زیادہ تر طبقات کو بادشاہ کی معزولی سے نقصان ہوگا اس لیے کہ وہ اس قومی لوٹ سے محروم ہو جائیں گے جس کا بازار گرم تھا۔

آخرکار واجد علی شاہ 13 رمارچ کی رات میں کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ نئی برطانوی انتظامیہ نے صرف پانچ سو لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی تھی چنانچہ اتنے ہی لوگ ان کے ساتھ جا سکے۔

مندرجہ بالا بیانیہ برطانوی حکمرانوں کی تحریروں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ مؤلف نے کسی بھی مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور جذبات کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔ لیکن اب دو تین باتیں اسے بھی کہنی ہیں۔

1۔ واجد علی شاہ کی معزولی سے اودھ کے عوام صدمہ کی کیفیت میں تھے اور اگر سارا شہر نہیں تو آبادی کا ایک بڑا حصہ ضرور ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا، ورنہ صرف پانچ سو لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت کیوں دی جاتی۔

2۔ عوام اور فوجی بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور انھوں نے معزول بادشاہ کے فرمان کے پیش نظر خون کے آنسو پی کر صبر و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک پوری بساط پلٹ دی جائے اور کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹے۔

3۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ نے تلوار اٹھالی ہوتی تو وہ فوراً ہیرو بن جاتے۔ یقیناً وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بہت بڑے ہیرو بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

لیکن اس وقت تلوار اٹھانے سے نہایت معمولی مزاحمت کے بعد یقینی شکست اور ہزاروں کی موت کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔ واجد علی شاہ نے نئے معاہدہ پر دستخط نہ کرنے میں جس ثابت قدمی کا ثبوت دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

4۔ برطانوی پارلیامنٹ سے اپیل کرنے کا فیصلہ ایک مدبرانہ قدم تھا۔ بس فیصلہ سے انھوں نے خود کو ایک مدبر حکمراں بھی ثابت کر دیا زندگی نے وفا نہ کی' یہ بات دوسری ہے۔

(بہ شکریہ نیا دور)

۱۸۵۷ کے بعد لکھنؤ میں انہدامی کارروائیاں

لکھنؤ کی تاریخی یادگار کے تحفظ کی بات کرنے سے پہلے اس شہر کی اُس تباہی کا ذکر ضروری ہے جو انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ 1857ء کی جنگ کے بعد اُنھوں نے بہت بڑے پیمانے پر انہدامی کارروائیاں کیں اور بلا مبالغہ شہر کے سیکڑوں آباد محلے اور ہزاروں عالی شان عمارتیں کھُدوا ڈالیں۔ ان کارروائیوں کی ابتدا جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہو گئی تھی جب رزیڈنسی کے اطراف کا علاقہ انگریزوں نے اپنی فوجوں کی آزاد نقل و حرکت کے لیے صاف کر دیا تھا۔ کمال الدین حیدر بتاتے ہیں کہ لکھنؤ میں لڑائی کے آثار دیکھ کر انگریز افسروں نے مچھی بھون کے آس پاس کے مکانوں کو گروا دیا۔ پھر رزیڈنسی کے علاقے میں....

"دور تک جتنے مکان سامنے تھے سب کو مسمار کر دیا"۔

(قیصر التواریخ 194)

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ ختم ہونے کے بعد باقاعدہ انہدام کی کارروائیاں شروع ہوئیں۔ ایک انگریز حامی مورخ منشی میڈی لال کا بیان ہے کہ انگریزوں کے تسلط کے بعد....

"ایکا ایک شہر کھدنے لگا۔ اس کے بھی کھودنے والے دنیا سے نرالے آئے۔ وہ مردم مسندراسی حبشی صورت، کیسی عمارت سنگین سر بہ فلک ہو تین جھونکوں میں بنیاد اس کی مٹا دیں۔ پلٹن کی پلٹن آئیں... مَن ہا ئر تنگ لگا لگا کر اماکن نامی اور گرامی گرانے لگے"۔ (نونگہ موسوم بہ محاربۂ غدر)

منشی کالکا پرشاد نحیف لکھتے ہیں:

"اور شہر کی تباہیوں کا حال کیا لکھا جائے کہ روئے زمین پر ایک جنت تھی جواب اب جہنم سے بدتر، سب ویران اور شہر خموشاں ہے۔ یعنی ہزاروں محلوں اور

نادر عمارتوں کو کدالوں کے حوالے کر دیا گیا۔'' (رنگین بازار و انشائے نحیف)

مکانوں کے گرائے جانے سے شہر میں اتنی گرد اڑتی تھی کہ لوگوں کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں عمارتوں کے غائب ہو جانے، پورے پورے محلّے کھد جانے اور نئی نئی سڑکیں نکل آنے کی وجہ سے شہر کا نقشہ ایسا بدل گیا کہ یہاں کے پُرانے رہنے والوں تک کو اپنی مانوس جگہوں پر پہنچنے میں دقت ہونے لگی۔ لکھنؤ کے شاعروں کے کلام میں بھی اس بربادی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جو انگریزوں نے 1857 کے بعد کیں مثلاً امداد علی بحر نے کہا:

لٹ گئے باشندگان لکھنؤ گھر کھد گئے　　خاک اُڑاتے ہیں بگولے خانہ برباد کے

لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش واجب کی رباعی ہے:

شاہوں کے محل گدا کے گھر کھدتے ہیں　　درویشوں کے اتقیا کے گھر کھدتے ہیں
بندے کا مکاں کھدا تو کیا غم واجب　　اندھیر یہ ہے خدا کے گھر کھدتے ہیں

امیر مینائی نے رُباعی کہی:

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے　　روتی ہے لپٹ پٹ کے حسرت ہم سے
ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر　　یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

میر مونس نے کہا:

ہوا گھر بھی عزا خانہ بھی برباد　　رہی باقی محلّے کی نہ بنیاد

سید محمد وزیر (فرزند مفتی میر عباس) کے شعر ہیں:

مسجدیں کھدتی ہیں مطلق بھی نہیں جائے نماز　　حضرت عیسیٰ ہیں اب پروردگار لکھنؤ
وہ سڑک پر گرد اڑتی ہے کہ خالق کی پناہ　　کور کر دے چشم بینا کو غبار لکھنؤ

یہ بیان بھی بہت جگہ ملتا ہے کہ ان کارروائیوں میں تین چوتھائی شہر کھد گیا۔ قلق لکھنوی کا شعر ہے:

تین حصے سے سوا شہر کھدا یا تمام　　جس طرف دیکھو نظر آتا ہے اک ہو کا مقام

1857 کی جنگ کے بعد انہدام کا حساب یہ ہے کہ آدھا شہر انتقامی تخریب کا شکار ہوا اور چوتھائی اُن سڑکوں میں آ چکا جو شہر میں جا بہ جا نکالی گئی تھیں۔ کھد جانے والے علاقوں، محلوں اور عمارتوں میں سے کچھ کے نام بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً عظمت علی کاکوروی بتاتے ہیں:

''امین آباد کے قریب سے نجف تک اور بیلی گارد سے لے کر رومی

ذرہ ذرے تک ایک کف دست میدان ہو گیا... سارے کے سارے مکان نشیب والے مُسلّم توپ دیے گئے اور اُن پر ڈھیر بن گئے۔ ذی الحجہ 1874ھ (جولائی، اگست 1858ء) تک اس طرف کا نصف شہر کھد کر خاک برابر ہو گیا۔ شاہ مینا، شاہ پیر محمد وغیرہ کی بڑی درگاہیں خاک برابر ہو گئیں"۔ (مرقع خسروی 576)

اس ضمن میں کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ۔

"بیلی گارد سے تا دِل کشا میدان صاف کر کے ہر طرف سڑک (بنادی ہے) . پندرہ سو فیٹ تک گرد قلعہ (مچھی بھون) کے میدان کر دیا ہے۔ وہاں سے دو سڑک بہت وسیع کی ہیں. (آصفی) امام باڑے کے گرد کے جتنے مکانات اور عالی شان محلے تھے، تا حسین عمارت عالی شان، میاں حصار تھی سب، ہموار زمین ہوئی۔ امام باڑا احسن رضا خاں، مسجد... ہموار زمین ہو گئی۔ مینا بازار میں قبر شاہ مینا فقط رہ گئی، اور قبریں قدیم داخل حصار رہیں۔ امام آغا باقر خاں کھد کر برابر ہو گیا دریا کے اس پار بھی جو (مکانات) داخل حصار پر پڑے، سب کھد گئے"۔ (قیصر التواریخ 354)

حکیم محمد کاظم اپنی خودنوشت میں بتاتے ہیں:

"شہر کے مشرق اور شمال کی جانب کم کوئی مکان ہو گا کہ باقی بچ ہو۔ تمام خاص بازار، اَردلی بازار، خیالی گنج، اسمٰعیل گنج، گولا گنج، شہتی، نہرہ، مینا بازار، تکیہ ٹول، شیخ دروازہ، کاغذی ٹولا، چاندی بازار، اور مچھی بھون کی عمدہ عمارتیں، گلزاری مل خوانچی کی کوٹھی، بیچ محلا اور دوسری عمارتیں، جن کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ لگا ہو گا، اور (چند کو چھوڑ کر) سارے شاہی مکانات کھود دیے گئے۔ مختصر یہ کہ دو تہائی شہر کھد گیا۔ اور جو ایک تہائی بچا اس میں نہایت لمبی چوڑی سڑکیں نکالیں کہ ہزار ہا مکان ان میں آ کر منہدم کر دیے گئے"۔ (سوانح عمری)

کمال الدین حیدر نے ان تخریبی کارروائیوں میں اس طرح تعمیری پہلو نکالا ہے:

"وسعت سڑکوں سے اور اکثر محلوں کے کھدنے سے فی الجملہ شہر کھل گیا۔ وبا کی بھی وہ شدت نہیں ہوتی" (قیصر التواریخ 355)

بہر حال، جو آنکھیں شاہی زمانے کا گنجان لکھنؤ دیکھے ہوئے تھیں اُن کو انگریزی عہد کا یہ کھلا

ہوا شہر ویرانہ معلوم ہوتا تھا۔ ختم ہو جانے والے تاریخی آثار میں بہتوں کے نام تک مٹ گئے۔ باقی کے صرف نام اور کچھ کی تصویریں بھی مل جاتی ہیں۔ آج جو یادگاریں باقی ہیں ان میں چند مثلاً چھتر منزل، چھوٹا و بڑا امام باڑا، رومی دروازہ وغیرہ صحیح و سالم موجود ہیں۔ بعض کھنڈر ہو رہی ہیں مثلاً ست کھنڈا، حکیم مہدی کا مقبرہ، آصفی امام باڑے کا نوبت خانہ وغیرہ۔ ان عمارتوں کی حفاظت اور مرمت وغیرہ کی جو تدبیریں کی جا رہی ہیں ان کے بارے میں دوسرے حضرات بہتر جانتے ہیں۔ یہ بڑے خرچ والے کام ہیں۔ بہتر ہوگا کہ شکستہ عمارتوں کی درستی پر آنے والے اخراجات کے تخمینے لگا لیے جائیں۔ دنیا میں ایسے دوست مند لوگ موجود ہیں جو ان قومی یادگاروں کے تحفظ کے خواہش مند ہیں۔ ان سے درخواست کی جائے۔ کئی بین الاقوامی ادارے بھی قدیم آثار کو باقی رکھنے میں تعاون کرتے ہیں، ان سے بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

کچھ عمارتیں بالکل شکستہ حالت میں ہیں اور ان کی پوری طرح مرمت ممکن نہیں، لیکن ان کے بچے کھچے در و دیوار، محرابوں اور نقش و نگار سے ان کی اصل ہیئت کا علم ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹر کے جدید طریقوں سے ان کی مطابق اصل سہ بعدی (3D) تصویریں تیار کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ پرانے خصوصاً انگریز، مصوروں اور فوٹو گرافروں نے کثیر تعداد میں لکھنؤ کی عمارتوں کی مستند تصویریں تیار کی تھیں۔ ان میں ایسی عمارتوں کی تصویریں بھی ہیں جو فنا ہو چکی ہیں۔ ان تصویروں کو بھی کمپیوٹر کی مدد سے مزید جان دار اور مطابق اصل بنایا جا سکتا ہے۔ قیصر باغ کا بادشاہی محل، بلکہ پورا قیصر باغ، لکھی دروازہ، مچھی بھون، شیخن دروازہ، پنج محلا، بیگم کوٹھی، وغیرہ کی بہت خوب صورت اور بولتی ہوئی تصویریں معمولی توجہ سے ہمارے سامنے آ سکتی ہیں۔

ان تصویروں کو اپنا قدیم اور اصلی جسم تو اب نہیں مل سکتا لیکن ان کی بنیاد پر لکڑی، پلاسٹر اور دوسرے مسالوں سے کام لے کر ان کے بہت خوب صورت چھوٹے ماڈل تیار کیے جا سکتے ہیں۔ ریزیڈنسی میں رکھنے کیلئے شہر لکھنؤ کا ایک نقشہ بنایا گیا تھا جس میں کئی عمارتوں کے معمولی ماڈل بھی رکھے گئے تھے۔ ہم بھی شہر کا زمینی نقشہ تیار کر کے اور اس میں اپنے بنوائے ہوئے مستند ماڈلوں کو ان کی صحیح جگہوں پر رکھ کر ماضی میں کھوئے لکھنؤ کو پھر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس لکھنؤ کو جو 1857 کے بعد تباہ و برباد کر دیا گیا۔

ہریانہ میں ۱۸۵۷ کا انقلاب اور ردّ عمل

ڈبلیو ٹیلر کمشنر پٹنہ اپنی کتاب " پٹنہ کا تین ماہ کا بحران" میں لکھتا ہے کہ " میں نے حکم جاری کیا کہ پیر علی خاں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے اور انکے مکانات کو زمین سے ملا دیا جائے (1) ٹیلر کا یہ حکم ظاہر کرتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو صرف قتل ہی نہیں کیا بلکہ انکے مکانات کو بھی منہدم کر دیا۔ اسطرح کی انہدامی کاروائی انگریزوں نے ہریانہ میں بھی کیں۔ لیکن انگریزوں کا ہریانہ کے عوام پر کیا گیا ظلم ابھی تاریخ کے صفحات کا حصہ نہیں بن سکا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ 1857ء سے متعلق دستاویزات جو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی (2) اور ہریانہ اسٹیٹ آرکائیوز، چنڈی گڑھ میں محفوظ ہیں وہ اردو اور فارسی زبان میں ہیں اور زیادہ تر خط شکستہ میں لکھی ہوئی ہیں۔ دوسری وجہ 1857ء عہد جدید کے مورخین کا میدان ہے جو زیادہ تر اردو اور فارسی سے ناواقف ہیں۔ 1857 پر مواد اردو، فارسی اور مقامی زبانوں میں تو ہے لیکن ہندی میں کچھ بھی نہیں ہے جو اس دور کے حالات کی عکاسی کرے۔ لہٰذا جدید مورخین نے 1857 پر جو کچھ لکھا ہے اس کا زیادہ تر انحصار برٹش رکارڈس پر رہا۔ 1857ء میں کچھ اخبارات بھی اردو و فارسی زبان میں شائع ہو رہے تھے جن میں دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار اور سراج الاخبار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم سبھی کو معلوم تھا کہ 2007 میں 1857 کی 150 ویں سالگرہ ہوگی لیکن اس کے لئے ہم نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا کہ کوئی کام سامنے آسکے۔ اب جب کہ 2007 ختم ہونے کو ہے تب ہم نے 1857 سے متعلق موضوعات وضع کرنے شروع کئے لیکن مواد کہاں؟ اسلئے کہ اس پر مواد جدید دور کے مورخین کی کتابوں میں جنھوں نے 1857 پر لکھا ہے کچھ ہے ہی نہیں۔ ان موضوعات پر تو مواد آرکائیوز اور لائبریریوں کے شعبۂ مخطوطات میں ہے۔

اپنے ایک خط میں بلبھ گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ، مغل بادشاہ بہادر شاہ کو لکھتے ہیں ۔

در دیدۂ من نیست بجز نقش تو محرم
آئینہ من صورت بیگانہ نگیرد

میری آنکھیں سوا تمہارے غیر کا چہرہ نہ دیکھیں گی۔ میرا آئینہ کسی اجنبی کا عکس قبول نہیں کرے گا۔ آگے لکھتے ہیں:

"میرے آباء و اجداد ہمیشہ سے اسی سلطنت کے وفادار غلام رہے ہیں اور اسکے خلاف کبھی سازش نہیں کی نہ حصہ لیا۔ ایمانداری اور وفا شعاری میں میں وہ چاندی ہوں جسے اچھی طرح پرکھ لیا گیا ہو اگر آپ ایک سو بار بھی جانچیں پھر بھی کھوٹا نہ اتروں گا۔ علاوہ ازیں تابعدار اگرچہ ہندو مذہب رکھتا ہے لیکن میں پیشوایان اسلام کا معتقد ہوں۔ قصبہ کی بنا کے پہلے قلعہ یا بازار میں مسلمانوں کی کوئی مسجد نہیں تھی۔ میں نے قلعہ میں ایک سنگین جامع مسجد تعمیر کر لی ہے۔ علاوہ ازیں میرے ہاں ایک عیدگاہ بھی ہے جو میرے باغ دلکش کے قریب ہے اور عید کے موقع پر وہاں نماز ہوتی ہے۔ یہ اسلئے ہے کہ مسلمانوں سے اتحاد قائم رہے"(3)

ناہر سنگھ کے اس جذبہ کی تصدیق مولوی محمد باقر مدیر دہلی اردو اخبار مورخہ 31 رمئی 1857ء میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"راجہ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ نے ڈیڑھ سو سوار و پیادہ واسطے انتظام و بندوبست شہر وغیرہ کے حضور میں بھیج دیے۔ مولوی احمد علی ملازم راجہ موصوف نے یہ عرض کیا کہ قلعہ کا انتظام و بندوبست راجہ موصوف نے کر لیا ہے۔ چنانچہ حضور اقدس سے بھی یہی حکم ہوا کہ لازم ہے کہ وہ عقیدت کیش بندوبست اسکا ایسا کرے کہ واردات دلی بمدہ بستی و دزدی اور رہزنی نہ ہونے پائے۔"(4)

بہادر شاہ ناہر سنگھ کو لکھتے ہیں

"ہم ملازم خاص نشان سعادت راجہ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ مورخہ 16 راگست 1857ء خود کو معزز کیا گیا سمجھو۔ بار بار زبانی گفتگو کا موقع پڑ جاتا ہے اور ہمارے وفادار مقربوں میں سے کسی کی ضرورت پڑتی ہے۔ بس یہ بہت ضروری ہے کہ تم اپنا کوئی معتمد ایجنٹ دربار میں متعین کرو تا کہ زبانی گفتگو میں دشواری نہ ہو۔ ہر طرح مطمئن رہو اور ایجنٹ کے قائم کرنے میں دیر نہ کرو اور خود کو سرفراز کیا گیا سمجھو۔(5)

1757 میں پلاسی کی لڑائی جیتنے کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہونا شروع

ہو گئے اور انگریزوں نے مختلف پالیسیوں کے تحت ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر ایذا پہنچانی شروع کی جس کے نتیجہ میں ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں راجہ ناہر سنگھ بھی انگریزوں سے متنفر ہو گئے لیکن انگریزوں سے لڑائی میں ناہر سنگھ تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ بلبھ گڑھ کی عوام بھی تھے جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانیں دیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی چھوٹی فوج انگریزوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکی۔ آخر میں ناہر سنگھ کو قید کر لیا گیا۔ انگریزوں نے ان پر مقدمہ چلایا ظاہر ہے کہ ان کی حب الوطنی کا سب سے اہم ثبوت ان کے خطوط تھے جو انہوں نے بہادر شاہ کو لکھے تھے۔ ان کو موت کی سزا سنائی گئی اور 9 رجنوری 1785ء کو انہیں چاندنی چوک کی کوتوالی میں سولی پر چڑھا دیا گیا لیکن انگریزوں کا ظلم یہیں نہیں رکا اب انہیں بلبھ گڑھ کے لوگوں کو ذہنی اذیت دینی تھی اور ان کی بے عزتی کرنی تھی۔ بلبھ گڑھ کا قلعہ بلبھ گڑھ کے عوام کا وقار تھا یہ انکا اور انکے راجہ کا قلعہ تھا جسکی تعمیر میں بلبھ گڑھ کے عوام بھی شامل تھے۔ لہذا برٹش فوج نے فیصلے کیا کہ بلبھ گڑھ کے قلعے کو مسمار کر دیا جائے نتیجتاً بلبھ گڑھ کے قلعے کو زمین سے ملا دیا گیا۔ یہ کام دو باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ایک تو یہ کہ (3) آئندہ بلبھ گڑھ کے عوام اگر انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں تو وہ اس قلعے کو استعمال نہ کر سکیں گے دوسرے اسکی مسماری سے بلبھ گڑھ کے لوگوں کی توہین ہوگی ساتھ ہی وہ ان کو ایک سبق سکھانا چاہتے تھے کہ اگر آئندہ ایسا کرو گے تو تمہاری نشانیوں کو خاک میں ملا دیا جائے گا اور کافی حد تک انگریز اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو گئے۔ آج بلبھ گڑھ میں صرف ناہر سنگھ کا محل رہ گیا اور تمام قلعے اور اسکی دیواریں منہدم کر دی گئیں کہیں کہیں ابھی قلعے کے آثار موجود ہیں جو ایک سو پچاس سال گزرنے کے بعد بھی انگریزوں کے ظلم کی داستان بیان کر رہے ہیں۔ جامع مسجد جو قلعے میں تھی آج بازار کی تنگ گلیوں میں پہنچ کر گم ہو گئی ہے۔ دہلی اردو اخبار مورخہ 24 رمئی 1857ء کو جھجر سے متعلق خبر شائع ہوئی:

> "والئی جھجر نے اپنے بیٹے کو حضور اقدس میں بھیج دیا اور خسر بھی والئی جھجر کے سنے جاتے ہیں کہ آ گئے لوگوں کو گمان تھا کہ والی ممدوح کچھ خیال سرتابی از بندگان سلطانی لکھتا تھا اور انگریزوں کو پناہ دی تھی۔ اب مشہور ہے کہ جو انگریز علاقہ جھجر میں تھے وہ بحفاظت سوار ان نکال دیئے پہاڑ کی طرف (6)

ایک اور خبر اخبار الظفر مورخہ 2 رستمبر محرم الحرام 1274ھ میں جھجر سے متعلق ہے:

''ایک دوست وہاں سے آئے ہوئے تھے بیان کرتے ہیں کہ اول اول فوج جھجر کا ایسا حال ظاہر اور مشہور تھا کہ اگر ذرا اشارہ وایما تخت اسلامی کا پہونچے تو بہ سر وچشم حاضر ہو دیں۔ لیکن جب یہاں سے کچھ سوار اور رسالہ دار افواج منصورہ مرسلہ بندگان اقدس گئے تو فوج جھجر کا وہ مقولہ پاستانی محض زبانی ظاہر ہوا اور مصداق مضمون یَقُولُونَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَالَيْسَ فِي قُلُوْبِهِمْ اور لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْن معلوم ہوا۔ ہر چند ناقل تو بہت طویل کلام سے بیان کرتے ہیں مگر مختصر لکھا جاتا ہے کہ انجام کو رئیس اور انکی سپاہ نے عدم حضوری کے عذر میں تو انتظام کا اپنی ملک کے بہانہ پیش کیا اور زر مطلوبہ کے ادا میں وعدہ احضار بغور وصول زر دیہات اور اغلب ہے کہ پانچ لاکھ کے طلب میں ایک لاکھ انجام کو ادا ہو'' (7)

بہادر شاہ نے محمد عبد الرحمٰن خاں کو خط لکھا کہ وہ بسبب ضعیفی اور حالات کے خراب ہونے کے کتا گئے ہیں اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ درویشی کا لباس پہن لیں اور معہ خاندان تیموریہ پہلے درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی چلے جائیں اور پھر وہاں سے حرمین شریفین کا سفر کریں اور باقی زندگی وہیں یاد الٰہی میں گزار دیں۔ اس خط کے عقب پر ایک انگریز فوجی افسر کا نوٹ ہے وہ لکھتا ہے:

''میرے عزیز کرنل یہ کاغذ مجھے محل کے فرش پر پڑا ہوا ملا تھا۔ اس نوٹ سے بادشاہ کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے بتاریخ 21 ستمبر 1857ء'' (8)

اخبار کی خبر امر بہادر شاہ کے اس خط سے 1857ء میں جھجر کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بہادر شاہ کو جو مدد اور خلوص بلبھ گڑھ کے راجہ سے ملا وہ جھجر سے نہیں ملا۔ حالانکہ ان دستاویزات اور اخبار کی خبر سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کو جھجر سے بلبھ گڑھ کے مقابلہ میں توقع زیادہ تھی لیکن ہوا اسکے برعکس لیکن 14 ستمبر 1857ء کے بعد نواب جھجر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ میٹکاف خود نواب جھجر کو گرفتار کرنے گیا اور بعد میں نواب فرخ نگر کو بھی گرفتار کیا گیا اور بعد میں نواب جھجر کو بھی قتل کر دیا گیا (9) حد یہ ہوئی کہ نواب فرخ نگر، نواب بہادر گڑھ، نواب جھجر اور راجہ بلبھ گڑھ کی جو حویلیاں شاہ جہاں آباد میں تھیں جن کا تذکرہ سیر المنازل میں ملتا ہے (10) 1857ء میں انگریزوں نے انہیں بھی مسمار کر دیا۔ غالب یہ تمام منظر دیکھ رہے تھے اور دوسری جگہوں سے جو خبریں مل رہی تھیں ان کو سن رہے تھے لہٰذا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قلعے اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم وبیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں تھیں شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔"(11)

اس طرح سے برطانوی فوج نے نہ صرف دہلی بلکہ ان تمام شہروں اور قصبات کے قلعوں گڑھوں اور حویلیوں کو مسمار کر دیا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف اس لڑائی میں حصہ لیا تھا لیکن انگریز بڑے انصاف پسند تھے جن ہندوستانی غداروں نے ان کا ساتھ دیا تھا ان کو خوب نوازا۔ دستاویزات غدر میں ان غداروں کی فہرستیں درج ہیں ساتھ میں انہیں اور کیا، انعام ملا یہ سب بھی موجود ہے فرخ نگر میں قلعہ کا صرف گیٹ اور نواب کی حویلی باقی رہ گئی حویلی بہت شکستہ حالت میں ہے حویلی کے نزدیک مسجد ہے جسکو اب مندر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جھجر میں قلعے کا نام ونشان تک نہیں رہا۔ صرف نوابان جھجر کے مقبرے رہ گئے ہیں جنکی قبریں بھی اکھیڑ کر پھینک دی گئی ہیں۔ بہادر گڑھ کے قلعے کا صرف دروازہ رہ گیا ہے باقی سب ختم ہو چکا ہے قلعہ کو مندر میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان آثار کو نہ صرف انگریزوں نے نقصان پہنچایا بلکہ آزادی کے بعد ہم نے بھی اس پر توجہ نہیں کی نتیجتاً ہم نے اپنی تہذیبی ثقافت کے سرمایہ کو کھو دیا۔

اخبار الظفر دہلی بروز اتوار 20 رشہر محرم الحرام 1274ھ جلد 19 نمبر 24 میں سونی پت کی ایک خبر شائع ہوئی سنا گیا کہ کفار نے اہالئ سونی پت سے بیغام دیا ہے کہ کوٹ کو خالی کر دیویں وہ مقام بہت بلندی پر نمونہ پہاڑ کا ہے کفار اسلئے مورچہ بنانے کو کہتے ہیں۔ تین دن کی مہلت دی گئی ہے اور حکم دیا ہے کہ اس عرصہ میں آپ اسے خالی کر دیں تو بہتر ہے نہیں تو سب مکانات اڑا دیئے جائیں گے سو باشندے وہاں کے سخت حیران و پریشان ہیں (12) سونی پت کے بارے میں دستاویزات غدر سے متعلق نظر سے نہیں گذرے کہ وہاں انگریزوں کے خلاف لیڈر شپ سونی پت کے عوام کو ملی کہ نہیں لیکن اس حکم سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں نے سونی پت کے عوام کو ذہنی اذیت دی ان کے مکانات کو مسمار کر کے وہاں پولس اسٹیشن قائم کیا اس لئے کہ اس مقام سے پورے سونی پت کو دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح سے 1857ء میں ریواڑی کے قلعے کو بھی منہدم کر دیا گیا۔ پانی پت کے حوالے سے ایک دستاویز ہریانہ اسٹیٹ آرکائیوز چنڈی گڑھ میں محفوظ ہے۔

"رجسٹر جس کو صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر پانی پت نے حسب شرائط مندرجہ دفعات دس اور گیارہ جسے گورنمنٹ طرح۔ مورخہ آٹھویں نومبر 1857ء موسومہ

صاحب سکریٹری گورنمنٹ بنگال کے بابت تعمیل حکمعافی مشیرہ ملکہ معظمہ کے جرم سے معافی عطا کی اور شرائط مذکور بموجب حکم کے نامزد کو سنائی گئی باغیوں کے نام حسن۔علی خاں۔سونی پت' اصابت علی خاں سونی پت' ہرنرائن۔بھنڈاری پرگنہ پانی پت' عبدالرزاق۔پانی پت' سعد اللہ خاں۔پنی پت' محمد حسین خاں۔پانی پت' احمد علی خاں۔پنی پت' علیم الدین کھیوڑہ' نکلو۔کھیوڑہ' زبردست خاں۔کھیوڑہ منگلی، شامی۔ مغلا رانگڑ۔گھروندہ ہیں سرجندی مندی جاٹ۔اولدی پور' ہر چند منسی جاٹ۔اولدی پور' پت رام جاٹ۔براٹھ دینہ' روپ رام جاٹ۔رسوئی رسوپی" (13)

انگریزوں کی تیار کردہ فہرست باغیان، ساکن پانی پت میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ 1857ء سے قبل ہی ہندوستانیوں میں آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور 1857ء اسی بیداری کا نتیجہ تھا۔ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبات کے لوگوں نے یہ لڑائی لڑی۔آج کے ہریانہ کے شہروں اور قصبات میں بلبھ گڑھ، رہتک، فرخ نگر، بہادر گڑھ، ریواڑی، سونی پت، پانی پت وغیرہ نے آزادی کی اس پہلی لڑائی میں حصہ لیا۔راجہ ناہر سنگھ جو بلبھ گڑھ کے راجہ تھے انہوں نے مغل بادشاہ بہادر شاہ کو خطوط لکھے اور اسکے جواب میں بہادر شاہ نے انھیں اس کے جوابات لکھے جو بڑے اہم ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔1857ء کا ہندوستان یہ تھا کہ راجہ ناہر سنگھ نے جامع مسجد اور عید گاہ تعمیر کرائی۔بہادر شاہ کو ناہر سنگھ لکھتے ہیں کہ

"حالانکہ میں بہت دور پڑا ہوں لیکن صدہا قسموں اور ہزار ہاں اقراروں سے میں اظہار کرتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا حضور کے تخت شاہی کے روبرو کھڑا ہوں"

یہی وہ کیفیت تھی کہ جس نے آزادی کے متوالوں کو 1857ء میں ایک مرکز پر کھڑا کر دیا تھا۔اگر راجہ مان سنگھ مغل بادشاہ اکبر کے قریب آئے تو کوئی خاص بات نہ تھی یہ مغل حکومت کے عروج کا دور تھا۔منصب ملنے کی امید تھی اور پانچ ہزاری ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب بھی ملا۔ لیکن 1857ء میں مغل بادشاہ کے پاس کیا تھا بقول راجہ ناہر سنگھ:

"قلندر بخش خاں رسالدار کے پیادوں اور سواروں کے ہمراہ حضور کے خدمت میں روانہ کیا۔یک حکم عطا فرمایا جائے کہ وہ لوگ کھلے بندوں شہر میں داخل

ہوسکیں اور خلوص دل سے غلام ہو کر اپنی جانیں حضور پر سے قربان کریں (15)"

اس وقت جو بھی بہادر شاہ کے پاس آرہا تھا اور اپنا الحاق قائم کر رہا ہے تھے انہیں یہ بات صاف تھی کہ اپنی جان قربان کرنی ہے۔ 1560ء میں جو لوگ مغل حکومتوں سے لحاق قائم کر رہے تھے اس میں ہر طرح کے فائدے تھے لیکن 1857ء میں صرف قربانی۔ جو ناہر سنگھ کے اس جملے سے قطعی واضح ہے۔ ناہر سنگھ نے ایک اور خط میں لکھا کہ:

"یہ اسلئے ہے کہ مسلمانوں سے اتحاد قائم رہے"

انگریز مورخین اور کچھ ہندوستانی مورخین نے بھی یہ لکھا ہے کہ 1857ء کی لڑائی تو بادشاہ، راجاؤں اور نوابوں نے اپنے مفاد کیلئے لڑی تھی لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ فوج میں کون لوگ تھے یہ سپاہی تھے جو اپنی جانیں دے رہے تھے، میرٹھ میں کون سا راجہ یا نواب تھا۔ انگریزوں سے جنگ میں جان کی قربانی ہندوستانی سپاہیوں نے دی۔ راجاؤں اور نوابوں کو تو سولی پر بہت بعد میں چڑھایا گیا۔ دراصل 1857ء کی پہلی جنگ آزادی ہندوستانی عوام نے لڑی اس میں دہلی، لکھنؤ، جھانسی، اندور وغیرہ کے تمام عوام شامل تھے۔

حواشی و مآخذ

1.Taylor, William, Our Crisis or Three Months at Patna during the Insurrection of 1857, Calcutta, 1858.
2. Imperial Record Department, Press history of Mutiny of the Mutiny papers of 1857. Being a collection of correspondence of the mutineers at Delhi, Reports of Spies of English Officials and Other miscellaneous paper (Calcutta, 1921)
3 Husain, S. M. Azizuddin 1857Revisited, Delhi, 2007.pp. 174-175
4 Dehli Urdu Akhbar, 31st may 1857.
5. Husain, S. M. Azizuddin, Opct pp. 179-180
6 Dehli Urdu Akhbar, 24th July 1857.
7.Akhbarey Zafar, Second Muharram al Haram, 1274 Hijry.
8 Husain, S. M Azizuddin, Opct pp.107-108
9.William, Dalrymple, The Last Mugal. The fall of Dunasty. Delhi 1857.Noida,2006pp32
10.Mirza Sangeen Beg:Sairul Manazil,Delhi,1982.pp29,34.
11.Husain, S. M. Azizuddin, Opct,p.26
12.Akhbarey Zafar, Second Muharram al Haram, 1274
13.Husain, S. M. Azizuddin, Opct,pp. 135- 47
14.Ibid.: 147-148
15.Ibid.: 145-148

ترہت میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب

لفظ ترہت سنسکرت کے "تیرا بھکتی" سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو ندی کے کنارے رہتے ہیں۔ اس میں چمپارن' سہرسہ' مظفر پور' دربھنگہ جیسے پرانے اضلاع کے علاوہ مونگیر، بھاگل پور، پورنیہ اور نیپال کی ترائی کے کچھ علاقے بھی شامل تھے۔ اس کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ، مشرق میں کوسی ندی، مغرب میں گنڈک ندی اور جنوب میں گنگا ندی ہے۔ 1782ء میں انگریزوں نے اسے ضلع قرار دے کر مظفر پور شہر میں اس کا صدر مقام بنایا جس میں دربھنگہ بھی شامل تھا۔ 1875ء میں دربھنگہ اور مظفر پور الگ الگ ضلعے بنا دیئے گئے اور انتظامی امور میں لفظ "ترہت" کچھ دنوں کے لئے غائب ہو گیا۔ پھر 1907ء میں ترہت کمشنری (صدر مقام شہر مظفر پور) بنایا گیا۔ جس میں مظفر پور اور دربھنگہ کے علاوہ سارن اور چمپارن کے اضلاع شامل تھے۔

1 بہت بعد میں سارن (چھپرہ، سیوان، گوپال گنج کے اضلاع) اور دربھنگہ کو بھی کمشنری بنا دیا گیا اور ترہت کمشنری (صدر مقام مظفر پور) میں مظفر پور، مغربی چمپارن، مشرقی چمپارن، ویشالی، سیتامڑھی، شیوہر اضلاع کو رکھا گیا۔

اس طرح انگریزوں کے لئے ترہت کی اہمیت نہ صرف بنگال اور اودھ کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے تھی بلکہ ترہت سے گذر کر ہی انگریز نیپال پر قابض ہو سکتے تھے2۔

مغل بادشاہ شاہ جہاں 1627-49 کے زمانے میں شاہ شجاع بنگال کے گورنر تھے 1639-60۔ انہوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو 1652ء میں محض 3 ہزار روپے سالانہ کے عوض میں ایک "نشان" فراہم کیا کیوں کہ اس کی بیمار بیوی کا علاج ایک انگریز سرجن باؤٹن Boughton نے کیا تھا اس طرح انگریزوں نے سنگھیا (لال گنج ویشالی کے قریب) گاؤں میں ایک تجارتی فیکٹری قائم کیا اور Saltpetre کی تجارت سے دولت کمانے لگے۔ اور دیگر امور میں بھی مداخلت کرنے لگے۔ مئی 1669ء میں قحط آیا جس نے ایک بڑی تباہی مچائی اور شہر حاجی پور

(جس کی بنیاد 4 اویں صدی میں غیاث الدین تغلق کے گورنر حاجی شمس الدین الیاس 1342-57 نے ڈالی تھی زوال ہوا۔ لوگ ڈھاکہ بنگلہ دیش یعنی جہاں گیر نگر کو ہجرت کرنے لگے۔ لہٰذا اس بڑھتی ہوئی اقتصادی خستہ حالی کے پیش نظر ہندوستانی تاجروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر ورنگ زیب کے گورنر ابراہیم خاں 73-1668 نے انگریزوں سے چپقلس شروع کردی۔ اس کے بعد اورنگ زیب کے گورنر سیف الدین محمود سیف خاں نے سنگھیا کی انگریز فیکٹری کے ذمہ دار مسٹر Peacock کو قید کردیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے نیپال میں داخل ہونے کی مہم شروع کر دی۔ 1715ء میں یہ نیپال میں داخل ہونے لگے۔ بیتا کے راجہ دھرب سنگھ نے روم کے کیتھولک عیسائی مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت دے دی کیوں کہ 40-1739 میں راجہ دھرب سنگھ کی بیمار بیوی کا علاج فادر جوسف میری نے کردیا تھا۔ اس طرح 1766ء میں بیتیا میں رومن کیتھولک مرکز قائم ہو گیا3 اور انگریزوں کے لئے نیپال اور ترہت دونوں علاقوں میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

ترہت کی اسی جغرافیائی اہمیت کے مدنظر اکبر کے گورنر مظفر خاں تربتی نے 1572ء میں ترہت میں فوجی چھاؤنی بنائی، اس سے بازار وجود میں آ گیا اور اس بازار کو 18 ویں صدی میں سید رضا خاں مظفر جنگ نے (جو چیت پور بنگال کا راجہ تھا اور محمد شاہ رنگیلا کے زمانے میں مرشد علی خاں کے ذریعہ جنگاؤں کا چکلہ دار مقرر کیا گیا تھا شہر میں ترقی کر کے اس شہر کا نام مظفر پور رکھ دیا۔ 1772ء میں لارڈ کلائیو نے اسے برخواست کردیا اور 1782ء میں وارن ہیسٹنگز نے اس کے بیٹے دلاور جنگ کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کردیا (4) ترہت کی جاگیر ضبط کرلی گئی اور اسے ضلع ترہت کا صدر مقام بنادیا گیا۔ اسی زمانے میں Francois Grand کو پہلا کلکٹر مقرر کیا گیا۔ 1789ء میں موتی پور میں ایک ڈچ سرمایہ دار نے چینی مل قائم کیا، جسے 1816ء میں نیل کی فیکٹری میں تبدیل کردیا گیا۔ 1780ء کے دہائی میں ہی ایک فرانسیسی، (جس کا نام ڈینیل تھا) نے سریا میں نیل کی فیکٹری قائم کی۔ الیکزینڈر نیمل نے کانٹی اور موتی پور میں نیل کی فیکٹریاں قائم کیں۔ مسٹر فنچ نے دیوریا میں، ولیم آربی ہنٹر نے ڈھوتی میں شومین نے بنگرہ میں ایسی ہی فیکٹریاں قائم کیں (5) کلکٹر گرانڈ نے بھی کئی جگہوں پہ اپنی ذاتی فیکٹریاں قائم کیں اور کسانوں کا استحصال کر کے اپنی دولت میں بے شمار اضافہ کیا۔ اس نے دولت کی خاطر کسانوں پہ ظلم اور بد عنوانیوں کو اتنا بڑھاوا دیا تھا کہ انگریزی حکومت نے 1787ء میں اسے برخواست کر کے اس کی

تمام فیکٹریاں اور دولت ضبط کر لیں۔ جس کی پاداش میں 1857ء سے قبل انگریز مخالف منصوبے (6) بننے لگے اودھ کے نواب آصف الدولہ (متوفی 1797ء) کے انتقال کے بعد انگریزوں نے وزیر علی کے جائز حق کو نظر انداز کرتے ہوئے سعادت علی کو اودھ کے تخت پہ بیٹھا دیا اور وزیر علی کے لئے پنشن مقرر کر کے انہیں بنارس بھیج دیا۔ اس کے بعد اودھ کی اقتصادی حالت بگڑتی ہی رہی۔ کسان بدحال ہوتے چلے گئے، ان پہ ظلم بڑھتا گیا، فوجیوں کی تنخواہیں ملنا مشکل ہونے لگیں اور اس درمیان وزیر علی نے اپنے ایک مخبر ملا محمد کے ذریعہ کابل کے حکمراں زماں شاہ اور مرشد آباد کے نواب ناصر الملک کو اپنی حمایت کھڑے ہونے کی تگ و دو کی تاکہ انگریز مخالف محاذ بنانے کی کوشش کی جاسکے۔ لیکن ملا محمد کی گرفتاری ہوگئی، اس کے پاس سے کئی اہم خطوط ملے اور یہ راز فاش ہوگیا، ملا محمد کو قتل کر دیا گیا، وزیر علی کی گرفتاری بھی ہوئی اور اسے کلکتہ میں نظر بند کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ لیکن اس قبل کہ وہ کلکتہ بھیجا جاتا 14 رجنوری 1799ء کو وزیر علی نے بنارس میں مقیم کئی انگریز افسروں کا قتل کر دیا اور فرار ہوگیا۔ وزیر علی کے اس انگریز مخالف عمل میں بہار کے کئی خواص شامل تھے۔ جن کی تلاش انگریزوں کو تھی۔ وزیر علی وجے نگر کے راجہ کی پناہ میں چلے گئے، جس نے انہیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ قید کی حالت میں ہی 15 رمئی 1817ء کو وزیر علی کا انتقال ہوگیا۔ اس درمیان اس کی ایک بیوی الٰہی خانم کو اس کے بیٹے کے ساتھ مارچ 1807ء میں پٹنہ لایا گیا اور وہ یہیں رہنے لگیں لیکن انگریز حکومت کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ ان کی موجودگی عوام میں ان کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے وزیر علی کی دوسری بیوی حسینی بیگم کو ان کے بیٹے کے ساتھ مونگیر میں قید کر دیا گیا اور الٰہی خانم کو بھی یہیں لایا گیا۔ بعد کو انہیں چھپرہ منتقل کر دیا گیا۔ 1817ء کے بعد ان کی تیسری بیوی کو بھی پٹنہ میں ہی قید کر دیا گیا۔ وزیر علی کے بیوی بچوں کی زندگی اب نہایت ہی خستہ حالی میں بہار میں گذرنے لگی اس کا شدید غصہ عوام میں تھا جو کبھی بھی بھڑک سکتا تھا۔ کمپنی حکومت کو اس خدشہ کا شدید احساس تھا۔ 1829ء میں وقف کی زمینوں پہ عائد ٹیکس کی مخالفت میں راحت علی (نیورہ کے زمیندار اور حسن امام و علی امام کے جد امجد) اور میر عبداللہ نے اپنی رہنمائی میں پٹنہ کچہری کے سامنے ایک احتجاجی جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلسے کی وجہ سے بھی عوام میں انگریزوں کے خلاف غصہ و نفرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

1845-46ء میں جب شمال مغربی سرحدی صوبے میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان

جنگ ہو رہی تھی تب پٹنہ کے مسلم خواص نے اس موقعہ کا فائدہ اٹھانا چاہا کہ ایسے موقعے پہ انگریزوں کو بھگانا نسبتاً آسان ہوگا۔ ان لوگوں نے دانا پور چھاؤنی میں تعینات ہندوستانی سپاہیوں کو ملا کر ایک انگریز مخالف محاذ بنانے کی ترکیب سوچی۔ خواجہ حسن علی خاں (جسٹس خواجہ محمد نور کے پردادا) اور منشی پیر بخش، (جو دانا پور چھاؤنی میں فوجی معلم تھے) نے راحت علی سمیت کئی لوگوں کو انگریز مخالف محاذ میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ سون پور کے سالانہ میلے میں خواجہ حسن علی خاں کے خیمے میں مسلم زمینداروں کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ اس میں سیف علی خاں نام کا ایک شخص بھی شامل تھا جسے دہلی کے مغل بادشاہ کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا۔ منشی پیر بخش اور سیف علی نے منصوبہ بنایا کہ برطانوی ہند کی فوج میں جو ہندوستانی سپاہی ملازم ہیں انہیں انگریز مخالف محاذ میں شامل کیا جائے۔ اسی منصوبے کے تحت پٹنہ کے داروغہ میر باقر کو سوگولی (چمپارن) چھاؤنی میں بھیجا گیا۔ جہاں اس نے سادہ خاں نام کے کسی فوجی افسر کو اپنے منصوبے میں شامل کر لیا۔ دریں اثنا ان لوگوں نے جگدیش پور (آرہ، شاہ آباد) کے زمیندار کنور سنگھ کو بھی اپنے منصوبے میں شامل کر کے خفیہ طور پر ایک چھوٹی فوج تشکیل کر دی۔ حب الوطنی کی اس خفیہ ''سازش'' میں ٹیکاری (گیا) کے راجہ، ان کے دیوان منشی چراغ علی اور ترہت (مظفر پور) کے پرنسپل صدر امین خواجہ ہدایت علی خاں بھی شامل ہو گئے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی زمینداروں کو بھی سون پور میلے میں اکٹھا ہو کر نیپال کے راجہ اور دہلی کے مغل بادشاہ کی مدد سے ایک بڑی فوج کھڑی کرنی تھی لیکن موتی مشرا نام کے ایک پولیس جمعدار نے اس خفیہ خبر کو میجر رو کروفٹ کو مطلع کر دیا اس طرح یہ راز وقت سے قبل فاش ہو گیا اور ایسے تمام لوگوں کے خلاف انگریز پولس نے انتقامی کاروائی کرنی شروع کر دی۔ راحت علی کے دونوں مکان (سبری باغ، پٹنہ اور نیورہ) پر ایک ساتھ چھاپہ مارا گیا۔ راحت علی گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے مکان سے جو کاغذات وخطوط برآمد ہوئے اس سے یہ پتا چل گیا کہ سہرام خانقاہ کے شاہ کبیر الدین اور خواجہ حسن علی خاں وغیرہ بھی اس انگریز مخالف مہم میں شامل تھے۔ حالانکہ خواجہ حسن علی خاں، پٹنہ کے داروغہ میر باقر کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ترہت کے ایک گاؤں بڑھی میں پناہ گزیں ہوئے۔ 24/دسمبر 1845ء کو منشی پیر بخش کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے سرکاری گواہ بنا لیا گیا۔ لیکن اس نے کچھ اس طرح سے گواہی دی کہ راحت علی رہا کر دئے گئے۔ اسی طرح خواجہ حسن علی خاں بھی 8/اکتوبر 1846ء کو بری کر دئے گئے۔ میر باقر (پٹنہ

کے داروغہ) نیاز علی (پٹنہ کے قاضی) برکت اللہ (پٹنہ کے سرکاری وکیل) کو نوکریوں سے برخاست کر دیا گیا اور شاید ترہت (مظفر پور) کے پرنسپل صدر امین خواجہ ہدایت علی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پولس جمعدار بھیکن خاں کو تین سال کی سزا (کورٹ مارشل کے بعد) ہوئی پھر عمر قید لیکن بعد میں رہا کر کے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ اس طرح 46-1845ء کی اس انگریز مخالف محاذ آرائی کو انگریزوں نے کچل ڈالا لیکن انگریزی حکومت کے خلاف خواص وعوام کا غصہ بڑھتا ہی رہا اور زمینداروں کے درمیان کثیر المذہبی اتحاد سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انگریز حکام بہت زیادہ خطرناک انتقامی کارروائی کرنے سے گریز کرنے لگے بلکہ یہ تاثر دینے لگے کہ انگریزی حکومت ہندوستانیوں کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرے گی لیکن انہوں نے عام لوگوں بالخصوص کسانوں کی گرفتاریاں بھی جاری رکھیں اس زمانے میں جیلوں میں کھانے کا انتظام بہت ہی برا تھا۔

ایسے نامساعد حالات میں انگریزی حکومت نے 1855ء میں یہ فیصلہ کیا کہ جیلوں میں قیدیوں کو ملنے والے پیتل کے لوٹے ضبط کر لئے جائیں گے اور انہیں مٹی کے برتن لوٹے وغیرہ ہی استعمال کرنے ہوں گے۔ اس فیصلے نے آرہ اور مظفر پور کے جیلوں میں بند قیدیوں کے غصے میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ ہندو قیدیوں کو پیتل سے ایک خاص مذہبی عقیدت تھی لہٰذا اس قدم کو مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف سمجھا گیا اور اس طرح لوٹا بغاوت (7) شروع ہوئی (ہوا یوں تھا کہ اپریل 1854ء میں علی پور (24 پرگنہ بنگال) کے جیل میں ایک قیدی نے وہاں کے ظالم و جابر جیلر کا قتل اسی پیتل کے لوٹے سے مار کر کر دیا تھا۔)

پیتل کے لوٹے کو ہٹانے کے فیصلے پر آرہ اور مظفر پور کے قیدی بھڑک اٹھے۔ ان کے اس بغاوت میں عام لوگ بالخصوص کسان بھی بڑے پیمانے پہ شامل ہو گئے۔ مظفر پور کی سڑکوں پر رعیت اور شہر کی عام آبادی نکل آئی اور پوری خلقت جیل کی جانب بڑھنے لگی۔ جیل پر حملہ کر کے قیدیوں کو رہا کرا دیا گیا۔ ایسا ہی واقعہ 24 سال بعد پیرس میں انقلاب فرانس کے وقت 1789ء میں ہوا جب باسٹل کے جیل سے باغی عوام نے قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ عوام کے اس غصے بھرے احتجاج سے مجبور ہو کر انگریزی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور پیتل کے لوٹے کی اجازت قیدیوں کو مل گئی۔ شاد عظیم آبادی 1927-1846 کی تصنیفیں "تاریخ بہار" 1876 اور "نقش پائیدار" سے پتہ چلتا ہے کہ "لوٹا بغاوت" کی تیاری خفیہ طور پر دراصل ترہت کے پولس جمعدار وارث علی نے کی تھی جو خود کو

مغل بادشاہ کے خاندان کا فرد کہتا تھا۔ شاد عظیم آبادی کا ناول یا ناولٹ (جسے تقی احمد ارشاد نے ترتیب دے کر 1993ء میں شائع کیا) ''پیر علی'' انہیں دو کتابوں کے مواد سے تیار کیا گیا ہے۔

10 رمئی 1857ء کو اس تحریک کا طوفان میرٹھ سے اٹھا۔ بہار میں بھی ایسی تیاریاں جاری تھیں۔ 12 رجون 1857ء کو دیوگھر کے پاس روہنی میں سپاہیوں کی بغاوت اس کا پیش خیمہ تھی۔ جس کے بعد فوجی چھاؤنی کو روہنی سے منتقل کر کے بھاگل پور لایا گیا لیکن اگست 1857ء میں یہاں بھی بغاوت بھڑک اٹھی۔ خائف انگریز صاحبوں نے ضلع انتظامیہ مظفر پور سے حفاظتی انتظامات کی مانگ کی۔ اس دوران ''وہابیوں'' کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ کیونکہ ترہت کے علاقے میں حاجی مبارک علی کی رہنمائی میں ''وہابی'' تحریک کا بڑا زور تھا۔ واضح رہے کہ بہار میں صادق پور خاندان کے علاوہ دو اور جماعتیں برٹش مخالف تحریکوں میں سرگرم تھیں۔ ایک جماعت (گروہ) کو ''لکھنؤ گروپ'' کہا جاتا تھا جس میں پیر علی، یوسف علی، امام الدین اور مسیح الزماں وغیرہ شامل تھے۔ دوسری جماعت ''دہلی گروپ'' کہلاتا تھا جس میں وارث علی اور علی کریم (ڈومری، گیا کے زمیندار) وغیرہ شامل تھے۔ دہلی گروپ پر حکومت کو یہ شک تھا کہ اسی نے دانا پور کے سپاہیوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ لکھنؤ اور دہلی گروپ نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ لیا کہ جمعہ 3 رجولائی 1857ء کو بغاوت شروع کر کے علی کریم کو صوبہ کا حکمراں (یا گورنر) منتخب کر دینا ہے شاید بیتیا کے راجہ بھی اس منصوبے میں شامل تھے لیکن اس سے قبل ہی وہاں خوف و دہشت کا ماحول بن چکا تھا۔ نیلہا صاحبان کی بے چینی کے مدنظر مظفر پور کے مجسٹریٹ نے 14 رجون کو علاقے کے سبھی یوروپی نیلہا صاحبان کو مظفر پور شہر منتقل ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اس درمیان پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر نے پٹنہ کے چند مسلم خواص کو 19 رجون کی رات کھانے پر مدعو کیا۔ اس میں مولوی محمد حسین، مولوی احمد اللہ، مولوی واعظ الحق وغیرہ شامل تھے۔ اس دعوت کے بہانے اس نے ان سبھی شرفاء کو گرفتار کروا لیا اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے ہتھیاروں کو تھانوں میں جمع کر دیں۔ محض شبہہ کی بنا پر مظفر پور میں بھی شہر کے علاوہ دیہاتوں (مثلاً سنگھیا، لال گنج وغیرہ) سے مسلمانوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا گیا۔

23 رجون 1857ء کو وارث علی، جمعدار پولس چوکی بروراج Barvraj سے گرفتار کر لیا گیا (8)۔ رابرٹسن اور اس کے ہمراہ کئی نیلہا صاحبان نے وارث علی کو اس کی پولس چوکی بروراج

سے اس وقت گرفتار کیا جب وہ علی کریم کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ وہ بھی ان کے منصوبے میں شامل ہے۔ وارث علی کو سوگولی چھاؤنی کے میجر ہولمس کے پاس روانہ کیا گیا تاکہ اسے پھانسی کی سزا لیکن وہاں سے انہیں سزائے عمر قید سنا کر دانا پور بھیجا گیا جہاں کمشنر ولیم ٹیلر نے 6رجولائی 1857ء کو پھانسی کی سزا کا مستحق۔ ولیم ٹیلر کے مطابق وارث علی کے پاس جو خطوط ملے ان میں کچھ خطوط میں نیلہا صاحبان کے مظالم اور کسانوں پر ظلم و جبر و استحصال کے ذریعہ یوروپی نیلہا صاحبان کے ذریعے بڑی دولت جمع کرنے کے خلاف غصے کا اظہار بھی تھا(9)۔ 23رجولائی 1857ء کو شام چھ بجے شام کو وارث علی کو پھانسی دے دی گئی۔ شاد عظیم آبادی کے مطابق پیر علی (جو وارث علی کے ہم نوا بھی تھے) نے لوگوں کو ان کے مذہب کے نام پر بھی اکٹھا کیا تھا کہ انگریزی حکومت سے ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کو خطرہ پہنچ رہا ہے۔ فضل حق خیر آبادی 1861-1797 نے بھی انگریزوں کے خلاف اس تحریک کے دوران فتویٰ جہاد جاری کیا تھا۔ اور کچہری کی سربراہی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا' اس تحریک کے نتیجے میں متوقع آزاد ہندوستان کا ''پہلا آئین'' بھی تیار کیا گیا تھا جو کہ ''جمہوری اصولوں'' پر مبنی تھا۔ اس کے لئے انہیں انڈمان کی جیل میں قید کر دیا گیا(10)۔ فضل حق خیر آبادی کی شاگردوں میں ترہت کے مشہور شاعر مرشد حسن کامل بھی تھے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مرشد حسن کامل کا ذکر جن کتابوں (مثلاً ''ریاض ترہت'' 1868 اور ''آئینہ ترہت'' 1883) میں ملتا ہے ان میں تحریک 1857 کے متعلق سکوت اختیار کر لیا گیا ہے بلکہ 1875ء میں جب انگریزی حکومت کے ہندوستانی و یوروپی افسران مظفر پور میں زراعتی و صنعتی نمائش کا پرشکوہ اور پرحشمت انتظام کرتے ہیں تو کامل انگریز حکام و گورنر کی شان میں قصیدے بھی پڑھتے ہیں۔ بہر کیف کسان مظفر پور میں نیلہا صاحبوں کے ظلم سے تنگ آکر ان سے کافی متنفر تھے۔ کیونکہ انہوں نے کسانوں کو خستہ حال غلاموں میں تبدیل کر دیا تھا۔ یوروپی پلانٹرز کی رہائش سے میلوں دور بھی کسانوں کو جوتے پہن کر چلنے کی اجازت نہیں تھی نہ ہی انہیں بارش میں چھاتے کے استعمال کی اجازت تھی۔ یہاں تک کہ 20ویں صدی کے شروعات میں بھی' (جب کہ انگریز مخالف قومی تحریکیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں اور ہندوستانیوں کی جسارت بڑھ چکی تھی) انہیں بہت طرح کے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ مثلاً

(1) بپھی پوی ٹیکس: باپ کے انتقال کے بعد بیٹے کو اپنے باپ کی جائیداد کی وراثت

حاصل کرنے کا اختیار اس وقت تک نہیں تھا جب تک وہ اپنے علاقے کے انگریز نیلہا افسر کو ٹیکس نہ ادا کردے۔

(2) تین کٹھیا نظام: ہر ایک بیگھہ یعنی 20 کٹھا کی زمین کے پلاٹ میں 3 کٹھا کا وہ حصہ جو سب سے زرخیز تھا' نیل کی کھیتی کے لئے جبراً مقرر کردیا گیا تھا۔ اس نیل کی کھیتی کے تمام اخراجات کسانوں کو دینے تھے جبکہ اس کا منافع نیلہا صاحبوں کو جاتا تھا۔

(3) گھوڑہی۔ بھینسی ٹیکس: صاحبوں کے گھوڑوں کے لئے کسانوں سے ٹیکس لیا جاتا تھا۔
بنگلہی ٹیکس: انگریزوں کے بنگلوں کی تعمیر و مرمت کے لئے بھی کسانوں سے ہی ٹیکس لیا جاتا تھا۔(11)

نیل کے علاوہ چینی کے لئے گنے کی کھیتی بھی جبراً کروائی جاتی تھی کیوں کہ 1780ء کے بعد سے یوروپ میں چائے کی مقبولیت بڑھ گئی تھی جس کے لئے چینی کی کھپت بڑھ رہی تھی۔ اسی لئے اس علاقے کی زرخیزی کے پیش نظر موتی پور میں 1789ء ایک ڈچ نے چینی مل قائم کیا۔ چونکہ گنا پورے سال تک (نومبر سے نومبر تک) کھیتوں کو مصروف رکھتا تھا ایسی صورت میں ایک بار بھی اگر فصل تباہ ہوئی تو کسانوں کی بدحالی بڑھ جاتی تھی ایسا ایک بار 03-1802 ہوا جب میں سفید چینٹی کے حملوں نے گنے کی فصل تباہ کردی(12)۔ نتیجتاً پورے ترہت میں قحط سالی ہوگئی۔ اس طرح زمین کے زرخیز ترین حصوں پہ نیل اور گنے کی جبریہ کھیتی کی وجہ سے بھی 1857 سے قبل بھی مسلسل انگریز مخالف بغاوتیں ہوتی آرہی تھیں لیکن کمزور کسانوں کی بغاوتوں کو انگریز کچلنے میں اکثر کامیاب ہوجاتے تھے۔

14 جون 1857 کو اسی وجہ سے ترہت کے مختلف علاقوں سے تقریباً 80 یوروپی پلانٹرز نے مظفر پور شہر میں آکر پناہ لیا۔ انہیں اپنے ظلم کا خمیازہ بھگتنے کا وقت نظر آرہا تھا۔ اس لئے وہ شدید بے چینی میں مبتلا تھے۔ ان کا خوف ان کے ظلم کا واضح ثبوت تھا۔ کسانوں کے اوپر ہونے والے ظلم واستحصال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 20ویں صدی میں بھی چمپارن کے کسانوں کو پیر محمد مونس (1949-1882)' حافظ دین محمد انصاری (1961-1883)' شیخ گلاب' بطخ میاں (1957-1867)' حافظ محمد ثانی (1951-1888)' شیخ عدالت حسین (1943-1858) اور دیگر کئی لوگوں کی رہنمائی میں انگریز مخالف تحریکیں چلائی گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظفر پور میں تعینات

افسروں نے باغی نجیبوں (سپاہیوں) کی گرفتاری کے لئے سخت ترین اقدامات کئے۔ پریس پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ نیپال سے ترہت کے دور دراز علاقوں میں لوگوں کی آمد پر سخت پابندی لگا دی گئی اور مظفرپور شہر کے مغربی کنارے پر سکندر پور میں واقع دربھنگہ مہاراج کے قلعہ نما مکان کی قلعہ بندی شروع کر دی گئی تاکہ خائف انگریز حکام و نیلہا صاحبان وہاں پناہ لے سکیں۔
جولائی 1857ء سے ترہت میں باغی سپاہیوں کی گرفتاری کا کام مزید تیز کر دیا گیا۔ 3/جولائی 1857ء کو مظفرپور کے مجسٹریٹ رچرڈسن نے پٹنہ کے کمشنر ٹیلر کو یہ اطلاع دی کہ ترہت کی تمام ندیوں کے گھاٹوں پر حفاظتی انتظامات بڑھا دئے گئے ہیں۔ باغیوں کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنے والوں کے لئے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ سبھی 8 زمینداری گھاٹوں (گنگا اور گنڈک ندیوں سے منسلک) پر پولس تعینات کر کے زمینداروں کو ہدایت دی گئی کہ باغیوں کو گرفتار کر کے اپنے علاقے میں محصور کر کے انگریزوں کو اطلاع دیں۔ اس درمیان پہلیجا گھاٹ' ریوا گھاٹ' لال گنج' حاجی پور اور مظفرپور شہر میں حفاظتی انتظامات میں غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا۔

25/جولائی 1857ء کو بیک وقت سوگولی اور داناپور چھاؤنی کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ سوگولی میں چار سپاہیوں نے میجر ہولس کے مظالم سے تنگ آکر اسے اور اس کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ داناپور کے سپاہیوں نے آرہ میں خزانہ لوٹ لیا' جیل سے قبل قیدیوں کو رہا کر دیا ان کے اس لڑائی میں کنور سنگھ کی قیادت سے نیا جوش اور جذبہ آ گیا۔ 29/جولائی 1857ء کو مظفرپور کے جج فاربس نے کمشنر ٹیلر کو مظفرپور میں درپیش خطروں سے آگاہ کیا جس کے پیش نظر 30/جولائی کو مجسٹریٹ ای۔ الیف۔ لیٹور نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس کے باوجود باغیوں کے خوف سے 31/جولائی کو کلکٹر اور دیگر بڑے حکام نے شہر چھوڑ دیے۔ باغی خزانہ لوٹ کر سیوان کی طرف بھاگ گئے۔ چنانچہ لیٹور شہر میں واپس آ گیا اور چونکہ باغی سیوان اور اعظم گڑھ اور نیپال تک جا چکے تھے تب سے پلانٹرز کو مشورہ دیا کہ شہر اور مختلف علاقوں میں پولس تعیناتی بڑھا دی گئی ہے لہٰذا وہ اپنے اپنے دیہاتوں میں کوٹھیوں پر واپس چلے جائیں۔ 14/اگست تک حالات قابو میں آ چکے تھے' پلانٹرز مسٹر ڈوسرا اوپری' کمتول پنڈول دیوریا' جتوا پور دیہہ کو مجسٹریٹ کا اختیار دیا گیا تاکہ نیپال کی سرحد سے باغیوں کو ترہت میں داخل ہونے سے روکا جا سکے۔ نیپال کے راجہ جنگ بہادر' بتیہ' ہتھوا' سورسنڈ' پنڈول کے زمینداروں اور مہتا خاندان نے تحریک کو کچلنے میں انگریزوں کی مدد

کی۔سور سنڈ کے زمیندار نے ہر باغی کو پکڑنے پہ 30روپئے کے انعام کا اعلان کر دیا۔
5ر ستمبر 1857ء کو ایچ۔ ایل ڈیمپیئر' جو کہ لیفٹور کا جانشیں مقرر کیا گیا' نے ہندوستانیوں پہ قتل و ڈکیتی کا مقدمہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے یہ چیخ کر کہا تھا کہ:
''برطانوی کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور کنور سنگھ کی حکومت قائم ہو گئی ہے''

جائیدادیں ضبط کی جانے لگیں' کچھ کو سزائے موت' کچھ کو سزائے عمر قید' دیہاتوں میں مواضع پر اجتماعی جرمانے عائد کیے گئے۔ ترہت میں انگریزوں نے انتقاماً کئی مکانات نذر آتش کر دیے۔ ان سب کارروائیوں سے تنگ آ کر لوگ پھر بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اعظم گڑھ۔ گورکھ پور۔ ریوا گھاٹ ہوتے ہوئے نیپال کی ترائی میں چھپے ہوئے باغی پھر سے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ گھاٹوں پہ چوکسی بڑھا دی گئی۔ مثلاً بکھرہ کے کائستھ زمیندار نے ریوا گھاٹ کے تحفظ کا انتظام کیا' موتی پور' دیوریا' سریا وغیرہ میں حفاظتی انتظامات بڑھا دیے گئے کیوں کہ نیپال سے چمپارن ہوتے ہوئے ان علاقوں میں باغی فوجیوں کے حملے کا خطرہ انگریزوں اور ان کے وفادار زمینداروں کو ہو رہا تھا۔ دسمبر 1857ء میں بنگال گھوڑ سوار (Yeomanry Cavalry) تین سو فوجیوں کو لے کر پوسا جے ڈن کی رہنمائی میں مقیم ہو گیا۔ پوسا کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ یہاں سے مظفر پور' دربھنگہ اور حاجی پور تینوں شہروں میں آسانی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ حاجی پور اور پوسا کے درمیان بھی گھاٹوں پہ پولس کی تعیناتی میں اضافہ کر دیا گیا۔ اسی طرح پوسا اور دربھنگہ اور پوسا اور مظفر پور کے درمیان بھی حفاظتی انتظامات چست کر دیے گئے۔ (اسی Stationing کی وجہ سے پوسا میں Horse Breeding کا مرکز وجود میں آ گیا۔ بہت بعد میں یہاں زراعتی سائنس کی تعلیم کے لئے ایک کالج بھی قائم کیا گیا جو 1934ء کے زلزلے میں تباہ ہونے کی وجہ سے دہلی منتقل کر دیا گیا اور دہلی میں وہ علاقہ پوسا روڈ کے نام سے مشہور ہو گیا۔) پوسا میں حفاظتی اقدامات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں 18 نومبر 1857ء کو ایک بغاوت بھڑک گئی تھی۔ خفیہ خبریں حاصل کرنے کے لئے ٹیلی گراف کی نئی لائنیں تشکیل دینے کے منصوبے بننے لگے تاکہ پورنیہ اور مظفر پور کے درمیان (بھاگل پور' کشن گنج اور سوپول ہوتے ہوئے) ٹیلی گرافی رابطہ قائم ہو سکے۔ اپریل 1858ء تک باغیوں کا پیچھا جاری رہا اور گنڈک پار کر کے نیپال سے باغیوں کے ترہت میں داخل ہونے کا خطرہ محسوس کیا جاتا رہا۔

جون سے اگست 1858ء کے درمیان ایچ۔ ایل۔ ڈیمپئر اور پٹنہ کمشنر کے درمیان ہونے والے مراسلات سے انکشاف ہوتا ہے کہ سریا اور دیوریا کے پلانٹرز، بکھرہ اور گرد و نواح کے زمیندار وغیرہ نے اس تحریک کو کچلنے میں انگریزوں کی بے پناہ مدد کی۔ ایسے سبھی وفاداروں کو رعایات و انعامات سے نوازا گیا۔ ایسے ہی وفاداروں میں دیوان مولا بخش کا بھی شمار کیا گیا۔ ولیم ٹیلر نے بھی دیوان مولا بخش کی خوب خوب تعریفیں لکھی کیوں کہ اس نے باغیوں کو پکڑوانے اور سزا دلوانے میں پوری مدد کی۔

مختصراً کہا جاتا ہے کہ: ترہت میں تحریک 1857ء سے متعلق اس تفصیلی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ زرائتی بدامنی اقتصادی بدحالی اور کسی حد تک مذہبی جذبات کا مجروح ہونا (یہ احساس اقتدار و تقصیات سے محرومی پہ اور شدید ہو جاتا ہے) 1858ء کے انقلاب کی بڑی وجوہات تھیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تحریک خواص اور سپاہیوں نے شروع کی ایک بڑی سچائی یہ ہے کہ عام کسانوں کی شرکت اس میں بہت زیادہ تھی۔ پی کے شکلا (13) کی تحقیق کے مطابق جنوری 1830 سے ہی یوروپی پلانٹرز کے خلاف رعیتوں نے بغاوت اور مقدمہ شروع کر دیا تھا۔ 1856ء میں ترہت کے پلانٹرز کے رعیتوں نے تقریباً 38 مقدمے درج کرائے تھے۔ (اس سے قبل 1839ء میں سریا فیکٹری کے پلانٹرز میک لیڈ کے خلاف فوجداری مقدمہ درج کرایا گیا تھا) لہٰذا ولیم ڈلرمپل (14) جیسے برطانوی سامراجیت کے حامی مورخوں کا یہ کہنا کہ مذہبی جنون ہی تحریک 1857ء کی اہم ترین وجہ تھی، ہرگز قابل قبول بلکہ قابل توجہ نہیں ہے۔

اس جائزے سے یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے کہ خواہ وہ انگریزوں سے وفاداری کرنے والے لوگ ہوں یا تحریک میں شامل ہونے والے انقلابی، دونوں ہی صفوں میں ہندو و مسلمان سبھی شامل تھے۔ کیمبرج کے مورخ سی۔ اے۔ بیلی (15) نے یہ کہا ہے کہ مشرقی بھارت کی سیاست 18 ویں و 19 ویں صدی میں ہندو و مسلم خطوط پہ منقسم تھی۔ بھومیہار اور راجپوت زمیندار مثلاً بنارس، ہتھوا، بیتیا وغیرہ نے مسلم نواب اودھ کے خلاف بغاوت کیا جب کہ یہ زمیندار اسی نواب کے Revenue Contractor تھے۔ لیکن اس رائے کے برعکس تحریک 1857ء نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مظفر پور (اور دیگر علاقوں میں بھی) میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پہ تھا۔

نیز یہ کہ ترہت میں زبردست عوامی شرکت کے باوجود اس تحریک کے رہنماؤں میں اتنی

طاقت وصلاحیت نہیں تھی کہ وہاں عارضی طور پر ہی سہی نئی دیسی حکومت قائم کر پائیں جائیکہ 31ر جولائی 1857ء کو مظفر پور کے سبھی اعلیٰ حکام فرار ہو چکے تھے۔ اور ان کے پاس اس قسم کے مواقع تھے کہ وہ آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں۔

اپریل 1859ء تک باغیوں کے حملے کا خدشہ برقرار رہا لہذا سڑکوں اور گھاٹوں پہ حفاظتی انتظامات میں شدید اضافہ جاری رہا، مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کو پولس اور فوج میں بھرتی کرنے کے بجائے دوسادھوں، چماروں، موسہروں کی تقرری کا فیصلہ لیا گیا۔ شاید انہیں خدشوں کے پیش نظر مختلف اہم علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر ومرمت روک دی گئی۔ مثلاً لال گنج ویشالی سے کیسریا دسوگولی کی سڑک، ریوا گھاٹ پر پُل کی تعمیر کا منصوبہ جو کہ مظفر پور اور چھپرا کے بیچ کی دوری کافی کم کر دیتا ہے اور ان راستوں پہ ریل لائن بچھانے کی منصوبے، سبھی پہ پابندی لگا دی گئی۔

حواشی و مآخذ

(1)Jai Narin Thakur, Demographic featurs of Tirhut",in Journal of Bihar Researchsocieity (JBRS) vol 55 1969 pp-133-143.

(2)Radha krishna chaudhry, "A History of Muslim Rule in Tirhut, 1206-1765,"Chowkhamba sanskrit publication, varansi,1970

(3) ایضاً

(4) قرۃ العین حیدر کار جہاں دراز ہے" جلد اول دوئم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 200 صفحہ 180 'ان کا افسانہ" دریں گرد سوارے باشد" مشمولہ" روشنی کی رفتار"، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1992 بھی دیکھیں۔

(5)S.N.Singh, History of Tirhut (from Earliest Times to nineteenth ceutury),calcutta,1922

(6)K k Dalta, Anti British Plots and movements Before 1857 Meenakshi prakashan, Meerut, 1970, pp-21-23.

(7) S.Narain, The Role of Tirhoot in The Movemeut of 1857-59," in JBRS,March 1954,pp-55-73

(8)Vijay Kumar Thakur, Movement of 1857-58 in tirhut and The Rebels" in JBRS, vo. 61,1975,pp-105-22

وارث علی کے علاوہ وزیر علی، غازی خاں، خیراتی خاں، میر ہدایت علی، کلو خاں اور قربان علی جیسے" باغی سپاہیوں کو عمر قید کی سزا دے کر ان جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔

(9)William tayler, Our Crisis or Three Months at Patna During the

Insurrection of 1857, London 1858, 1882, patna 2007 (Reprint).
(10) Jamal Malik," letters, Prison Sketches and Auto -biographical literature: Fadl-e- Haqq Khairabadi in the Andaman Penal colony" in Indian Economic and Social History Review (IESHR), vol. 63, No 1,
(11) اشرف قادری۔ تحریک آزادی ہند میں مسلم مجاہدین چمپارن کا مقام، بیتیا، 1992
(12)N P Singh, Growth of Sugar Cultivation in Bihar, 1793-1913, in proceedings of Indian History Congress, (PIHC), 1984
(13) P.K. Shukla " Indigo peasant protast, in North, Bihar, 1867-1916," in K.K. Sharma, P.P Singh. Ranjan kumar (eds) peasant strggles in Bihar, 1831-1992: Spontaneity to Organization, Janki Prakashan, Patna, 1994, p p.48-64
(14) William Dalrymple, The Last Mughal, The Fall of a Dynasty, Delhi, 1857, penguin, Delhi, 2006
(15) C A. Bayly, Rulers, Townsmen and Bazars North Indian sociaty in the Age of British Expansion, 1770-1870 Cambrige 1983, pp-.7-18.

دیگر حوالے

اقبال حسین، داستان میری (خودنوشت سوانح عمری)، خدا بخش لائبریری پٹنہ، 1989
تقی رحیم تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، 1998
K K.Datta, Biography of kunwar Singh and Awar Singh patna, 1957 p.115.
K.K.Datta Freedom Movement in Bihar, vol patna, 1957, pp-15-25.
Qeyamuddin Ahmad, Wahabi Movement in India, DUP, Delhi, 1994 (Reprnt).
W.W Hunter, A Statistical Account of Bengal, vol.13/Trubner co, London, 1870.
Lsso,"Mally, Bengal District Gaze tteers, Muzaffar pur, calcatta 1908/ Shabd prakashan Delhi 1987.PPH.Delhi 1978.
Razi Ahmad, Indian peasant Movement and Mahatma Gandhi,
Girish Mishra, Agrarian Problems of Permanent sett lement in Champaran.
P.C.Raychaudhary Inside Bihar, Patana 1962.

انقلاب ۱۸۵۷ء میں علما کا قائدانہ کردار

برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں نے 1857ء میں جو پرچم انقلاب بلند کیا اس کے بڑے دوررس اثرات ونتائج برآمد ہوئے۔ وقتی طور پر برطانوی سامراج نے انقلابیوں کے عزائم ناکام بنادیے لیکن ان کے سینے میں دبی ہوئی چنگاری سلگتی رہی اور یہی چنگاری بیسویں صدی عیسوی کی تیسری چوتھی دہائی میں شعلۂ جوالہ بن گئی جس کی تپش سے برطانوی سامراج کا نشیمن جل اٹھا اور 1947ء میں اسے بصد حسرت ویاس ہندوستان سے رخت سفر باندھنا پڑا۔

چنانچہ ڈاکٹر آر۔سی۔ مجمدار اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''1857ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور براہ راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی کی تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ 58-1857ء کی یاد نے ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دی۔ اس کے مجاہدین کے دلوں میں ہمت کی روح پھونکی۔ خوفناک جدوجہد کے لئے ایک تاریخی بنیاد فراہم کی۔ اور اسے ایک ایسا اخلاقی محرک عطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ 1857ء کی بغاوت کی یاد نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو جتنا نقصان پہنچایا اتنا خود بغاوت سے بھی نہ پہنچا ہوگا۔'' (ص 140۔ انقلاب 1857، مؤلفہ پی سی جوشی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ طبع سوم 1998ء)

انگریزوں کے مظالم اور ان کی چیرہ دستیوں سے مسلمان اور ہندو سب کے سب نالاں تھے۔

اس صنعتی وزراعتی ملک کی رگوں سے خون چوس کر جس طرح انگریز اپنے انگلستان کو مالا مال کر رہے تھے اور خصوصیت کے ساتھ بنگال کو انھوں نے کنگال بنا ڈالا تھا جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل انگریز دشمنی کی آماج گاہ بن گئے تھے۔ ہندوستانی نوابوں، راجاؤں، زمینداروں، تاجروں اور شرفا کو ذیل کرنا انگریزوں کا معمول بن گیا تھا۔ اور جب انھوں نے ان کے مذہب پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اسی کے نتیجے میں انقلاب 1857ء رونما ہوا جس میں مسلمانوں کے کے مذہبی پیشوا و قائدین پیش پیش تھے۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں روہیلہ، خان بہادر خاں روہیلہ (فرزند ذوالفقار خاں فرزند حافظ رحمت خاں روہیلہ) شہزادہ فیروز شاہ، بیگم حضرت محل، جنرل عظیم اللہ خاں، جنرل غوث محمد خاں، نواب تفضل حسین خاں، نواب مجدالدین عرف مجو خاں مرادآبادی، نواب محمود خاں بجنوری جیسے مسلم قائدین اس انقلاب کو کامیاب بنانے میں شب و روز اپنی عملی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف چوں کہ مسلمانوں کے اندر جوش و خروش زیادہ تھا اور انھوں نے اپنی جان و مال کا نذرانہ بڑھ چڑھ کر پیش کیا اسی لئے وہ انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزی مظالم کے زیادہ شکار ہوئے۔

میجر ایف۔ جے۔ ہیریٹ ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل برائے سماعت مقدمہ بہادر شاہ ظفر کا بیان ہے کہ

> ''ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں میں سازش کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا ہو . . . مسلمان ملا نظر باطنی کے اور فرضی قوت معجزہ کے جھوٹے دعویدار، مسلمان بادشاہ ان کے فریب میں پھنسے ہوئے لوگ اور شریک جرم ترکی اور ایران کی مسلمان حکومتوں میں مسلمان خفیہ سفارش خانے مسلمانوں کی طرف سے ہمارے اقتدار کے زوال کی پیش گوئیاں ہماری حکومت کی وارث مسلم سرکار مسلمان قاتلوں کے ہاتھوں سفاکانہ قتل اسلامی غلبہ کے لئے جہاد اور بغاوت کے بانی مسلمان سپاہی۔ غرض کہ ہندوؤں کا کہیں بھی عمل دخل ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کہیں شاذ و نادر ہوتا بھی ہے تو اپنے جنگ جو ہمسایہ کی زیر ہدایت محض ثانوی حیثیت سے۔

(ص 35۔ انقلاب 1857ء۔ پی سی جوشی)

انقلاب 1857ء میں علمانے مذہبی فریضہ کے طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتاوئی جاری کیے اور عملی طور پر بھی جنگ میں شریک ہوکر مجاہدین کے حوصلے بڑھائے اور انقلابیوں کی بھر پور قیادت کی جن میں علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فیض احمد بدایونی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مولانا مدراسی اپنے پیرو مرشد حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے حکم پر تقریباً 1847ء سے انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔

دیگر مشہور علمائے انقلاب 1857ء میں چند سر برآوردہ حضرات کے نام یہ ہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی مفتی مظہر کریم دریابادی۔

تاریخ انقلاب پر لکھی گئی کتابوں کے عام اندازہ کے مطابق لگ بھگ پندرہ ہزار علما اور کئی لاکھ مسلمان جنگ آزادی 1857ء میں شہید کیے گئے تھے۔

مذکورہ علما کو جن علماو مشائخ سلف سے کسی نہ کسی شکل میں فکری و عملی رہنمائی ملی ان میں سے چند اہم نام درج ذیل ہیں:

(1) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی 1176ھ/ 1762ء) (2) حضرت مرزا مظہر جان جاناں مجددی دہلوی (متوفی 1195ھ/ 1781ء) (3) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی 1239ھ/ 1824ء) (4) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی 1225ھ/ 1810ء) (5) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی 1233ھ/ 1818ء) (6) حضرت مفتی محمد عوض بریلوی (متوفی 1236ھ/ 1821ء) (7) حضرت مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی 1268ھ/ 1852ء)

(1) مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی: مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متولد 1204ھ/ 1789ء۔ متوفی 1285ھ/ 1868ء) کشمیری نسل کے دہلوی عالم و فاضل تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (1239ھ/ 1824ء) اور علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی (متوفی 1244ھ/ 1839ء) سے آپ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ 1827ء سے 1846ء تک آپ دہلی کے

صدر امین اور 1846ء سے 1857ء تک صدر الصدور تھے۔ انگریزی عہد حکومت میں دہلی کا صدر الصدور ہونا کسی مسلمان عالم کے لئے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ آپ کا دولت کدہ دہلی کے علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز اور مرجع تھا۔ سر سید احمد خاں (متوفی ذوالقعدہ 1315ھ/ مارچ 1898ء) نے اپنی مشہور تاریخی کتاب ''آثار الصنادید'' (ص 524 مطبوعہ دہلی میں آپ کو اپنے زمانے کا جامع الصفات عالم و فاضل لکھا ہے۔ حکیم عبدالحی رائے بریلوی (متوفی 1341ھ/ 1923ء) سابق ناظم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ لکھتے ہیں کہ ''مفتی صدرالدین خان بہادر، عالی خاندان، والا دودمان، سرمایہ نازش ہندوستان، فضل و کمال اور فنون ادبیہ میں آپ اپنا جواب تھے۔'' (227۔ گل رعنا مطبوعہ اعظم گڑھ)

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر 1983ء کراچی) لکھتے ہیں:

> ''دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ کی امتیازی حیثیت تھی۔ جنگ آزادی 1857ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیا۔ اس کی وجہ سے گرفتاری عزل منصب اور ضبطی جہاد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہا ہوئے۔ نصف جائداد واگذاشت ہوئی۔ (ص 248۔ تذکرۂ علمائے ہند، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی طبع اول۔ 1961ء)

1857ء میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا کئی بار اور کئی جگہ فتویٰ دیا تھا۔ ایک فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ کا دستخط ہے جو اخبار الظفر دہلی میں چھپا پھر اس کی نقل صادق الاخبار دہلی مورخہ 26/ جولائی 1857ء میں شائع ہوئی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ انقلاب کے دوران مفتی آزردہ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے پاس آتے جاتے رہے اور نقلابی مجاہدین بھی آپ سے ہدایت حاصل کرنے آپ کے گھر آتے جاتے رہے (روزنامچہ منشی جیون لال مطبوعہ دہلی و روزنامچہ عبداللطیف مطبوعہ دہلی)

شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے جنوب میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے دارالبقا کے نام سے ایک مدرسہ بنوایا تھا جو گردشِ زمانہ سے ویران ہو گیا تھا اسے مفتی صدرالدین آزردہ نے بہادر شاہ ظفر سے لے کر آباد کیا اور تعلیم کا سلسلہ از سرِ نو شروع کیا۔ (ص 283۔ آثار الصنادید مؤلفہ سرسید، مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی 2000ء)

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی 1377ھ/ 1958ء) کے والد مولانا خیرالدین دہلوی (متوفی 1329ھ 1908ء) اور دادا شیخ محمد ہادی دہلوی مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اسی طرح مفتی سعد اللہ مرادآبادی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور، نواب ضیاء الدین خاں نیر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی فقیر محمد جہلمی اور بعد کے ہونے والے اکابر علمائے دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اردو زبان کے آپ بہترین شاعر تھے۔

انقلاب 1857ء میں انگریز جب غالب آگئے تو آپ کے خلاف مقدمۂ بغاوت چلا۔ بڑی کوشش پیروی اور قید و بند کے بعد کسی طرح آپ کو نجات ملی۔ مگر جائداد کا بڑا حصہ ضبط ہو گیا۔ اپنے ذاتی سرمایہ سے آپ نے تین لاکھ روپے کی نہایت اہم اور نادر کتابیں اپنی ذاتی لائبریری میں جمع کی تھیں جو انقلاب کے دوران ضائع ہو گئیں۔

جامع مسجد دہلی کو انگریزوں نے انقلاب کی ناکامی کے بعد قبضہ کر کے اسے اصطبل بنا دیا تھا۔ مفتی آزردہ نے عمایدِ شہر کے ساتھ مل کر اس کی واگذاری کی مسلسل کوشش کی جس کے نتیجے میں نومبر 1836ء میں ایک معاہدہ کے تحت انگریزوں نے اسے واگذار کیا۔ (ص 48۔ غدر کے چند علما مؤلفہ انتظام اللہ شہابی مطبوعہ دہلی)۔ مکاتیب غالب میں بھی مسجد کی واگذاری کا ذکر ہے۔

مفتی آزردہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تقریباً 1846ء میں انھوں نے اپنے خط کے ساتھ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی 1274ھ/ 1858ء) کو آگرہ بھیجا جہاں انھوں نے ''مجلس علما'' قائم کر کے انگریزوں سے ہندوستان کو پاک کرنے کی مسلسل تحریک چلائی اور انقلاب 1857ء میں ان علما نے مختلف محاذ پر انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا۔ اکیاسی سال کی عمر میں 24/ ربیع الاول 1285ھ/ 16/ جولائی 1868ء میں دہلی کے اندر مفتی آزردہ کا انتقال ہوا اور چراغ دہلی میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

(2) علامہ فضل حق خیرآبادی : علامہ فضل حق خیرآبادی (متولد 1212ھ/ 1797ء۔ متوفی 1278ھ/ 1861ء) فرزند علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی صدر الصدور دلی (متوفی 1244ھ/ 1829ء) علوم اسلامیہ میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (متوفی 1230ھ/ 1815ء) و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی 1239ھ/ 1824ء) اور علوم عقلیہ میں اپنے نامور والد ماجد کے

شاگرد تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں تکمیل علوم وفنون کے بعد درس وتدریس میں مصروف ہوئے اور 1815ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی 1347ھ/ 1928ء) نہایت اختصار کے ساتھ آپ کا تعارف اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"ولادت 1212ھ/ 1797ء فراغت درس (بعمر 13 سال) 1225ھ/ 1810ء ملازمت کمپنی 1231/ 1816 سے کچھ قبل۔ ولادت فرزند گرامی (مولانا عبدالحق) 1244ھ/ 1828ء۔ ولادت فرزند (علاء الحق) 1246ھ/ 1230ء۔ وفات والد ماجد (مولانا فضلِ امام خیرآبادی) 1244ھ/ 1829ء۔ کمپنی کی ملازمت (سررشتہ داری عدالت دیوانی دہلی) سے استعفاء 1245ھ/ 1831ء کے اواخر میں۔ ملازمت ریاست جھجر میں 1246ھ/1832ء۔ پھر چند سال الور، سہارن پور اور ٹونک میں قیام کے بعد 1256ھ/ 1840ء سے 1264ھ/ 1848ء تک ریاست رام پور میں قیام (محکمۂ نظامت اور مرافعہ عدالتین کے حاکم کی حیثیت سے) 1264ھ/ 1848ء سے 1272ھ/ 1856ء کے اوائل تک لکھنؤ میں قیام (کچہری حضور تحصیل کے مہتمم اور صدر الصدور کی حیثیت سے) 1272ھ/ 1856ء کے ابتدائی مہینوں میں الور تشریف لے آئے اور رمضان 1273ھ/ مئی 1857ء میں سن ستاون کی جنگِ آزادی کے آغاز پر دہلی تشریف لے آئے اور پورے ڈیڑھ سال (مئی 1857ء سے دسمبر 1858ء) تک دہلی اور اودھ کے مختلف اضلاع میں مجاہدین حریت کی رفاقت، اعانت اور قیادت فرماتے رہے۔ جنوری 1859ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر تمام زرعی اور مسکونہ جائداد اور ذخیرۂ نوادر کتب خانے کی ضبطی اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا سنادی گئی۔ اکتوبر 1859ء میں پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) پہنچا دیے گئے جہاں 12 صفر 1278ھ/ اگست 1961ء کو 66 سال کی عمر میں وصال ہوا۔ (ص 20 و 21۔ فضل حق اور 1857ء مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی، مطبوعہ برکات اکیڈمی کراچی 1957ء)

نواب فیض محمد خاں والیِ ریاستِ جھجر (پنجاب) کی دعوت پر جب آپ 1831ء میں دہلی چھوڑ کر جھجر جانے لگے تو بہادر شاہ ظفر نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک دوشالہ آپ کو اڑھا کر پرنم آنکھوں سے وداع کرتے ہوئے کہا۔ چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں اس لئے اب اس کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اسے منظور کروں مگر اللہ جانتا ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (یادگار غالب مطبوعہ دہلی)

جھجر کے بعد ریاست الور و ٹونک و رام پور میں ملازمت کے بعد آخر میں آپ لکھنؤ گئے اور وہاں صدر الصدور اور مہتمم ''حضور تحصیل'' ہوئے۔ دہلی میں بھی عرصہ تک آپ سررشتہ دار رہے۔ دو سال تک سہارن پور میں بھی کسی عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں اور آپ کے کئی ایک شاگرد اپنے دور کے مشاہیر علما و فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی و علامہ فضل حق خیر آبادی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے درمیان گہری دوستی تھی۔ علامہ ہی کے مشورے اور آپ کے انتخاب پر دیوانِ غالب عالم وجود میں آیا جو بقول محمد حسین آزاد ''یہی وہ دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (آب حیات مطبوعہ دہلی) علامہ فضل حق اور مفتی صدر الدین آزردہ کا گھر دہلی کے علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز تھا۔

انقلاب 1857ء شروع ہوا تو آپ ریاست الور سے دہلی کئی بار آئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سلسلہ مئی سے جاری رہا۔ پھر 26/ جون یا پہلی جولائی کو جنرل بخت خاں روہیلہ جب بریلی سے چودہ ہزار فوج لے کر دہلی پہنچا تو منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بیان کے مطابق:

علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ مطبوعہ دہلی)

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد کسی طرح یہاں سے نکل کر آپ اودھ پہنچے۔ 1859ء میں آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ آپ نے اپنا مقدمہ خود لڑا اور عدالت میں کہا

کہ جہاد کا فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے اس فتویٰ پر قائم ہوں۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر 1983ء کراچی) لکھتے ہیں:

"جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا جس و روپائے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہیں 12 رصفر 1278ھ/ 1867ء میں انتقال ہوا۔ جزیرۂ انڈمان میں دفن ہوئے۔ (ص 383۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی)

علامہ فضل حق کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متولد 1244ھ/ 1828ء۔ متوفی 1316ھ/ 1898ء) پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بارے میں ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتا ہے کہ:

یہ 1857ء کے غدار عالم کے بیٹے ہیں جنھیں حکومت نے کالا پانی کی سزا دی اور اس کا کتب خانہ ضبط کرلیا جو کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (203۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، مطبوعہ نئی دہلی 25)

علامہ کے سوانح نگار اور الثورۃ الهندیہ (باغی ہندوستان) کے مترجم مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی (متوفی 1404ھ/ 1984ء) لکھتے ہیں کہ:

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے وصیت کی تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر آکر اس کی اطلاع دے دی جائے چنانچہ سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا کے مدفن درگاہ مخدومیہ خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ میں ایک جم غفیر کے ساتھ 15، اگست 1947ء کو حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ (ص 12۔ مقدمہ زبدۃ الحکمۃ۔ مطبوعہ علی گڑھ 1949ء)

علامہ فضل حق کا جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں 1278ھ/ 1861ء میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(3) مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی: دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متولد 1204ھ/ 1787ء۔ شہید 1274ھ/ 1858ء) چینا پٹن تعلقہ پورنا ملی جنوبی ہند کے نواب محمد علی مشیر و مصاحب سلطان ٹیپو کے فرزند تھے۔ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے ساتھ جب مولانا مدراسی کہیں نکلتے تو ایک دستہ نقارہ اور ڈنکا پیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا تھا اسی لئے آپ کو ڈنکا شاہ اور نقارہ شاہ بھی کہا جاتا تھا۔

عہد شباب ہی میں آپ پر فقر و تصوف کا غلبہ ہوا اور ریاضت و مجاہدہ کے لئے گھر بار چھوڑ کر حیدر آباد دکن اور مدراس وغیرہ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں سے مصر گئے اور پھر حجاز پہنچ کر حج و زیارت کے بعد ترکی وایران و افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

بیکانیر و سانبھر میں بارہ سال تک ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشی کی۔ پھر جے پور آکر میر قربان علی شاہ چشتی کے مرید ہوئے اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ یہاں سے ٹونک گئے وہاں آپ کی مجالس سماع سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا جس سے دل برداشتہ ہو کر گوالیار کا سفر کیا وہاں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں پہنچے اور اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت و خلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہر حال میں آزاد کرانا ہے۔ اسی ارادہ سے آپ تقریباً 1846ء میں گوالیار سے دہلی پہنچے۔ دہلی کے مشاہیر علما و مشائخ سے آپ نے ملاقات و گفتگو کی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے مشورہ دیا کہ اس مہم کے لئے ماحول سازی آگرہ کے اندر بہتر اور موثر طریقے سے ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی مفتی آزردہ نے مفتی انعام اللہ سرکاری وکیل آگرہ (ساکن گوپامئو ضلع ہردوئی۔ متوفی 1275ھ/1859ء آگرہ) کے نام ایک سفارشی خط بھی لکھا۔ آگرہ پہنچ کر آپ نے دینی وعلمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ قائم کیا۔ آپ کا اثر روز بروز بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ مجلس علما آگرہ قائم کر کے آگرہ کے علما کو آپ نے مربوط و منظم کیا۔ یہ علما آپ کے دست و بازو بن گئے۔ مولانا مدراسی نے دہلی و آگرہ کے بعد میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ کے بھی دورے کیے اور انگریزوں کے خلاف مہم کا دائرہ کافی وسیع کر لیا۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

تحریک ۱۸۵۷ء کے لئے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمد اللہ کا نام سر فہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے بغاوت کے لئے عوام کو آمادہ کر رہے تھے۔ میلسن (Malleson) لکھتا ہے کہ: بے شک اس تمام سازش کا رہنما مولوی (احمد اللہ) تھا اور یہ سازش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی شخص بغاوت کی سازش کا دماغ و دست و بازو تھا۔ اپنے سفر کے دوران اسی نے وہ اسکیم تیار کی جو چپاتی اسکیم کہلاتی ہے۔ (ص 205۔ تاریخ جنگ آزادی ہند 1857ء۔ مطبوعہ رضا لائبریری رام پور)

لکھنؤ، فیض آباد، شاہجہاں پور میں مولانا مدراسی نے انگریزوں سے گھمسان کی جنگ لڑی۔ آخر میں محمدی (شاہجہاں پور) میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں،

مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی وغیرہ نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ مگر راجہ بلدیو سنگھ کی غداری کی وجہ سے مولانا مدراسی اپنی مہم میں ناکام ہو کر 1274ھ/1858ء میں شہید ہو گئے اور بلدیو سنگھ کو انگریزوں نے پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں کہ:

شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی ہی جنگ آزادی نہیں بلکہ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی 1857ء ختم ہو گئی۔ (ص 303۔ جنگ آزادی 1857ء۔ مطبوعہ کراچی)

انگریز مورخ جی ڈبلیو فارسٹر لکھتا ہے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا۔ اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ (ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی)

(4) مولانا فیض احمد بدایونی

مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (متولد 1223ھ/1808ء۔ متوفی نامعلوم) فرزند مولانا حکیم غلام احمد عثمانی بدایونی (متوفی 1226ھ/1811ء) کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (متوفی 1289ھ/1872ء) کی سرپرستی و نگرانی میں ہوئی۔ چودہ سال کی عمر میں تکمیل علوم و فنون سے فارغ ہوئے۔ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل اور بہترین شاعر تھے۔ اپنے نانا شاہ عین الحق عبدالمجید عثمانی بدایونی (متوفی 1233ھ/1820ء) سے بیعت تھے۔

مولانا محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی (متولد 1310ھ/1883ء بدایوں۔ متوفی 1390ھ/1970ء در کراچی) مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"فاضل دہر استاذ العصر علامۂ اوحد مولانا فیض احمد قدس اللہ سرہ الصمد۔ آپ علمی دنیا میں علما کے سرتاج اور مجلس عرفا میں معرفت کے روشن چراغ تسلیم کیے گئے ہیں۔ 1223ھ میں عالم وجود میں بزم آرا ہوئے۔ کم سنی میں فخر الاطباء (حکیم غلام احمد متوفی 1226ھ) کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے جو دلیۂ عصر اور عفیفۂ دہر اور حضرت سیدی مولانا شاہ عین الحق عبدالمجید قدس سرہ الوحید کی دختر بلند اختر تھیں۔ اپنے بھائی حضرت سیف اللہ المسلول مولانا شاہ معین الحق فضل رسول قدس سرہ

کے سپرد آپ کو کردیا۔ ماموں کی آغوشِ محبت میں بڑے نازونعم سے پرورش پائی۔"

بخزانہ قدرت سے آپ کو وہ ذہن ودماغ عطا ہوا تھا جس کی مثال آج کل ناپید ہے۔ ذرا سی عمر میں تمام علوم معقول ومنقول نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ حاصل فرمائے۔ آپ کی ذہانت وذکاوت خداداد پر ہم سبق طلبہ رشک کرتے تھے۔ پندرہویں سالگرہ نہ ہونے پائی تھی کہ اجازت درس حاصل ہوگئی۔ تقریر وتحریر میں وہ زور تھا کہ مخاطب شانِ استدلال اور ہیبتِ کلام سے ساکت ہوجاتا۔ جب تکمیل سے فراغ کامل ہوا دولت بیعت اپنے مقدس نانا حضرت سیدی شاہ معین الحق قدس سرہ المجید سے پائی۔ اس کے بعد سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوکر اس عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے کہ تمام سیاہ وسپید آپ کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت آگرہ صوبہ کا صدر تھا۔ آپ لفٹنٹ کے سررشتہ دار تھے۔ ثروت وامارت خاندانی کے سوا عہدہ کی وجاہت، اس پر طرہ یہ کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ آگرہ وودھ آپ کے شاگرد خاص اور احترام کنندہ۔ ہزاروں اہل حاجت کی دست گیری فرمائی۔ وطن کے اہل غرض مطلب برآری کے لئے روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ہر وقت مطبخ گرم رہتا۔ فقرا ومساکین ہمیشہ دامنِ دولت سے وابستہ رہتے۔ کبھی پیسہ آپ کے ہاتھ میں نہ رہتا اور مقروض رہتے۔ اہل بدایوں پر جو کچھ احسانات آپ کے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں ہوسکتے۔

سلسلۂ درس وتدریس اقامتِ آگرہ میں بھی برابر جاری رہا۔ شاعری کا مذاق سلیم خاص طور پر جزو طبیعت تھا۔ کلام میں حسنِ فصاحت اور رنگِ بلاغت دونوں موجود ہیں۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی صفائی سونے پر سہاگہ ہے۔ رسوا تخلص فرماتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو ہر سہ زبانوں میں آپ کے اشعار انمول جواہر ہیں۔ (ص 59 تا 61۔ اکمل التاریخ (1333ھ) حصہ اول۔ مؤلفہ مولانا محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی۔ مطبع قادری مولوی محلہ، بدایوں۔ بار اول)

بدایوں میں ایک مدت تک درس وتدریس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو کے سررشتہ دار ہوئے۔ سر ولیم میور نے آپ سے عربی زبان سیکھی تھی جو بعد میں ملٹری مجسٹریٹ اور لفٹنٹ گورنر صوبہ اودھ وآگرہ ہوئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی 1274ھ/ 1858ء) کی مجلس علما آگرہ کے آپ سرگرم رکن تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی 1308ھ/ 1891ء) اور پادری فنڈر کے درمیان اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر

1854ء میں ہونے والے مناظرۂ آگرہ میں آپ معاون مناظر تھے۔ یہ مناظرہ تین روز تک جاری رہا اور پادری فنڈر شکست کھا کر یورپ واپس چلا گیا۔

جامع مسجد آگرہ جس کے اکثر حصے پر لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا اسے خالی کرانے کے لئے مولانا فیض احمد نے طویل جدوجہد کی۔ مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ بالآخر آپ کو کامیابی ملی۔ مسجد کو قابضوں سے خالی کرا کے اس کی مرمت کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا جس نے ساری ذمہ داری سنبھال لی۔

مولانا فیض احمد بدایونی کئی کتب ورسائل کے مصنف ومؤلف بھی تھے مگر ان میں سے بیشتر کے مسودات انقلاب 1857ء کی افراتفری میں ضائع ہو گئے۔ تعلیم اجاہل مطبوعہ 1269ھ۔ القلمۃ البغدادیہ (منثور) وحدیۂ قادریہ (منظوم) مطبوعہ 1303ھ آپ کی تحریری یادگاریں ہیں۔

انقلاب 1957ء میں آپ نے بڑی سرگرمی اور جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ چنانچہ پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی 1983ء۔ کراچی) لکھتے ہیں کہ:

> "جب میرٹھ اور آگرہ کی بغاوت اور مجاہدین کے معرکوں کی خبر آگرہ پہنچی تو جانسن کالن لفٹنٹ گورنر بہادر نے سب فوج ہندوستانی کو جمع کر کے فہمائش کی۔ اس کا اثر چند روز رہا۔ مگر پھر آگرہ کی بھی فوج باغی ہو گئی اور مجاہدین سے مل گئی اور آزادیٔ وطن میں کوشاں ہوئی۔

انگریزوں نے قلعہ کو جائے پناہ قرار دیا۔ ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی، مجاہد فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ مگر جب حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا اور دہلی سے طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہو گئے۔ (ص 21۔ جنگ آزادی 1857ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد بدایونی۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ 1957ء)

انقلاب 1857ء میں آپ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے اور جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ انقلاب کی ناکامی کے بعد دہلی سے واپس چلے گئے۔ اپریل 1858ء میں مولانا نے ککرالہ (بدایوں) کے معرکے میں جنرل بخت خاں کے ساتھ داد شجاعت دی جہاں

انگریز جنرل پینی میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہاں کی پسپائی کے بعد آپ بریلی چلے گئے جہاں خان بہادر خاں ولد ذوالفقار خاں ولد حافظ رحمت خاں روہیلہ انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔

لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی آپ رہے اور انگریزوں سے جنگ کی۔ یہاں سے مولانا مدراسی کے ساتھ شاہجہاں پور گئے اور جب مولانا مدراسی نے محمدی (شاہ جہاں پور) میں اپنی حکومت قایم کی تو اس کی وزارت میں شامل ہوئے۔ شاہجہاں پور پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد آپ نیپال کی طرف نکل گئے اور پھر بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں کہ آپ پر کیا گذری اور کہاں کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی 1983ء۔ کراچی) لکھتے ہیں کہ:

جنگ آزادی 1857ء میں علمائے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ان میں سرفہرست مولانا فیض احمد بدایونی کا نام ہے جو اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو میں ملازم تھے۔ عربی کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ انھوں نے آگرہ میں قیام کے دوران مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے مناظرہ میں حصہ لیا اور مولوی رحمت اللہ کے مددگار رہے۔ پھر جنگ آزادی 1857ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ وہ دہلی بھی گئے۔ آخری معرکہ ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر خاں، شہزادہ فیروز شاہ جیسے بطلِ حریت بھی موجود تھے۔ انگریزوں کا مشہور جنرل پینی مارا گیا۔ (ص26۔ انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں، جلد2۔ مطبوعہ کراچی)

(5) مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی : مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی (شہید 1274ھ/ 1858ء) عالم وفاضل اور بہترین طبیب وشاعر تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی رام پوری (متوفی 1250ھ/ 1835ء) سے مولانا کافیؔ نے درس حدیث لیا اور مشہور شاعر ذکیؔ مرادآبادی (متوفی 1281ھ/1864ء) شاگرد امام بخش ناسخؔ سے فن شاعری سیکھا۔ 1841ء میں آپ نے حج وزیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار "تجلی دربار رحمت" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً ترجمہ شمائل ترمذی (منظوم) مجموعہ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذبۂ عشق، دیوان کافیؔ۔

آپ کی نعتیہ شاعری اور جذبۂ عشق رسول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی (متوفی 1340ھ/ 1921ء) کہتے ہیں۔

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافیؔ "سلطانِ نعت گویاں" ہیں رضا
ان شاء اللہ میں وزیر اعظم

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

"مولانا کفایت علی کافیؔ تخلص، مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ تحصیل علم بدایوں، بریلی، رام پور اور لکھنؤ میں کیا۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جنگ آزادی 1857ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مراد آباد کے صدر الشریعہ بنائے گئے۔ مراد آباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مئی 1857ء میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ قبر عقب جیل ہنوز موجود ہے۔

ہمیشہ نعت لکھتے رہتے تھے۔ شرح شمائل ترمذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافیؔ کے ہاتھ کا تحریر کردہ شمائل ترمذی کا پہلا مسودہ خاکسار (مترجم) کے پاس محفوظ ہے۔ خاکسار کے جد اعلیٰ مولوی حکیم محمد سعید اللہ قادری (آنولہ، بریلی) سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں نے بریلی و رام پور میں ساتھ ساتھ علم حاصل کیا تھا۔ (ص 244۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مطبوعہ کراچی)

مراد آباد میں آپ نے انقلاب 1857ء کے وقت انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور اس کی نقلیں دور دور کے مقامات پر بھجوائیں۔ خود آنولہ (بریلی) جا کر ایک ہفتہ قیام کیا اور فتویٰ کی تشہیر کے ساتھ لوگوں میں جذبۂ جہاد ابھارا۔ یہاں سے بریلی پہنچے اور خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ سے تبادلہ خیال کیا پھر مراد آباد واپس آئے۔

نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں کی قیادت میں مراد آباد کے اندر حکومت قائم ہوئی تو مولانا کافیؔ ان کے صدر شریعت بنائے گئے۔ ڈسٹرکٹ گزٹ مراد آباد میں ہے کہ یہاں ضلع بھر میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت کی جس کے پیچھے ان کا مذہبی جذبہ کار فرما تھا۔ نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''مرادآباد میں رعایا کی یہ حالت تھی کہ ہر جمعہ کو مسجدوں میں جہاد کے واسطے وعظ کہا جاتا تھا جس سے باغیوں کی زیادہ تر ہمت بندھتی تھی۔''

(ص 58۔ جلد دوم اخبار الصنادید مطبوعہ رضا لائبریری رام پور)

اس وقت ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خاں انگریزوں کی حمایت و وفاداری میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے مرادآباد پر حملہ کیا مگر جنرل بخت خاں جب اپنی فوج کے ساتھ مرادآباد پہنچے تو نواب کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ تاہم بعد میں نواب نے انگریزوں کی مدد سے مرادآباد پر قبضہ کرلیا اور انگریزوں نے نواب مجو خاں کو طرح طرح کی اذیت دے کر شہید کردیا۔

مولانا کافیؔ اپنے خط کے ذریعہ جنرل بخت خاں کو مرادآباد کے حالات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ 25/اپریل 58ء کو جب مرادآباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو مولانا روپوش ہوگئے۔ مگر یک مخبر کی غداری سے 30/اپریل کو انگریزوں نے آپ کو گرفتار کرلیا۔ اس وقت انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا جو مقدمات کی سرسری سماعت کرکے سزا سنایا کرتا تھا۔ 4/مئی 1858ء کو مولانا کا مقدمہ ظالم و جابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ (اخبار الصنادید مؤلفہ نجم الغنی رام پوری مطبوعہ رام پور)

مسٹر جان انگلسن مجسٹریٹ کمیشن مرادآباد نے فیصلہ سنایا کہ:

''چوں کہ اس مدعا علیہ ملزم نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور عوام کو قانونی حکومت کے خلاف ورغلایا اور شہر میں لوٹ مار کی۔ ملزم کا یہ فعل صریح بغاوت انگریزی سرکار ہوا جس کی پاداش میں ملزم کو سزائے کامل دی جائے۔ حکم ہوا — مدعا علیہ کو پھانسی دے کر جان سے مارا جائے۔''

جان انگلسن۔ 6/مئی 1858ء۔

مقدمہ کی پوری کارروائی صرف دو دن میں پوری کردی گئی۔ 4/مئی کو پیش ہوا اور 6/مئی کو حکم دے دیا گیا اور اسی وقت پھانسی دے دی گئی۔ (ص 144۔ مرادآباد' تاریخ جدو جہد آزادی مؤلفہ سید محبوب حسین سبزواری مرادآبادی۔ مطبوعہ مرادآباد) پھانسی کے وقت آپ وجد و شوق کے ساتھ نعت شریف پڑھ رہے تھے۔ وہ نعت شریف جو تختۂ دار پہ چڑھنے سے پہلے مولانا کافی گنگنا رہے تھے اس کے چند اشعار یہ ہیں:

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خالی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافی و لیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

(6) مفتی عنایت احمد کاکوروی : مفتی عنایت احمد کاکوروی (متولد 1228ھ/ 1813ء۔ متوفی 1279ھ/ 1863ء) دیوہ (بارہ بنکی، اودھ) میں پیدا ہوئے اور اپنی نانیہال کاکوری (لکھنؤ) میں اپنے والد منشی محمد بخش کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ دیوہ اور کاکوری میں ابتدائی تعلیم کے بعد رام پور پہنچ کر مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں شاہ محمد اسحٰق (متوفی 1262ھ/ 1848ء) اور علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی مارہروی (1262ھ/ 1848ء) سے درس حدیث اور دیگر علوم پڑھ کر علی گڑھ میں مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے بہت سے شاگردوں میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی (متوفی 1334ھ/ 1916ء) صدر الصدور امورِ مذہبی حیدر آباد دکن زیادہ مشہور ہوئے۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ پہلے علی گڑھ میں منصف ہوئے کچھ عرصہ پھپھوند (اٹاوہ) میں بھی منصف رہے پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔ وہاں آپ زیادہ دنوں تک رہے اور کئی ایک دینی وعلمی کتابیں بھی لکھیں۔ یہاں آپ نے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن ”جلسۂ تائید دینِ متین“ قائم کر کے لٹریچر کی نشر واشاعت کی۔ اس انجمن کو برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن کہا جاتا ہے۔ 1857ء کے شروع میں آپ کو صدر الصدور آگرہ بنایا گیا۔ ابھی سفر کی تیاری جاری تھی کہ ماہ مئی میں انقلاب برپا ہو گیا اور آپ آگرہ نہ جا کر بریلی و رام پور میں

انقلابیوں کے ہمنوا و معاون بلکہ سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔

مجاہدین کے لئے مالی امداد و تعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے دستخط تھے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور دوسرے مفتی عنایت احمد کاکوروی (جنگ آزادی 1857ء۔ مطبوعہ کراچی)

میاں عبدالرشید کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور لکھتے ہیں — آپ (مفتی عنایت احمد) بریلی میں نواب خان بہادر خاں روہیلہ کی قیادت میں جہاد حریت کی تنظیم کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان دنوں روہیل کھنڈ بریلی مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دادا مولانا رضا علی خاں بریلوی اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے مجاہدین کی تنظیم پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ نواب خان بہادر خاں روہیلہ کے دست وبازو کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔

(جنگ آزادی نمبر۔ ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی۔ شمارہ جولائی 1975ء)

فتویٰ اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور کالا پانی کی سزا دی۔ جہاں چار سال قید و بند کی آپ نے مشقت جھیلی۔ ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کے ترجمہ کی خدمت انجام دینے کے صلے میں آپ کو رہائی ملی اور 1277ھ/ 1860ء میں ہندوستان واپس آکر کانپور میں ایک مدرسہ (فیض عام) کی بنیاد ڈالی اور دینی و علمی خدمات میں مصروف ہو گئے۔ کالا پانی میں آپ نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب ''تواریخ حبیب اللہ'' اور فن صرف کی کتاب ''علم الصیغہ'' تحریر کی جو آج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی لکھی ہوئی لگ بھگ دو درجن کتابیں ہیں۔

اپنے مدرسہ فیض عام کانپور کی کچھ خدمت کر کے آپ حج و زیارت حرمین شریفین کی نیت سے حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں مشیت الٰہی سے بحری جہاز غرق ہو گیا اور 17 رشوال 1279ھ/17 راپریل 1863ء میں آپ شہید اور غریق بحر رحمت ہو گئے۔

(7) مولانا رحمت اللہ کیرانوی : بانیٔ حرمین مولانا رحمت اللہ عثمانی کیرانوی (متولد 1233ھ/ 1817ء۔ متوفی 1308ھ/ 1891ء) کبیر الاولیا مخدوم جلال الدین پانی پتی

(متوفی 765ھ) کی اولاد میں سے ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ کیرانہ مظفر نگر (موجودہ مغربی یوپی) میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ حیات دہلی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ جا کر مفتی سعد اللہ مراد آبادی (متوفی 1294ھ/ 1877ء۔ شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی و مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی) سے چند اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی (متوفی 1296ھ/ دسمبر 1878ء) سے حدیث نبوی کی کئی کتابیں پڑھیں۔ مولانا امام بخش صہبائی سے بھی کچھ تحصیل علم کی۔

شروع میں کئی سال تک کیرانہ کی مسجد میں طلبہ کو پڑھایا۔ مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب زیادہ بڑھنے لگیں اور انھوں نے اسلام پر اعتراضات کیے تو شاہ عبدالغنی مجددی کے حکم پر "ازالۃ الاوھام" کے نام سے آپ نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب "میزان الحق" کے سارے عتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔

1270ھ/ 1854ء میں مولانا کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا جس میں پادری فنڈر کو آپ نے لاجواب کر دیا۔ اس مناظرہ کی تفصیلات اسی وقت کتابوں میں شایع ہو گئیں۔ اس مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی ورمولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی آپ کے خصوصی معاون تھے۔

انقلاب 1857ء شروع ہوا تو آپ نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں —— اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم وتربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا کہ —— ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔ (ص 246۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

مولوی رحمت اللہ صاحب کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر اور ان سے تعلقات تھے اس لئے اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ (ص 319۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے لکھا: سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے

کہ دلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟ وہ بڑے فاضل تھے۔

(ص 675 جلد سوم۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ، مطبوعہ دہلی)

روزنامچہ عبداللطیف میں ہے۔ دوسو اہل نجیب آباد مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں دہلی آئے اور آمادۂ پیکار ہوئے۔ پھر واپس چلے گئے۔ (ص 78۔ روزنامچہ عبداللطیف، مطبوعہ دہلی)

بعد میں انگریزوں نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور اعلان کیا کہ مولانا کیرانوی کو گرفتار کر کے انھیں انگریزوں کے حوالہ کرنے والے شخص کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ مگر مولانا کیرانوی گرفتار نہ کیے جا سکے اور کسی طرح بچتے بچاتے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ کیرانہ میں آپ کی جائداد و ملکیت ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ اسی طرح پانی پت کی آپ کی موروثی جائداد بھی نیلام کر دی گئی۔ مولانا کیرانوی اپنی روپوشی کے دوران راجپوتانہ ہوتے ہوئے سورت پہنچے۔ وہاں مولانا خیرالدین محدث سورتی (متوفی رجب 1206ھ) کی خانقاہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں مولانا وصی احمد محدث سورتی (متوفی 1334ھ 1916ء) کے والد مولانا محمد طیب راندیری ثم سورتی (متوفی 1276ھ/ 1860ء) سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ انگریزوں کے خلاف راندیر (گجرات) میں آپ تقریر کیا کرتے تھے اور ان سے جنگ کرتے ہوئے مولانا محمد طیب سورتی کے دو بیٹے اور متعدد ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ سورت ہی سے مولانا کیرانوی اور مولانا محمد طیب سورتی حرمین طیبین کے لئے روانہ ہوئے۔

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی (متوفی 1396ھ/ 1976ء) بن مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی (متولد 1298ھ/ 1883ء۔ متوفی 1352ھ/ دسمبر 1933ء) بن مولانا وصی احمد محدث سورتی (متوفی1334ھ/1916ء) لکھتے ہیں:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مولانا خیرالدین محدث سورتی کے خاندان سے بڑے دیرینہ مراسم تھے۔ اور آپ متعدد بار سفر حج کے دوران سورت میں مولانا خیرالدین محدث سورتی کی خانقاہ میں قیام فرما چکے تھے۔ 1857ء میں گرفتاری سے بچنے کے لئے جب مولانا کیرانوی سورت پہنچے تو یہاں محدث سورتی کی خانقاہ میں مولانا محمد طیب اپنے اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھے اور حجاز مقدس روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زبانی حالات کا علم ہوا تو مزید دل برداشتہ ہوئے۔ اور مولانا

کی ہمراہی میں نہایت خاموشی کے ساتھ ایک بادبانی کشتی پر سوار ہو کر حجاز مقدس کی جانب ہجرت کر گئے۔ صفر المظفر 1274ھ کے آخر میں جدہ پہنچے۔ یہاں سے مولانا محمد طیب سورتی مدینہ منورہ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ نے 1291ھ/1874ء میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا ور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شیخ زینی دحلان شافعی مکی نے وہاں آپ کو کافی سہارا دیا۔ سلطان ترکی کی دعوت پر کئی بار آپ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ انھیں کی خواہش پر آپ نے رد نصرانیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اظہار الحق'' مکہ مکرمہ میں لکھ کر پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ 1308ھ/ 1891ء میں مکہ مکرمہ میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں آپ کی تدفین ہوئی۔

(8) مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی : مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (متوفی 1289 / 1873ء) بہار کے رہنے والے تھے۔ والد محمد نذیر خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مرشدآباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دیا جہاں محنت سے آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی یونانی وعبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل و توریت وغیرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ ہندوستان واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ آئے۔ یہاں اپنے کام کے ساتھ مفتی انعام اللہ گوپاموی وکیل صدر سے ربط وضبط ہوا۔ اور جب مولانا احمد اللہ مدراسی نے مجلس علما آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست و بازو بن گئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریز دشمنی اور حریت نوازی کا چسکا شاہ (احمد اللہ مدراسی) صاحب کے فیض صحبت سے پڑا۔ (ص 81۔ غدر کے چند علما، مطبوعہ دہلی)

1854ء میں پادری فنڈر نے علمائے آگرہ کو چیلنج مناظرہ دیا تو مجلس علما میں مشورہ ہوا اور ڈاکٹر وزیر خاں نے اسے منظور کر کے اپنے دوست مولانا رحمت للہ کیرانوی کو بلا بھیجا۔ اور تین روز کے گرما گرم مناظرہ کے بعد پادری فنڈر نے راہ فرار اختیار کی۔ اس مناظرہ میں اہل اسلام کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر مقرر ہوئے تھے اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی ان کے معاون تھے۔

سید سلیمان ندوی (متوفی 1373ھ/1953ء) آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت میں تائید غیبی سے کم نہیں۔

کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت پادری فنڈر کے مقابلے کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا۔ جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصانیف کا ماہر کامل اور یونانی و عبرانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا۔ (ص 15۔ دیباچہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

انقلاب 1857ء میں آپ کی سرگرم شرکت کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں:

ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہوگئے۔ یہ مولوی فیض احمد بدایونی کو لے کر دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ کا دربار جما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آچکے تھے۔ ''وار کونسل'' بنی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بھی اس میں داخل کرلیے گئے۔ جنرل بخت خاں لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لیا۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔ (ص 87۔ غدر کے چند علماء مطبوعہ دہلی)

دہلی میں پسپائی کے بعد جنرل بخت روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی۔ پھر سب کو لکھنؤ چھوڑ کر شاہجہاں پور جانا پڑا۔ وہاں بھی جب ناکامی ہوئی تو منتشر ہوکر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں چھپتے چھپاتے مکہ مکرمہ پہنچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے پاس مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہوگئے۔

مکہ مکرمہ میں مطب کھول کر ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کا علاج کرنا شروع کیا۔ ایک عرب شیخ عبداللہ یمنی کی بیوی کا آپ نے علاج کیا اس نے آپ کو پیسے دینے چاہے تو آپ نے لینے سے انکار کیا جس کے بعد وہ آپ کا عقیدت مند ہوگیا۔ انگریزی حکومت نے سلطان ترکی کو

خط لکھا کہ ہمارا ایک مفرور ملزم مکہ میں ہے اس کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ سلطان ترکی نے گورنر مکہ شریف عبد للہ کو لکھا۔ گورنر مکہ کے مشورے سے آپ نے عبداللہ یمنی کو صورت حال بتائی اس نے گورنر مکہ سے کہا کہ میرے قبیلہ کے دس ہزار افراد ہیں جب وہ کٹ مرجائیں گے تبھی ڈاکٹر صاحب کو کسی کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ گورنر مکہ نے یہ بات سلطان ترکی کو لکھ کر مطلع کیا۔ اس نے حکومت ہند کو لکھ دیا کہ ایسے حالات میں اس ملزم کی حوالگی ناممکن ہے۔ حکومت ہند کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب مکہ مکرمہ میں چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں 1289ھ/ 1873ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

(9) مولانا وہاج الدین مرادآبادی : مولانا وہاج لدین عرف مولوی منو مرادآبادی (شہادت 1274ھ/ 1858ء) شہر کے بڑے عالم اور رئیس تھے۔ قومی جذبہ سے سرشار تھے۔ عوام وخواص آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عربی وفارسی واردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت تھی۔

انقلاب 1857ء میں آپ نے مرادآباد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرالیا۔ مسٹر جان کرافٹ ولسن یہ خبر سنتے ہی روپوش ہوگیا تھا۔

> ''مرادآباد میں مجاہدین کی پہلی ناکامی کے بعد مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو نے عوام کو دوبارہ منظم کیا اور معمولی ہتھیاروں کے ساتھ اپنی قیادت میں مجاہدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ جیل کی طرف بڑھے۔''
>
> (محاربۂ عظیم۔ مؤلفہ منشی کنھیالال)

مولانا وہاج الدین نے رام پور کا دورہ کرکے وہاں بھی جہاد اور حریت کی روح پھونکنے کا سرفروشانہ اقدام کیا کیوں کہ نواب رام پور انگریزوں کے وفادار تھے۔ قصبوں اور دیہاتوں میں گھوم کر آپ نے آزادی کا پیغام پہنچایا۔ شہزادہ فیروز شاہ جب مرادآباد پہنچا تو مولانا وہاج الدین اس کے دست راست بن گئے۔ مولانا سید کفایت علی کافیؔ اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مرادآباد میں انقلاب برپا کردیا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں ان حضرات نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری سے مولانا وہاج الدین کے گھر پر

انگریزوں نے 1274ھ/1858ء میں ایک روز دھاوا بول دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر آپ کو شہید کردیا۔

(10) مولانا امام بخش صہبائی دہلوی : مولانا امام بخش صہبائی دہلوی (شہادت 1273ھ/1857ء) مولانا عبداللہ خاں علوی کے شاگرد اور اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سرسید احمد خاں (متوفی مارچ 1898ء) نے اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" میں آپ کی تعریف کرتے ہوئے آپ کو علم وفضل کا جامع اور کئی فنون کا ماہر لکھا ہے۔

1840ء میں لفٹننٹ گورنر دہلی نے مفتی صدرالدین آزردہ کی نشان دہی پر آپ کو دہلی کالج میں فارسی زبان کا استاذ مقرر کیا۔ مرزا غالب اور صہبائی میں گہری دوستی تھی۔ مفتی آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے گھر تقریباً روزانہ ہی صہبائی جایا کرتے تھے جہاں علم وفضل اور شعروادب کی محفلیں ہروقت آراستہ رہا کرتی تھیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> "مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ ان کی تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف ونحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔ حدائق البلاغہ (تصنیف شمس الدین) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع ہوکر شائع ہوا۔ ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ 1840ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹننٹ گورنر مدرسہ کے معاینہ کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹننٹ گورنر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ (غالب) بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے۔ انھوں نے تو انکار کردیا۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہوار کی قبول کی۔ بعد میں پچاس روپے ہوگئے۔"

(ص162و163۔ مرحوم دلی کالج۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی 2۔ اشاعت سوم 1989ء)

مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور قلعۂ معلی کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ 1857ء میں انگریزوں نے آپ کے محلہ کوچہ چیلان دہلی سے ایک بار چودہ سو آدمیوں کو گرفتار کر کے راج گھاٹ (نئی دہلی) جمنا کنارے گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ انھیں میں مولانا صہبائی بھی تھے۔ آپ کے گھر کے اکیس افراد قتل کیے گئے۔

راشد الخیری دہلوی امام بخش صہبائی کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولوی قادر علی صاحب جو مولانا امام بخش صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور انھیں کے ساتھ انھیں کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر بیان فرماتے ہیں کہ:

میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاع سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا۔ اور پھانسیوں کی بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ:

"موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں۔ اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔"

میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی نے مجھے اشارہ کیا اس لئے دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں۔ اور صف بستہ لوگ گر گر مر گئے۔ تحریر شدہ 1924ء۔ (ص93و 94۔ بعنوان کارزار حیات۔ دلی کی آخری بہار۔ مؤلفہ راشد الخیری اردو اکاڈمی۔ دہلی۔ 2003ء)

یہ المناک خبر مفتی صدرالدین آزردہ نے سنی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مفتی مظہر کریم دریابادی : مفتی مظہر کریم دریابادی (متوفی اکتوبر 1873ء) معروف اردو ادیب وصحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کے دادا تھے۔ شاہجہاں پور میں فوج داری سررشتہ دار تھے جہاں انقلاب 1857ء میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ عیدگاہ شاہجہاں پور میں ایک بھاری اجتماع کے درمیان آپ نے انگریزی اقتدار کے خاتمہ کی دعا کرائی۔ مفتی مظہر کریم دریابادی کے پوتے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (سرسید نگر، علی گڑھ۔ یوپی) نے آپ کا ایک مختصر تعارف انقلاب 1857ء نمبر، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ شمارہ اپریل مئی 2007ء میں تحریر کیا ہے جسے یہاں بعینہٖ نقل کیا جارہا ہے۔

"لکھنؤ اور فیض آباد کے درمیان اور لکھنؤ سے تقریباً 42 میل دور واقع ایک مردم خیز قصبہ ہے دریاباد۔ جو 1861ء تک یا اس کے کچھ بعد تک یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے تقریباً پانچ سال بعد تک ضلع رہا، اس کے بعد بارہ بنکی کو ضلع کا مستقر بنایا گیا اور دریاباد کو کوئی انتظامی حیثیت حاصل نہ رہی۔

اس قصبے میں قدوائی خاندان بھی آباد ہے جس کے مورثِ اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین ملقب بہ قدوۃ الدین والعلم یا عرفِ عام میں قاضی قدوہ تھے۔ ایک زیادہ صحیح روایت کے مطابق وہ اناطولیہ سے شہاب الدین غوری کے عہد میں ہندوستان آئے اور انھیں قضاء کا منصب عطا ہوا، اور سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں انھوں نے حسب فرمائش سلطان، لکھنؤ کا رخ کیا اور جگور، رسولی قدیم نام 'ہرسولی' وغیرہ میں زمینداروں پر فتح پا کر اجودھیا پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ان کا مزار بابری مسجد سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا جسے مسجد کے ساتھ شہید کردیا گیا۔ انھیں جاگیریں بھی عطا ہوئیں اور ان کی اولاد مسولی، بڑاگاؤں، بھیارہ، رسولی، دریاباد میں اور کچھ جگور اور ضلع فیض آباد میں آباد ہوئی۔ قاضی صاحب کا شوق جہاد اور غایت تشرع وتقویٰ سب روایتوں میں مشترک ہے۔ قاضی صاحب قدوائی خاندانوں کے شجرے کے مطابق نسلاً اسرائیلی تھے۔ شجرۂ نسب ہریشون بن حضرت موسیٰ سے ہوتا ہوا حضرت لاوا، انگریزی قالب میں

Levi فرزند سوم حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے شیوخ صدیقی، عثمانی و انصاری جو اپنی اعلیٰ نسبی پر فخر کے خوگر تھے، نے بڑھ کر قدوائیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی لڑکیاں ان کے عقد میں دیں۔

انھیں قاضی قدوہ کی نسل میں ان سے کوئی دس پشتوں میں ایک بزرگ اور نمایاں ہستی مخدوم شیخ محمد آب کش دریابادی متوفی 880ھ مطابق 1327ء تھے (اس قصبہ کے بانی تھے) کی نظر آتی ہے۔ ان کی گیارہویں پشت میں مولوی مظہر کریم پیدا ہوئے۔ فقہ اور مشیخت ان کے والد مخدوم بخش کا خاندانی ورثہ تھا۔ مولوی مظہر کریم جو چار بھائیوں میں منجھلے تھے، انھوں نے علم و فضل کی تحصیل خود کی۔ تعلقات خود ان کے اور ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم نور کریم (جو طبیب گر کہلاتے تھے) کے فرنگی محل لکھنؤ سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور فرنگی محل اس وقت تک تھا دارالعلم و العمل، محض قافیہ کی رعایت سے نہیں، واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ معاصر علمائے فرنگی محل کے نام مولانا عبدالحلیم، مولانا عبدالحیم، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالحی، مولانا نعیم کے فتاویٰ کی تائید میں دستخطوں کے ملتے ہیں۔ بدایوں، بریلی، رام پور، شاہ جہاں پور اور دہلی کے علما سے بھی تعلقات تھے۔ فتاویٰ کے سلسلے میں مولانا مفتی صدرالدین شاہی مفتی دہلی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا سعد اللہ رام پوری، مولانا فضل رسول بدایونی کے نام بار بار ملتے ہیں۔

انگریزی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی، کہیں قائم ہو چکی تھی، کہیں قائم ہو رہی تھی۔ ان علاقوں میں جو آج ریاست اتر پردیش کہلاتا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کا حکم چل رہا تھا۔ شاہ جہاں پور ضلع قرار پا چکا تھا۔ مفتی مظہر کریم 1829ء میں بسلسلۂ تلاشِ ملازمت انگریزی، شاہ جہاں پور پہنچے اور ایک ادنیٰ عہدے سے ترقی کرتے ہوئے 100 روپے کے مشاہرے پر سررشتہ دار فوجداری ہو گئے۔ اس وقت کے معیار سے تنخواہ اور اختیارات دونوں کے لحاظ سے بلند اور ذمہ داری کا عہدہ تھا۔ انگریز کلکٹر پر مفتی صاحب کا خاصا اثر تھا۔ جب مفتی صاحب ان سے ملنے جاتے تو خاندانی روایتوں میں سننے میں آیا ہے کہ کلکٹر اپنے مسلمان خانساماں سے چائے بنوا کر پیش کرتا تھا۔

جب مجاہدین آزادی نے شاہ جہاں پور پر قبضہ کر لیا اور انگریز حکام کو قتل کر دیا تو مفتی

صاحب کے قیام شاہ جہاں پور کی مدت اس وقت 27 سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اتنے طویل قیام سے پردیس دیس بن چکا تھا اور مسافرت میں شان وطن کی ہو چکی تھی اور عمائدین شہر سے مفتی صاحب کے بہت گہرے مراسم و روابط عزیزوں کے سے قائم ہو چکے تھے، ان کا شمار شہر کی بااثر شخصیتوں میں ہوتا تھا اور ان کا عوام اور حکام پر بڑا اچھا اثر تھا۔

مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ گیارہ مہینے سے زیادہ شاہ جہاں پور اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں مجاہدین آزادی کی حکومت جنرل بہادر خاں کی سربراہی میں قائم رہی۔ ان مجاہدین میں غیور اور بہادر روہیلے اور جان ہتھیلی پر رکھنے والے راج پوت تھے۔ مفتی صاحب نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے گھر پر مجاہدین آزادی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں جنگی حکمتِ عملی تیار کی جاتی تھی اور دوسرے انتظامی امور کے بارے میں بھی اہم فیصلے کیے جاتے تھے اور ان معاملوں میں مفتی صاحب کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ مولانا احمد اللہ مدراسی جو عرف عام میں ''مولانا فیض آبادی'' کہلاتے تھے، مفتی صاحب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ جب مجاہدین کو انگریزی فوجوں نے شاہ جہاں پور میں شکست دی اور اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مجاہدینِ آزادی کے دوسرے لیڈروں کی طرح مفتی صاحب کو بھی گرفتار کر لیا۔

ایک انگریز ٹی، ایف سیتھم نے 1858ء میں بنارس کے ایک پریس سے شاہجہاں پور میں انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد شاہ جہاں پور میں 1857ء میں ہونے والے واقعات کی ایک طویل داستان انگریزی میں شائع کی اور اس میں مفتی صاحب کو بغاوت کا سرغنہ ٹھہرایا اور اسی کے ساتھ اس نے مفتی صاحب کے اثر و اقتدار کو ہر جگہ تسلیم کیا۔ انگریزی تسلط کے بعد مفتی صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کے فتویٰ پر ان کے دستخط تھے۔ مفتی صاحب کو بغاوت کے الزام میں 14 سال کی سزا بہ عبور دریائے شور دی گئی۔ یعنی انھیں انڈمان بھیج دیا گیا جہاں ان کا ساتھ مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی جیسے سالاروں کا رہا۔ اسیری کے دوران مفتی صاحب نے علمی مشغلہ جاری رکھا۔ اپریل 1859ء میں گورنمنٹ کی طرف سے یہ اشتہار شائع کیا گیا کہ مفید عام کتابوں کے ترجمے پر اہل علم کو بشرط

پسند حکومت، معقول انعام نقد عطا ہوگا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی صاحب اور مفتی مظہر کریم صاحب نے اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک ایک کتاب اردو ترجمے کے لئے انتخاب کرلی۔

مفتی عنایت احمد صاحب نے تقویم البلدان کو لیا اور مفتی صاحب نے مراصد الاتباع فی اسماء الامکنہ والبقاع۔ مصنفہ صفی عبدالمومن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ (یہ غیر مطبوعہ ضخیم ترجمہ قلمی نسخہ یا مخطوطہ کی صورت میں عم مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے کتب خانہ میں عرصہ تک رہا اور راقم السطور کو بھی اس کی ورق گردانی کا شرف حاصل ہوا) جب نعام کا وقت آیا تو بجائے نقد رقم کے رہائی کو پیش کیا گیا۔ چنانچہ بقیہ میعادِ اسیری معاف کردی گئی اور اپنے وطن دریاباد واپس آگئے اور خانہ نشین ہوگئے اور خاموشی کے ساتھ انہی خدمات میں لگے رہے۔

انھوں نے 14 ر اکتوبر 1873ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ان کی بیوی کا چھ مہینے پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں کل سات اولادیں چھوڑیں۔ چھوٹے فرزند مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے چھوٹے بیٹے نامور عالمِ دین، مفسر قرآن اور ادیب جلیل مولانا عبدالماجد دریابادی تھے۔ اور بڑے بیٹے مولوی عبدالمجید ڈپٹی کلکٹر تھے اور راقم السطور کے والد ماجد تھے۔

جنگ آزادی کی تاریخی ناانصافیاں

آج سے کوئی ساٹھ برس قبل ہمارے اسلاف نے یہ سوچا تھا کہ اب ہندستان آزاد ہوا تو ہماری اصل تاریخ سامنے آئے گی اور ہماری میراث آنے والی نسلوں تک پہنچ سکے گی اور مسخ شدہ ہندستانی تاریخ ازسرنو ترتیب دی جائے گی مگر یہ امید حسرت ہی بنی رہی۔ بقول شمیم اختر:

> "چند ایک روشن خیال افراد کو چھوڑ کر ہماری تاریخ کا جائزہ لینے والوں نے نئی تاریخیں گڑھ لیں اور اپنے پرکھوں کے جنازے سے کفن چوری کر لیا اور انھیں برہنہ چھوڑ کر اپنی فرقہ پرستی اور درندگی کا ثبوت فراہم کیا، اپنی ذات، برادری ہم مذہب سیاسی رہنماؤں اور آزادیٔ وطن کی خاطر شہید ہونے والوں کی یاد میں مجسمے بنائے، تصویریں، بنائیں، جنم دن منائے، شہروں گلیوں، محلوں اور اور دانش گاہوں کے نئے نام رکھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں ان کے اسمائے گرامی لٹکائے۔ اس طرح اپنی عصبیت اور تنگ نظری کی صلیبیں نا کران کے سینوں پر چپکا دیں۔" (باغی کی وراثت)

سچائی یہی ہے کہ ہندستانی تاریخ اور سیاست نے اپنے جان نثاروں کو بھلا دیا۔ بلکہ یہ کہیں کہ جن کو ہماری سیاست نے چاہا ملک کی تاریخ میں زندہ رکھا اور جس کو چاہا اس سرے سے تاریخ کے صفحات سے غائب کر دیا۔ جو کل کے ہیرو تھے انہیں کوئی جانتا بھی نہیں لیکن جو بزدہ فروش تھے ان کی تاریخیں گڑھی گئیں، جنھوں نے ساز باز کر کے پوری امت اور علماء کو بدنام کرنے کی کوشش کی انہی کو جنگ آزادی کا سپہ سالار کہا جا رہا ہے، ان پر لکھی جانے والی کتابیں مزین اوراق میں شائع ہو رہی ہیں۔ جن کی انگریز نوازیوں نے ملک وقوم کے ساتھ غداری کی وہ آج کے ہیرو ہیں۔ متعصب اور تساہل مؤرخوں کے حوالوں میں بھی وہی ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ صرف ایک جماعت اور ایک فرقہ کا نام تاریخ میں درج کر کے سچے وطن پرست اور جانبازوں کو تاریخ سے مٹا دینے کی ایسی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملے گی۔ لیکن صرف غیروں پہ ماتم کر کے اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی سچ بات یہ

ہے کہ اس غیر اخلاقی رویے کے لیے جس قدر متعصب تاریخ نویس ذمہ دار ہیں اس سے کہیں زیادہ ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی اپنی تاریخ کو نہ سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی حفاظت کا کوئی اہتمام کیا۔ جب ہمارا ہی یہ حال ہوگا تو دوسروں سے شکایت ہی بے جا ہے۔ لیکن ایک اہم بات جس پر احتجاج بھی کیا جانا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندستان میں جنگ آزادی سے متعلق جتنی بھی شخصیات ہیں ان کے نام پر سڑکیں، اسکول، کالج اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ اور ہر سال ان کا جنم دن اور برسی بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ یہاں میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسی سال کو ہمارے ہیرو اور قائد کی برسی 7 نومبر 2007 کو ہے۔ جس کے بغیر جنگ آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ مگر اسے نہ صرف ہم نے بھلایا بلکہ ہماری حکومت نے بھی اس طرح بھلایا کہ پورے ملک کی بات تو چھوڑیئے، جس لال قلعے پر ہم فخر کرتے ہیں اس لال قلعے کے شہر، دہلی نے بھی بہادر شاہ ظفر کی برسی پر کوئی تقریب نہیں کی۔ اب اسے آپ تعصب کہیں، مسلم تاریخ کشی کہیں یا جو چاہیں نام دے لیں مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ بھی سوچ لیں کہ کیا ہم خود بھی بے حسی کے شکار نہیں ہیں؟

آج کی صیہونی طاقتیں صرف انہیں اقوام کو اپنا نشانہ بنا رہی ہیں جن کی تاریخیں سب سے زیادہ روشن اور جن کے اقدار سب سے اعلیٰ رہے ہیں۔ آج کے گلوبل ورلڈ میں سب سے بڑی لڑائی یہی ہے۔ جب کسی قوم کی تاریخ تیزی سے آگے بڑھی ہے اس کو اسی تندد سے ختم کرنے کی سازش بھی کی گئی ہے۔ اس ملک میں سب سے پہلے انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ انگریزوں کی دو کوششیں تھیں جس میں وہ کامیاب ہوئے اور آج تک وہ لعنت ختم نہیں ہوئی۔

1۔ ہندو مسلم نفاق

2۔ مسلمانوں کے خلاف سازش

انگریزوں کے ذریعے ہندستان میں فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی کا جو بیج بویا گیا آج وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ فرقہ پرستی کی لعنت شباب پر ہے اور مسلمانوں کی خلاف عالمی سطح پر جو سازشیں کی جا رہی ہیں، اس میں کہیں نہ کہیں ہندستان کی بھی شراکت ہے۔ ایسے میں اگر ہم نے تو آگے بڑھ کر اپنی تاریخ اور اسلاف کے میراث کی حفاظت نہیں کی تو جو بھی بچی کچی تاریخ ہے اسے مٹنے میں بہت وقت نہیں لگے گا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں وہی قومیں اور نسلیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہتی ہیں جو اپنی

تاریخ کو اپنے لیے نہ صرف سرمایہ افتخار سمجھتی ہیں بلکہ اسے دقیع ترین میراث بھی سمجھتی ہیں۔ جس قوم نے اپنی تاریخ کو اپنے سینے سے لگایا وہی قوم سرفراز اور سربلند رہتی ہے۔ اگر کسی قوم کو اس دنیا سے ختم کرنا ہے تو اس کے لیے تلوار و تفنگ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی تاریخ کو مٹا دو وہ قوم ایک صدی سے بھی کم میں خود بخود ختم ہو جائے گی۔ آج عالمی سطح پر اسی طرح کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ صارفیت کا تصور بھی تقریباً یہی ہے کہ ایک ایسا نظام متعارف کرایا جائے کہ جس کی چمک دمک کے آگے اقوام اپنے اقدار سے منھ موڑ لیں۔ آج صارفیت اور عالم کاری کے پس پردہ مغربی کلچر کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ حیرت اس بات پر بھی ہے کہ اس کلچر کو عام کرنے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس سائنسی دور میں مذہب کو ہمارے سماج سے کوئی واسطہ نہیں ہے مگر اس مغربی تہذیب کو دیکھیں تو اس میں تمام تر رسومات کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے عیسائی مذہب سے ہے۔

المیہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری ہندستانی تہذیب پر حملے ہو رہے ہیں اسی طرح ہماری تاریخ پر بھی کاری ضرب لگائی جارہی ہے۔ لیکن بہت کم اہل نظر ہیں جو اس حوالے سے اپنے ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہندستانی تاریخ کو جس طرح سے غیر ملکیوں نے تباہ کیا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی، جن انگریزوں نے اس ملک کو لوٹا وہی اس کی تاریخ بھی لکھ رہے تھے اور آج کے فیشن پرست معاشرے میں انہیں کی کتابوں کو سب سے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس ملک کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ پڑھ کر ہمیشہ تشنگی کا احساس ہوا۔ چونکہ ہندستان میں انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے سب سے زیادہ خطرہ انہیں مسلمانوں سے ہی تھا۔ اور انھوں نے سب سے زیادہ مظالم بھی مسلمانوں پر ہی ڈھائے اور شعوری طور پر ان کی تاریخ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس کے بعد عہد جدید کے تاریخ نویس بھی علمی دیانت داری سے کام نہیں لے سکے کیونکہ اس عہد کی زبان اردو اور فارسی تھی۔ لہٰذا تمام بنیادی مواد اسی زبان میں موجود تھے اور تاریخ نویس ان سے ناواقف بھی تھے اور واقف ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ ہندستان کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹتا گیا اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جب بھی حکومت جنگ آزادی کی بات کرتی ہے یا جب کوئی ایسی تقریب منائی جاتی جس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جنگ آزادی کے ہیروز کی تصویریں شائع کی جاتی ہیں تو ان میں مسلمان چہرے کم ہی ہوتے ہیں۔ چند نام جو ٹریڈ مارک کی حیثیت رکھتے ہیں، ہم انہی ناموں اور تصویروں کو ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ سچائی بالکل اس کے بر

عکس ہے 1757ء تک اور 1857ء سے 1947ء تک کی تاریخی سچائیوں کو کھنگالنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طویل اور تاریخی جنگ میں جس طرح علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اس طرح کسی اور مذہبی جماعت نے وہ کردار نہیں نبھایا۔ ایک طویل فہرست ہے جس کے لیے کئی دفاتر کی ضرورت ہے۔ لیکن جس طرح دوسروں نے ہماری قربانیوں اور وطن پر جاں نثاریوں کو بھلا دیا اس سے زیادہ ہم نے بھی غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک اور پہلو پر بھی غور کریں کہ تاریخ نویس اتمام حجت کے لیے اگر علما کا نام لیتے بھی ہیں تو وہ وہابی تحریک سے شروع کرتے ہیں اور وہیں ختم بھی کر دیتے ہیں۔ جو ہماری تاریخ کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔

1857ء کے واقعے نے ایک طرف ملک کا سارا نظام بدل ڈالا تو دوسری جانب خود ہندستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا صدیوں سے بنی بنائی قدروں کو لمحوں میں مسمار کر دیا۔ مشرقی تہذیب پر مغربی یلغار نے دانشوروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عیسائیت کو حکومت کی سرپرستی میں فروغ دینے کی منضبط کوششوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا، وہ جو دوسروں کی کفالت کرتے تھے اب خود ہی دو وقت کی روٹی کے لیے محتاج ہو گئے اس معاشی پست حالی نے ہندستانیوں کی کمر توڑ دی۔ چونکہ انگریز مسلمانوں کی حکومت پر قابض ہوئے تھے اس لیے انہیں ہر لحہ یہ خدشہ تھا کہ اگر یہ دوبارہ متحد ہو گئے تو ہم سے نہ صرف حکومت چھین لی جائے گی بلکہ ہمارا نام ونشان بھی مٹا دیا جائے گا۔ اس لیے ان کا یک نکاتی پروگرام تھا کہ انہیں نفسیاتی اعتبار سے اتنا کمزور کر دو کہ یہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی منصوبے کے تحت انہوں نے مذہبی منافرت کا بھی سہارا لیا اور ہر محاذ پر خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا علمی انہیں محرومیوں کا سامنا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ محب وطن جو وطن کی خاطر اپنی جان و مال کی بھی پروا نہیں کر رہے تھے، ایسے جاں نثاروں کی، ان کے پاس یک طویل فہرست تھی، اسی نئے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد نہیں ایسی عبرتناک سزائیں دی گئیں کہ کوئی ان کی مخالفت کا گمان بھی نہ کر سکے۔ اس اندوہناک صورت حال میں سب سے بڑی ضرورت تھی کہ عوام کو محرومی کے احساس سے نکالا جائے ورنفسیاتی اعتبار سے ٹوٹے بکھرے لوگوں کو ہمت وحوصلہ فراہم کیا جائے۔ اس وقت کسی بھی اقدام سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا تھا، جتنا کہ اس اقدام سے ہوا۔ جسے علمائے کرام، اردو کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے کیا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان ناموں میں ایک طبقے کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے علمائے کرام کی

تحریریں۔1858ء کے حوالے سے اردو ادب کا ذخیرہ بہت ہی وسیع ہے مگر المیہ ہے کہ ہم تعصبات کے شکار ہیں۔ ہم نے علماء کی تحریروں کو یکسر نظر انداز کیا ہے اور اسے ادب کے دائرے سے ہی خارج کر دیا ہے۔ افسوس صد افسوس کہ خود اپنا سرمایہ ہم اپنے ہاتھوں سے ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی جو کچھ موجود ہے اس میں بھی علماء اور مذہبی شخصیات کی تحریریں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔1857ء کی ناکام جنگ کے بعد ادیبوں کی جانب سے طرح طرح کے ردعمل سامنے آئے۔1860ء ہی میں ''فغان دہلی'' کے نام سے شاعری کا مجموعہ سامنے آیا جس میں بیشتر ایسے شاعروں کا کلام ہے جو خود اس جنگ میں عملی طور پر شریک رہے اور جن جن شاعروں کے نام ہیں ان میں بیشتر وہ علمائے کرام ہیں جن کو ہمارے تاریخ نویس شاعر تو کہتے ہیں مگر عالم کہنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔''الہ آباد میں شورش کے موقعے پر جو اشتہار بنام شاہ اودھ اور دیگر مقامات قرب و جوار میں مشتہر کیے گئے تھے ان میں سے دو پنڈت کنہیالال نے محاربۂ عظیم (صفحہ 300) میں نقل کیا ہے۔ یہ دونوں اشتہار اردو میں ہیں، ایک نثر میں ہے اور ایک نظم میں'' نظم اشتہار اس طرح ہے۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن احادیث میں خوبیٔ جہاد
اب بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کرلو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال
جو راہ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد

چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے
اپنی سستی کا بجز افسوس نہ پھل پاؤ گے

مومن خان مومن دہلوی بھی اس یورش کے عینی شاہدین میں سے ہیں۔ انگریزوں کی بڑھتی طاقت کے پیش نظر انہیں دہلی اور لال قلعہ کی تباہی کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے انہوں نے بھی وہی باتیں کہیں جو اس وقت تمام علماء، مفتیان اور دانشوروں نے کہی تھی، ان کے مطابق انگریزوں سے لڑنا ایک طرح کا جہاد تھا۔ اور لوگ جہاد سمجھ کر ہی اس میں شریک ہو رہے تھے۔ آج معاملہ برعکس ہے اور اس لفظ کو بے حرمت کر دیا گیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف اسی جہاد کے متعلق علامہ فضل حق خیرآبادی نے جامع مسجد کے منبر سے جہاد کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی اور جہاد کا فتویٰ صادر کر کے علماء سے اس پر دستخط لیے۔ پھر اس کے بعد ہر طرف انگریزوں کے خلاف جہاد کے نعرے گونجنے لگے۔ جس کے حوالے اس عہد کے دستاویزات میں موجود ہیں۔ اس کا چرچا اتنا عام ہو کہ اردو شعرا نے بھی اسے اپنا موضوع سخن بنایا۔ اسی جہاد کی تلقین کرتے ہوئے مومن نے "مثنوی جہادیہ" لکھی جس کے چند اشعار یوں ہیں:

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرے
حیات ابد ہے جو اس دم مرے
سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

امام بخش صہبائی جو ایک بڑے عالم دین بھی تھے، نے اس جنگ میں عملی طور پر شرکت بھی کی اور انگریزوں کے ذریعے معتوب بھی ہوئے، انہوں نے دلی کے لٹ جانے کے بعد کے منظر کو جس انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے وہ انتہائی کرب انگیز ہے۔ انہوں نے ذیل کے اشعار میں ان شہزادیوں اور رئیسوں کی بدحالی کا ذکر کیا ہے کہ جنہوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی غم نہ اٹھایا ان کا حال ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

زیور الماس کا تھا جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں
طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ ان کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا
روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خان کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سوادی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

(فغان دہلی)

منیر شکوہ آبادی بھی جنہیں صرف لوگ شاعر کے طور پر جانتے ہیں، ایک عالم دین تھے (مولانا یسین اختر مصباحی نے اپنی کتاب میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے) جنہوں نے اس ہنگامے کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس سے متاثر بھی ہوئے۔ یہ نواب باندہ کے مصاحب تھے، ان کی گرفتاری کے بعد مرزا ولایت حسین کے ساتھ فرخ آباد میں قید کر لیے گئے اور ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ اس کی تفصیل خود ان کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

فرخ آباد اور یاران شفیق
چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے
سو طرح کی ذلت وتحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر
تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الہ باد میں گذرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جس میں علماء وشعراء نے تاریخ نویسی کا عمل انجام دیا گیا ہے ہم نئے تاریخ نویسوں سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کو نئے سرے سے دیکھیں اور تاریخ نویسی میں مبالغہ اور دروغ سے احتراز کرتے ہوئے بنیادی مآخذ سے براہ راست استفادے کے بعد ہی تاریخ لکھیں تب ہی وطن پر قربان ہونے والوں کا قرض ادا ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر رضوان منیر

انقلاب ۱۸۵۷ء اور ہندو مسلم یکجہتی

جدید ہندوستانی تاریخ کے چند ہی باب ایسے ہونگے جو مورخین کے علاوہ عام لوگوں کے ذہنی خاکہ کا بھی حصہ بنے ہونگے۔ 1857ء کی بغاوت یا انقلاب یا آزادی کی پہلی جنگ ان چند ابواب میں سے ایک اہم باب ہے۔ آج پورا ملک اسی بغاوت کی یاد میں جلسے منعقد کر رہا ہے۔ سیمنار اور کانفرنس ہالوں کے علاوہ عوام الناس کے درمیان بھی یہ واقعہ موضوع بحث ہے۔ تقاریر اور تحقیقی مقالوں کا ایک نیا ماحول ہے اور یہ احساس گزرتا ہے کہ تاریخ جیسا سبجیکٹ جو عام اصطلاح میں ''گڑے مردے اکھاڑنے'' جیسا ہے زندہ ہو جاتا ہے اور تاریخ کے اس واقعہ کو ملی اس نئی زندگی میں سبھی لوگ، خاص طور پر مورخین ایک نئی خصوصیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ڈیڑھ سو سال قبل ہوئے اس واقعہ کی معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ اسکی ایک معنویت ان لوگوں کے لئے تھی جو اسی وقت بغاوت میں شریک تھے۔ اگر انکے جوش وخروش کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جان تک کی قربانی قبول کی۔ اسکے برعکس وہ لوگ ہیں جو بذات خود نہ تو اس بغاوت میں شامل تھے اور نہ ہی براہ راست انگریزوں کے ظلم اور تشدد کے شکار بنے۔ انکے لئے اس بغاوت کی معنویت اتنی ہی تھی کہ کیا ایسا ہونا چاہئے تھا یا نہیں۔ اس خیمہ میں سرسید سرفہرست نظر آتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور گروپ ہے جو دامے، درمے سخنے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے انکے لئے یہ بغاوت کسی نمک حرامی سے کم نہیں تھی۔ ہندوستانی سماج کا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ خاص طور پر بنگال میں اور وہ راجے اور نواب جنکی بقا انگریزوں کی حمایت پر منحصر تھی سبھوں نے اس بغاوت کی مذمت کی اور انگریزوں کا ساتھ محض الفاظ ہی میں نہیں بلکہ براہ راست اسے دبانے میں بھی پیش پیش رہے۔

اگر یہ صورتحال بغاوت کے وقت تھی تو آئندہ وقتوں میں بھی اس کے بارے میں نظریہ اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن یہ نظریہ اختلاف منظر عام پر کھل کر اس وقت آتا ہے جب اس کی صدی 1957ء میں منائی جارہی تھی۔ 1907ء میں اس کی نصف صدی کا جشن منایا جانا آسان نہ تھا کیونکہ انگریزی حکومت اپنے شباب پر تھی، لیکن 1957ء میں سرکار کی طرف سے خاص طور پر منسٹری آف ایجوکیشن (جو اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر قیادت تھی) کی طرف سے اس بغاوت کی ایک معروضی تاریخ مرتب کرنے کے لئے اقدام کئے گئے۔ اس کی ذمہ داری اس وقت کے ایک مشہور مورخ ایس، این، سین کو دی گئی۔ انہوں نے 1957ء میں اٹھارہ سو ستاون کے عنوان سے ایک اہم کتاب لکھی جسے Publication Division نے شائع کیا۔ تقریباً انہی دنوں آر، سی، مجومدار نے بھی ایک ضخیم کتاب بعنوان ''دی سپوائے میوٹنی اینڈ دی رووسٹ آف 1857ء'' شائع کی اور یہ کہنے کی کوشش کی کہ اس بغاوت کے مختلف لیڈران اپنے ذاتی مفاد کے لئے لڑ رہے تھے اور ان میں آپسی تال میل کا فقدان تھا اور پھر اس بغاوت میں غنڈہ عناصر کی موجودگی اس بغاوت پر کئی سوالیہ نشان کھڑے کرتی ہے۔

آر، سی، مجومدار کے برعکس سریندر ناتھ سین نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں یہ کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اس بغاوت کی شروعات فوجیوں نے کی مگر یہ انہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا کردار ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

مذکورہ بالا مورخین کے علاوہ مولانا آزاد نے سریندر ناتھ سین کی کتاب کے پیش لفظ میں اس بغاوت کے دیگر وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی شروعات کسی سازش کے تحت نہیں ہوئی تھی بلکہ پچھلے سو سالوں سے کمپنی کی حکومت سے عام ہندوستانی بدظن ہو چکا تھا، یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس بات کا احساس رفتہ رفتہ ہوا کہ وہ اب اپنے ہی ملک میں غلامانہ زندگی جینے پر مجبور تھے، یہ احساس کسی خاص طبقہ، گروپ یا کمیونٹی تک محدود نہیں تھا بلکہ عمومی طور پر یہ احساس شدت میں تبدیل ہورہا تھا، لہٰذا اس بغاوت کا کردار بھی عمومی رہا۔

ہندوستان جیسے ملک میں کسی بھی سیاسی عمل کا کردار جب عمومی رہا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس عمل کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپسی تعلقات کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس امر کا جائزہ لینا اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ فی زمانہ باہمی تعلقات میں کشیدگی کے بارے میں

عام رائے یہ بنتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات ہمیشہ سے ہی گومگو اور تذبذب کا شکار رہے ہیں۔ لوگ اپنی موجودہ سمجھ کو تاریخی واقعات پر تھوپنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عام گفتگو میں عہد جدید کی اصطلاحوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ 1857ء میں ہندو، مسلم رشتے کو سمجھنے کے لئے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ان دنوں سیکولر نظریہ کی کیا افادیت تھی یا پھر کمیونل ازم کا باہمی تعلقات پر کیا اثر تھا؟ ان سوالوں کے جواب میں بس اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ ان اصطلاحوں کا اطلاق 1857ء کے ضمن میں سن وعن تو نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان دنوں لفظ سیکولر ازم کسی بھی صورت میں سیاسی زبان کا حصہ نہیں تھا جیسا کہ آج ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے ٹھیک اسی طرح سے کمیونل ازم کا سوال ہے۔ یہ نظریہ بھی عام لوگوں کی زندگی کو نہیں چھوتا تھا۔ عام لوگوں کی زندگی میں سیکولرازم کی جگہ رواداری کا پہلو تھا۔

تہذیبی اور ثقافتی سطح پر لین دین اور بھائی چارہ کا ماحول تھا اور یہ باتیں کسی نظریہ سازی کے تحت طے نہیں پا رہی تھیں بلکہ اس وقت کی عمومی زندگی کا یہ فطری پہلو اور روزمرہ زندگی کا ایک لازمی عنصر تھا۔ اسی کے برعکس کمیونل ازم یا فرقہ پرستی جیسا نظریہ نہ تو تشکیل پا سکا تھا ورنہ ہی اس کی تاریخی گنجائش تھی کیونکہ سیاسی زندگی میں محض ایک مذہبی کمیونٹی کا رول نہیں تھا۔ حالانکہ آئندہ وقتوں میں ایسا ہوا لیکن 1857ء تک اس کی کوئی معنویت نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس فرقہ واریت کا ماحول 1857 کے بعد ہی گرم ہوتا دکھائی دیتا ہے جس کی بڑی ذمہ داری انگریزی سرکار پر ہی جاتی ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ 1857 میں ہندو، مسلم یکجہتی کی کیا تصویر ابھر کر آتی ہے۔ اس قومی یکجہتی کی سب سے بڑی تصویر تو یہ ہے کہ میرٹھ سے جب باغی سپاہی دلی پہنچے تو ان کا سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر کو پورے ملک کا بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا جائے۔ جب کہ ان سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کی تھی اور باوجود اس کے بھی کہ خود بہادر شاہ کی حکومت کا شیرازہ کافی پہلے ہی بکھر چکا تھا مگر پھر بھی مغلیہ نسل کا وقار اور اس کی علامتی اہمیت باقی تھی بہادر شاہ ظفر نے بادل ناخواستہ باغیوں کی قیادت قبول کر لی اور اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی دیگر تمام شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی رکھی کہ بغاوت کے دور عمل میں ہندو مسلم یکجہتی برقرار رہے۔ اس کی واضح ترین مثال یکم اگست 1857ء کا دن ہے جب بقرعید کے موقع پر جانوروں کی قربانی کے مدنظر بہادر شاہ ظفر نے یہ فرمان جاری کیا کہ قربانی

کے نام پر گئو کشی پر پابندی ہوگی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو سخت سے سخت سزا ملے گی۔ یہی نہیں خود بہادر شاہ نے محض ایک بھیڑ کی قربانی پر اکتفا کیا۔

بہادر شاہ کے اس قدم سے بہت پہلے ہی نانا صاحب اور جھانسی کی رانی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ بہادر شاہ کو پورے ملک کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور خود کو ان کا نائب۔ ان کا یہ اعلان کسی بھی پابندی کے تحت نہیں بلکہ رضا کارانہ تھا۔ یہ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیاسی عمل میں شمولیت مذہبی تفریق کی بنیاد پر نہیں بلکہ دیگر بنیادوں پر منحصر تھی یکجہتی کا یہ پہلو دلی کے علاوہ دیگر ریاستوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً بریلی میں خان بہادر خان نے اپنی حکومت قائم کی تب اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کی ریاست میں گئو کشی پر سخت پابندی رہے گی مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اسے امید ہے کہ روہیل کھنڈ کے ہندو ان کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی حکومت کا دیوان ایک ہندو کو بنایا جس کا نام شو بھارام تھا اور اس کے عملے میں زیادہ تر ہندو ہی تھے، اپنی حکومت کی پائداری کے لئے اگر اس نے ایک طرف علما سے فتویٰ حاصل کیا تو وہیں دوسری طرف برہمنوں کے ذریعہ جاری کئے گئے دیاوستھا بھی حاصل کیا۔

بغاوت سے قبل بھی خان بہادر خان انگریزوں کے ذریعہ ہندوؤں کے دینی معاملات میں دخل اندازی پر نکتہ چینی کر چکے تھے۔ مثلاً ستی کی رسم پر پابندی اور جیل خانوں میں ایک ہی باورچی کے ہاتھوں کے پکے کھانے کو تمام قیدیوں کو کھلانا وغیرہ وغیرہ۔

روہیل کھنڈ میں ہندو مسلم یکجہتی انگریزوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ قومی یکجہتی کو توڑا جائے۔ اسی مقصد سے Captain Gowan کو پچاس ہزار روپے تک خرچ کرنے کی چھوٹ دی گئی تھی تا کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا سکے لیکن روہیل کھنڈ کے ہندوؤں نے انگریزوں کی گھناؤنی سازش میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا۔

مولانا آزاد نے ایس۔ این۔ سین کی کتاب کے پیش لفظ میں یہ بھی کہا تھا کہ فرقہ واریت کے جذبہ سے عاری ہونا کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ہندو اور مسلمان کے باہمی خوشگوار رشتے صدیوں کا نتیجہ تھے جس کا لازمی پہلو یہ نکلا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے سے قبل ہندو مسلم تنازع کا کوئی مسئلہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ مولانا آزاد کے اس Observation کی روشنی میں اگر دیگر واقعات کو دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ کانپور کے علاقے میں نانا صاحب

نے انگریزوں کی مخالفت میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ بغاوت کے اعلان کے فوراً بعد ہی نانا صاحب نے خود کو بہادر شاہ کا صوبہ دار اعلان کیا اور جو سکہ جاری کیا اس میں بہادر شاہ ظفر کا نام بھی شامل تھا اور ہجری کے علاوہ سمبت تاریخوں کا بھی خیال رکھا اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ نانا صاحب کے خاص سرکل میں عظیم اللہ خان جیسے شخص بھی تھے جنہوں نے نہ صرف ان کے پینشن کے سوال پر انگلینڈ میں ان کی وکالت کی تھی بلکہ بغاوت کے دنوں میں بھی وہ نانا صاحب کے ساتھ شانہ بشانہ جنگوں میں پیش پیش رہے اور بغاوت کے ختم ہو جانے کے بعد وہ ترائی کے علاقے میں پھرتے رہے اور بالآخر اسی علاقے میں ان کی جان بھی گئی۔

اس ضمن میں چند دیگر تاریخی حقائق کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی شہرہ آفاق جدوجہد کی کہانیاں تو ہر زبان پر ہے اور پھر ان کی شہادت کی کہانی بھی کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اتنی کمسنی میں ایک بڑے ملٹری Strategist ہونے کا ثبوت دیا لیکن یہ بات تاریخ کے صفحات میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں کہ ان کے توپ خانے Artillary کی ذمہ داری غلام غوث خاں کے ہاتھوں میں تھی اور انہوں نے اپنے فرض کو بخوبی نبھایا ٹھیک اسی طرح ان کے Cavalry کے انچارج خدا بخش تھے۔ جب انگریزوں نے جھانسی کے قلعے پر حملہ کیا تب غلام غوث اور خدا بخش قلعے کی حفاظت کرتے ہوئے چار جون 1858 کو شہید ہو گئے بعینہ اس واقعہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ رانی لکشمی بائی کی ذاتی باڈی گارڈ ایک مسلم خاتون مندار تھی۔ وہ بغاوت کے دوران میدان جنگ میں سائے کی طرح رانی کے ساتھ ساتھ رہی۔ یہ جنگ خواہ جھانسی میں ہوئی ہو یا کالپی یا گوالیار میں۔ بالآخر کوٹہ کی سرائے کی جنگ میں رانی کے ساتھ وہ بھی میدان جنگ میں جاں بحق ہوئیں۔

کانپور کے علاقے سے ایک نام اور منظر عام پر آتا ہے اور وہ ہے عزیزن کا، جو پیشے سے طوائف تھی مگر بغاوت کے دنوں میں اس نے ایک جانباز بائی کی شکل اختیار کر لی۔ جب جون 1857 میں نانا صاحب کو بٹھور کا حاکم بنایا گیا تب عزیزن نے گھوڑے پر سوار ہو کر فتح کے جلوس میں حصہ لیا۔ انہوں نے بغاوت کے دوران مردوں جیسا لباس اپنا لیا تھا اور عورتوں کا دستہ بھی بنایا تھا اور گھوم گھوم کر لوگوں کو بغاوت میں حصہ لینے کے لئے اکساتی رہیں نیز دیگر عورتوں کو ساتھ لیکر میدان جنگ میں زخمیوں کی تیمارداری کرتیں اور ان کے کھانے پینے کا سامان مہیا کراتیں۔ نانا صاحب کی شکست کے بعد عزیزن کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے انگریزوں کی اس پیش کش کو

ٹھکرا دیا کہ معافی مانگنے پر انہیں رہا کیا جا سکتا ہے لیکن عزیزن نے رہائی کی جگہ شہادت کا جام پینا پسند کیا۔

ہندو، مسلم یکجہتی کے پیش نظر یہ واقعہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ موجودہ ہریانہ کے ہانسی کے علاقے میں حکم چند جین (جو اپنے وقت کے بڑے عالم بھی تھے عاراضی اور فارسی کے ماہر جانے جاتے تھے) نے منیر بیگ کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

ان دونوں نے مل کر اپنے علاقے میں بغاوت کے دوران دلی سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص مدد نہ ملنے کے باوجود بھی انہوں نے اپنی جدو جہد جاری رکھا۔ دلی پر انگریزوں کی فتح کے بعد ہانسی کا نمبر دور نہیں تھا ہریانہ کے دونوں جیالوں کو قید کر لیا گیا اور بالآخر 19 جنوری 1858 کو انہیں پھانسی دے دی گئی لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے قصد سے حکم چند جین کو دفن کر دیا جب کہ منیر بیگ کو نذر آتش۔(1)

کچھ اسی قسم کی مثالیں اجودھیا میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہاں کے مشہور رام گڑھی مندر کے پجاری بابا رام چندر داس نے بغاوت کی شروعات کی تو وہیں کے ایک مشہور مولوی امیر علی نے ان کا ساتھ دیا اور ان دونوں نے اجودھیہ کے علاقے میں بغاوت کی مہم کی قیادت کی اور بغاوت پر جب انگریزوں نے قابو پایا تو بابا اور مولوی دونوں کو املی کے پیڑ سے لٹکا کر سزائے موت دے دی گئی۔

اجودھیا کے ہی علاقے میں شمبھو پرساد شکلا اور اچھن خاں کی مثال قابل ذکر ہے۔ یہ دونوں دوست تھے اور بغاوت کے درمیان فیض آباد کے راجہ دیبی بخش سنگھ کی فوج کی کمان سنبھالتے ہوئے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد ان دونوں کو کافی زدوکوب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔(2) ہندو، مسلم یکجہتی کی ایک اور مثال لکھنؤ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ بات عام ہے کہ 1856 میں انگریزوں نے بد نظمی کا الزام لگا کر اودھ کا الحاق اپنی ریاست کے ساتھ کر لیا اور واجد علی شاہ کو کلکتہ منتقل کر دیا۔ انگریزوں کے اس قدم سے نہ صرف نوابی خاندان بلکہ اودھ کی عوام کو بھی دلی صدمہ پہنچا تھا کیونکہ اودھ ان چند ہندوستانی ریاستوں میں سے ایک تھا جس نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی کو اپنایا اور اس کے باوجود کمپنی کو اس کے الحاق میں ذرا بھی تامل نہ ہو۔ یہ وہی علاقہ تھ جہاں سے ایک بڑی تعداد میں لوگ انگریزی فوج میں شامل ہوتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد عام لوگوں کا انگریزوں سے متنفر ہونا یقینی تھا۔

جب بغاوت کی شروعات ہوئی تو اسکی قیادت کی ذمہ داری حضرت بیگم محل نے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور اس دوران انہوں نے نہ کہ صرف ملٹری قیادت کی بہترین مثالیں پیش کی جہاں وہ بذات خود میدان جنگ میں موجود رہ کر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ انہوں نے اودھ کے عام کسانوں، غرباء اور پاسیوں کے حق کا بھی سوال اٹھایا اور یہی وجہ ہے کہ جنگ آزادی میں ان کی قیادت میں یہ بھی لوگ پیش پیش رہے اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ جب 5 جولائی 1857 کو برجیس قدر کی تخت نشینی کا اعلان ہوا تو بے شمار لوگ بارہ دری میں جمع ہو کر نئے حکمران کا نیاز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اودھ کے علاقہ کے مختلف راجاؤں نے انہیں نواب تسلیم کیا اور انکی حمایت کا وعدہ بھی کیا۔ یہ اور بات ہے کہ بدلتے حالات کے تحت انگریزوں کا پلڑا بھاری ہوتا گیا اور بالآخر بیگم حضرت محل کو نیپال میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ پھر بغاوت کے دوران انہوں نے ایک پل کو انگریزوں سے نہ تو ہاتھ ملانے کی سوچی اور نہ ہی مصلحت پسندی کا ثبوت دیا۔ لکھنو کی یہ عظیم خاتون ودھ کے عوام کے لئے آخری دم تک لڑتی رہیں۔

ہندوستان کی تاریخ عموی طور پر اور 1857 کی بغاوت کی تاریخ خصوصی طور پر شاہد ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان آنے سے قبل ہندو، مسلم رشتوں میں کوئی کشیدگی نہ تھی اور ہم ایک قوم تھے۔ ہاں یہ بات بھی صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً ریاستیں آپس میں جنگ کرتی رہتی تھیں مگر ان جنگوں میں فرقہ واریت کے عناصر ہرگز کارفرما نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں قومی اتحاد و یگانگت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس کی ایک کڑی 1857 کی جنگ آزادی بھی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قومی یکجہتی اور ہندو، مسلم باہمی رشتوں کی گرمجوشی کی مثال 1857 ء کی بغاوت یا آزادی کی پہلی جنگ سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتی۔ موجودہ ہندوستان کو مستقبل کی طرف بڑھنے کے دوران بار بار 1857 تاریخ کی طرف مڑ کر دیکھنا پڑے گا جہاں مذہب لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں حائل نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہمیں ایک دھارے میں رواں دواں ہونے کا سبق دیا ہے کہ یہی شعار ہندوستانی قومیت کی بقا کا ضامن ہے۔

سیف و قلم

”تم ہم جیسے لوگوں کو پھانسی پر لٹکا سکتے ہو، لیکن ہمارے اصولوں کو پھانسی نہیں دے سکتے۔ زندگی میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب جان بچانا عقلمندی کا کام ہوتا ہے، لیکن کئی بار ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جب جان کی پروا کیے بغیر اصولوں کے لئے جان قربان کر دی جاتی ہے ...... جان ایک پیاری چیز ہے، مگر کچھ چیزیں جان سے بھی پیاری ہوتی ہیں۔ مادرِ وطن ایسی ہی چیز ہے۔“

ہیر علی

اوّلین جنگ آزادی کا رہنما بہادر شاہ ظفر

ہندوستان میں غالباً مغلیہ عہد حکومت کے عروج وزوال کی تاریخ کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہی علامہ اقبالؔ (9 نومبر 1877 - 21 اپریل 1938) کے ذہن وفکر میں یہ شعر نظم ہوا ہوگا:

آ، تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

یوں تو علامہ اقبال کا یہ شعر پوری تاریخ اسلام کے عروج وزوال کی منہ بولتی تصویر پیش کرتا ہے مگر ماضی قریب کی روشنی میں اگر اس شعر کو سمجھنے کی سعی کی جائے تو اس میں ہندستان میں مغلیہ عہد حکومت کے عروج وارتقاء اور زوال کی تاریخ کا مکمل اور جامع عکس نظر آتا ہے اس شعر کو آپ بھی پڑھیے اور ذرا سکون کے عالم میں اس پر غور وفکر کیجیے تو شاید آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ شہنشاہ ہند محی الدین اورنگ زیب عالم گیر (3 نومبر 1618 - 3 مارچ 1707) کی رحلت کے بعد مغلیہ سلطنت کا تقریباً وہی حال ہوگیا تھا جیسا کہ دیماستھینز (Demosthenese) نے چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنس کی سلطنت کے زوال کے وقت کہا تھا کہ صرف دیوتا ہی ہماری سلطنت کو بچائے ہوئے ہیں ورنہ ہم تو اسے برباد کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

"TheGod alone preserve our empire for we on our own [illegible] doing all to destroy"

اس عظیم شہنشاہ کی وفات کے بعد سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کی نسل میں بہادر شاہ اوّل کا ایسا کمزور اور بزدل ایسا چھچھورا، عیاش محمد شاہ کا سا رنگیلا اور شاہ عالم کا ایسا نفس پرست جو عظیم مغلوں کی روایت کی تذلیل کا باعث بنیں گے اور جن کی کمزوری، نااہلی اور بدکاری کی وجہ سے دُنیا کی سب سے وسیع اور عظیم سلطنت کے مالک، لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ جائیں گے اور ایک ادنیٰ تجارتی کمپنی کے وظیفہ خوار اور دست نگر بن جائیں گے حتی کہ اپنی مرضی کے مطابق ولی عہد تک کا تقرر کرنے کا اختیار بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان کو یورپ کی ایک اُبھرتی ہوئی طاقت کا غلام بنانے کا باعث بنی جس سے خلاصی پانے کے لئے ہزاروں محبانِ وطن کو اپنی جانیں قربان کرنا پڑیں، اس کو اپنی ابتدائی شکل میں جب وہ الگ الگ تاجروں کا ایک گروہ تھی، سولہویں صدی کے آخری دن ملکہ الزبیتھ کی طرف سے مشرق میں تجارت کرنے کا فرمان ملا جس کے تحت ان تاجروں نے جاوا میں ایک تجارتی کمپنی قائم کرلی جو ہندوستان میں بھی تجارتی سرگرمیاں جاری کرنا چاہتی تھی۔ 1613ء میں ان تاجروں نے اس کمپنی کو ایک Joint Stock Company کی شکل دے دی اور اسی سال سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر سے بھی حاصل کرلی۔ کاش اس وقت اس ملک کے شہنشاہ ہندوستان جہانگیر میں وہ دوراندیشی و بصیرت ہوتی کہ وہ دیکھ سکتا کہ یہی تاجروں کا گروہ آئندہ اس کے اخلاف کو نہ صرف اپنا پنشن خوار اور رعایا بنائے گا بلکہ ان کی آزادی اور حقوق ضبط کرکے ان پر غداری کا مقدمہ بھی چلائے گا اور اس کے آخری وارث کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔

> "This Traitor rushed to cease the first possible opportunity of over-throwing and destroying the government of his benefactors " ...... " such was the return made by the traitor for the millions of pounds sterling bestowed by the English on himself and his family"

کاش جہانگیر اس طرح کی تجارتی مراعات دینے سے پہلے اپنے ایک مداح کے اس شعر کو اپنے ذہن میں رکھتا:

مخور غم گر زبان پشہ یی کمتر ہند خودرا
کہ چون فال خرابیہا زند، پیلِ دمان یینی

ابتداء میں یہ کمپنی بالِ پشہ سے بھی حقیر تھی لیکن آئندہ ہندوستان میں بربادیاں لاتے وقت وہ پیلِ دماں بن گئی اور خود اپنے محسن (Benefactor) کے وارث کو غدار اور اپنی حکومت کو برباد کرنے کے منصوبے بنانے والا قرار دینے لگی۔ بقول حافظ ؎

"ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا"

یا بقول حسرت موہانی

"جنون کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنون"

یہ جوائنٹ اسٹاک کمپنی جو آئندہ ایک دوسری تجارتی کمپنی (Association of Merchants) سے الحاق کر کے East India Company بنی، نہ صرف تجارتی حقوق کی حامل تھی بلکہ اگر India in 1858 کے مصنف آرتھر ملس (Arthur Mills) کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ حکومت برطانیہ کے مجرموں کو ہندوستان پہنچاتی رہے۔ اس کمپنی نے ہندوستان میں انگریز مجرموں کو داخل کر کے اور غالباً ان کی مدد سے اور اسی مجرمانہ ذہنیت کے تحت جو جو کارنامے انجام دیے ان سے تاریخ ہند کا ہر ادنیٰ طالب علم تک بخوبی واقف ہے۔ مختصراً 1757ء کی پلاسی کی جنگ اور اس کے بعد 1764ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد صلح نامہ الٰہ آباد کے تحت انہوں نے مغل شہنشاہ سے بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی دو لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ یا چھبیس لاکھ روپے سالانہ کے عوض حاصل کر لی لیکن اپنی مرضی کے خلاف شاہ عالم (پیدائش 1727ء۔ تخت نشینی 1769ء۔ وفات 1806ء) کے الٰہ آباد سے دہلی واپس آنے کے منصوبوں کو بہانہ بنا کر اس پنشن کو بھی پانچ سال کے بعد ختم کر دیا گیا۔ 1765ء میں ایک سال قبل تک اپنے دشمن شجاع الدولہ کے دوست بن کر اسے روہیلوں سے لڑوا دیا گیا اور اس تنگ نظر عیاش کی مدد کر کے روہیلہ طاقت کو ہمیشہ کے لئے کمزور یا ختم کر دیا گیا اور گرچہ وقتی طور پر روہیل کھنڈ کا کافی بڑا علاقہ شجاع الدولہ کو مل گیا لیکن دوسری ہی نسل میں آصف الدولہ کے ہاتھوں جہاں خود اس کی ماں کو لٹوایا گیا وہیں یہ غصب کیا ہوا علاقہ اس کٹھ پتلی حکمراں سے لے کر کمپنی راج میں شامل کر لیا گیا۔ میسور کی چوتھی لڑائی کے اختتام پر 1799ء میں مرہٹوں اور نظام کو سبز باغ دکھا کر ان کی مدد حاصل کر کے ہندوستان کے تنہا بیدار مغز، اور دور اندیش حکمراں ٹیپو سلطان کو ختم کر دیا گیا اور عظیم سلطنت خداداد کے حصے بخرے کر کے ایک چھوٹی سی ریاست میسور قائم کر دی گئی۔ 1801ء میں کرناٹک کو ہڑپ لیا گیا۔ 1802ء میں مراٹھا سردار پیشوا سے چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی اور رگھوبا کی مدد کر کے چند سال قبل تک ہندوستان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والے پیشوا کو اپنا ماتحت بنا لیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی ہلکر، سندھیا، گیکواڑ اور راجہ برار کو آرتھر ملس کے قول کے مطابق طاقت یا فریب کاری کے ذریعہ By force of fraud اپنا مطیع بنا لیا گیا اور ان کے پیروں میں Subsidiary Alliance کی زنجیر ڈال دی گئی۔ 1803ء میں دہلی کو مرہٹوں سے آزاد کرانے کے بہانے لارڈ لیک نے دوآبے میں داخل ہو کر 16 ستمبر 1803ء کو دلی پر قبضہ کر لیا اور "بگر نام کن نام نکو نامی چند" نام نہاد مغل اعظم

شہنشاہ عالم کو سندھیا کے پنجوں سے نجات دلا کر کرم خسروانہ کے تحت ایک لاکھ سے کچھ زیادہ پنشن مقرر کر دی جو سندھیا سے ملنے والی پنشن سے تقریباً ساٹھ ہزار روپے زیادہ تھی لیکن دلّی میں صرف چنگی سے حاصل ہونے والی آمدنی سے تقریباً بیس گنا کم تھی۔ اس پنشن نے ان حضرتِ ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی، صاحبقرانِ ثانی وغیرہ وغیرہ کو ''فکرِ دو عالم'' سے آزاد کر دیا اور سلطنت کے بکھیڑوں سے بے نیاز ہو کر وہ عیش و عشرت اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہوئے 19 نومبر 1806ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ شاہ عالم نے اپنی کمزوریوں کے باوجود جن میں ان کی حسن پرستی بھی شامل تھی جس کے نتیجہ میں 1787ء میں انہیں اپنی آنکھوں سے محروم اور حکومت سے معزول ہونا پڑا تھا، دو موقعوں پر آزاد فطرتی کا بھی اظہار کیا۔ پہلی مرتبہ انگریزوں کی مرضی کے خلاف وہ الٰہ آباد سے دہلی واپس آئے جس کا خمیازہ چھبیس لاکھ سالانہ پنشن کی ضبطی کی شکل میں بھگتنا پڑا اور دوسری مرتبہ انہوں نے انگریزوں کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا کہ مغل شہنشاہ، خواہ وہ نام ہی کا کیوں نہ ہو، لال قلعہ چھوڑ کر مونگیر میں اقامت اختیار کرے۔ اس طرح انہوں نے کم از کم لال قلعہ کے اندر تو اپنی آزادی برقرار رکھی اور اس مقدس جگہ کو ہندوستان کی عظمت اور آزادی کی علامت بنائے رکھا جو انگریز نہیں چاہتے تھے۔ شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی ان سے بھی زیادہ نااہل ثابت ہوئے جس کے نتیجہ میں ولی عہد کے تقرر کا حق ان سے چھن گیا۔ ان سیاسی ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں مذہبی کارروائیاں بھی شروع کر دی گئیں اور 1813ء میں Ecclasiastical Provision بھی کیا گیا جو چالیس سال کے بعد رنگ لایا۔ کمپنی کی حکمرانی کی ہوس سقوطِ دہلی پر ختم نہیں ہوئی۔ 1815ء میں نیپال سے جنگ کر کے ترائی کا علاقہ حاصل کیا گیا۔ 1826ء میں برما کے چار صوبوں پر قبضہ کیا گیا اور اسی سال چوطرمن اور سورج مل جاٹ کے ایسے مہم بازوں کی وجہ سے بھرتپور انگریزوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ 1835ء میں میسور کا انتظام سنبھال لیا گیا۔ 1841ء میں کرنول کا خاتمہ ہو گیا۔ 1843ء میں سندھ امیروں سے چھینا گیا، 1845ء تا 1848ء پنجاب پر یورشیں ہوئیں اور سکھ طاقت ختم کر کے پنجاب کو کمپنی کا غلام بنایا گیا۔ 1848ء میں راجہ ستارا کو معزول کیا گیا۔ 1853ء میں برار کو اور اس سے یک سال پہلے برما کے پیگو کے علاقہ کو انگریز حکومت میں ملایا گیا اور 7 فروری 1856ء کو اودھ کے حکمراں کو معزول کر کے اس علاقے کو کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ بظاہر یہ تمام فتوحات کمپنی کی حکومت کی وسعت کا باعث تھیں لیکن

وہی سب اس آتش فشاں کو دہکانے کا باعث ہوئیں جو 1857ء میں پھٹ گیا اور خود کمپنی کی حکومت کے خاتمے کا سبب ہوا۔

امارت (Aristocracry) کو برباد کرنے کے ساتھ کمپنی کی طرف سے عوام کے استحصال کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بنگال کے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹنے کے بعد استمراری بندوبست کی شکل میں کاشتکاروں کے پیٹ پر بھی لات ماری گئی اور ٹھیکیداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا گیا جس کا کام بیدردی کے ساتھ کسانوں کو لوٹنا اور کمپنی بہادر کی اقتصادیات کو درست کرنے میں اعانت کرنا تھا۔ پیشہ ور فوجی بھی کمپنی کی پالیسیوں کا شکار ہوئے۔ Subsidiary Alliance کے تحت دیسی ریاستوں کے ہزاروں سپاہی بیکار ہو گئے جنہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مجبوراً لوٹ مار کو پیشہ بنانا پڑا اور جنہیں تاریخ میں ٹھگ اور پنڈاری کے ناموں سے یاد کیا گیا۔

یہاں یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ کمپنی بہادر کی مذکورہ فتوحات میں ہندوستانیوں پر مشتمل فوج کا بڑا حصہ تھا۔ اس وقت ہمارا ملک سیاسی بیداری سے محروم تھا۔ لہٰذا غداری یا حب الوطنی کی بحث بیکار ہے۔ حق نمک کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور انگریزوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور خود ہندوستانیوں ہی کو اپنا نمک خوار بنا کر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ یہ تو عوام کا حال تھا۔ والیانِ ریاست کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی مفاد رہا کرتا تھا اور سوائے ٹیپو سلطان کے کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ "وہ دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا" وہ اپنی کوتاہ نظری کے باعث انگریزوں کے خطرے کو محسوس نہیں کر سکے۔ انگریز انہیں تھوڑے سے فائدہ کا سبز باغ دکھا کر ایک دوسرے سے لڑایا کرتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ "آج ان کی کل اپنی باری ہے" Ecclasiastical Provision کے بعد اہل مذہب نے البتہ یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کمپنی کے ہاتھوں ان کے مذاہب خطرے میں ہیں اور یہ جذبہ حق نمک سے بھی زیادہ طاقتور تھا اور اسی کے تحت حضرات علماء کرام نے 1858ء سے بہت پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تھی۔ سید احمد شہید اور سید امیر علی صاحب کے جہاد اسی تحریک کا حصہ تھے لیکن انگریز اس کو سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کے مقدمے کے جج، ایڈوکیٹ جنرل نے 1857ء کی تحریک کو محض "Astruggle of natives for power at place" قرار دیا۔ لیکن باغیوں نے اس مذہبی بے اطمینانی سے پورا فائدہ اٹھایا۔

یہ تھے وہ حالات اور یہ تھیں وہ کیفیتیں جو پہلی جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان میں پائے جاتے تھے اور ہندوستانیوں پر طاری تھیں۔ معزول حکمراں انگریزوں سے اس وجہ سے نالاں تھے کہ انہوں نے ان کی خاندانی حکومتیں غصب کر لی تھیں اور انہیں اسے دوبارہ حاصل کرنے کی فکر تھی اور ان کی رعایا بھی حق نمک کے طور پر ان کی مدد کے لئے آمادہ تھی جیسا کہ اودھ میں ہوا۔ بیکار فوجیوں کو اپنی ملازمتوں کی فکر تھی، بھوکے مرنے والے کسانوں اور دستکاروں کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر تھی۔ اہل مذہب کو اپنے مذاہب بچانا تھے اور ہندو اور مسلمان الگ الگ مذہبوں کے پیرو ہونے کے باوجود اس وجہ سے متحد ہو گئے تھے کہ دونوں کے مذہبوں پر Ecclasiastical Provision کے تحت برابر اور بیک وقت عیسائیت کا حملہ شروع ہوا تھا۔ یہ تمام طبقے جن کے مقاصد الگ الگ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ کمپنی کے پلان کے مطابق ہندوستانیوں کے مذاہب خطرے میں پڑ گئے تھے بہادر شاہ کے مقدمہ کی suppelmentary proceeding میں احسن اللہ خان کے بیان کے تحت یہ جملہ بھی ملتا ہے:

" It was notorious that commander in ch ef had undertaken upon himself to christianise the whole of India in two years "

ہندوستانی عوام 1851ء سے پہلے ہی انگریزوں سے متنفر ہو چکے تھے۔ جس کا منطقی نتیجہ 1857ء کی بغاوت تھی جس میں ان سبھی طبقوں نے حصہ لیا اور اس کے لئے ماحول سازگار کرنے کے لئے افواہوں کا سہارا لیا گیا لیکن بہادر شاہ کے مقدمہ کی روداد کچھ ایسا ہی ثابت کرتی ہے اور حسن عسکری، رشید قنبر، سلیمان شکوہ کے پوتے حیدر شکوہ وغیرہ کے سلسلے میں پوچھے جانے والے سوالات سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ انگریز بھی ان افواہوں سے واقف تھے جیسا کہ ایڈووکیٹ جنرل نے بہادر شاہ کے مقدمے کے فیصلے کے سلسلے میں دیئے گئے بیانات سے ظاہر ہے۔

"Few will persue these voluminous proceedings without coming to the conclusion that intrigue and conspiracy has long been at this fostering court of Delhi" I am obliged to infer that samething deeper and more powerful than the use of greased cartridges has been resorted to "
"That the conspiracy form the very commnencement, was not informed to the sepoys and did not only originate with them but had its remifications throughout the palace and city"

اس تبصرے میں صرف اتنی غلطی ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے اس سازش کا مرکز قلعہ اور شہر دہلی قرار دیا جبکہ جیسا کہ وعدہ معاف گواہ حکیم احسن اللہ کے تفصیلی بیان سے ثابت ہے کہ انگریزوں سے متنفر ہونے کے باوجود اور باوجود اس کے بہادر شاہ ہر جنگ کے موقع پر انگریزوں

کے شکست کے متمنی رہا کرتے تھے۔ 11/مئی 1857ء سے قبل نہ وہ اور نہ اہل دہلی اس یکا یک (وقت سے پہلے ہی) پھوٹ پڑنے والی بغاوت سے واقف تھے۔

بہادر شاہ ظفر (پیدائش 14 اکتوبر 1775ء۔ حکومت 1837ء تا 1857ء۔ وفات 1862ء) کو آخری مغل شاہنشاہوں میں بحیثیت انسان کے سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ لال قلعہ سے گہرا تعلق رکھنے والے ظہیر دہلوی نے انہیں نیک اور پرہیز گار قرار دیا ہے اور انگریزوں تک نے انہیں سراہا ہے۔ چنانچہ Twilight of The Mughal کا مصنف اسپیرس کا قول ہے کہ وہ آخری مغل شہنشاہوں میں سب سے بڑے ہی نہ تھے بلکہ سب سے اچھے بھی تھے۔ اسپیرس کے علاوہ ماس منکاف کی بیٹی نے اپنی تصنیف The Golden Calm میں ان کے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کیا ہے۔ وہ متعصب بھی نہ تھے اور عیسائیوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی نفرت نہ تھی۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی انہیں پسند کرتی تھی اور جب بھی ان کے حقوق ولی عہدی کو ان کے والد نے ختم کرنا چاہا آگرے کا لفٹنٹ گورنر آڑے آیا لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے اس مرنجان ومرنج، نیک دل اور درویش صفت شخص کو بقول Spears ایک سازشی باغی بنا دیا (وہ سازشی تھے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے اور انگریزوں کا سب سے مضبوط گواہ احسن اللہ خاں تک اس سے منکر تھا) بغاوت میں حصہ لینے والے معزول حکمرانوں کے برعکس ماضی قریب میں ان کا یا ان کے خاندان کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہوا تھا (اور مقدمے کے دوران انہیں اسی کے طعنے دیے گئے کہ انہوں نے اپنے محسنوں (Benefactors) کے خلاف سازش کی) لیکن ایک حساس دل رکھنے والا شاعر جس کے پیش نظر اپنے خاندان کی گزشتہ عظمت ہو اپنی بے بسی اور مجبوری کو سمجھتا تو تھا ہی اسے اس کا تو احساس تھا ہی کہ لارڈ ایلن برا کے زمانہ تک عید، بقر عید، نوروز اور سالگرہ کے مواقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کی شہنشاہی کے اعتراف کے طور پر جو نذر ملا کرتی تھی وہ بھی بند ہو چکی تھی۔ اس کو اس توہین کا تو احساس تھا ہی کہ باوجود تمام کوشش کے وہ جوان بخت کو ولی عہد نہ بنوا سکا اور مرزا فتح الملک نے انگریزوں سے جوڑ توڑ کر کے اس گری ہوئی شرط پر کہ بادشاہ ہو کر وہ لال قلعہ چھوڑ دیں گے۔ اپنی ولی عہدی منظور کرالی۔ ان حالات میں اگر وہ کمپنی سے متنفر تھا تو کیا غلط تھا۔ ان حالات میں انگریزوں کو تو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ رانی جھانسی، نانا صاحب پیشوا

کی طرح اسے ان کے خلاف خود تلوار نہ اٹھائی۔ باوجود ظاہری آسائشوں کے (جن کا دارومدار بھی بہت کچھ نذرانوں تک محدود رہ گیا تھا) اس کرب کو اس کا دل محسوس تو کرتا ہی تھا کہ وہ قفس میں اسیر ہے خواہ وہاں اسے کتنی ہی نعمتیں مل رہی ہوں۔ اس کے ثبوت میں دوسرے شواہد نہ سہی، خود اس کے اشعار تو پیش کیے ہی جا سکتے ہیں جن میں استعاراتی انداز اور کنایوں کی شکل میں انھوں نے اپنی دلی کیفیتوں کا اظہار کیا ہے اور جن میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زاد کلکتہ جو سیکھا ناپنا
(دیوان اول، صفحہ ۳۹)

ہمیں بس بس نہ سمجھاؤ، اُٹھو اے ناصحو جاؤ
پڑے ہیں ہم کسی ایسے کہ بس، اب کچھ نہیں چلتی

اے اسیرو اب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کرو گے تم نکل کر دام سے بیٹھے رہو

ٹیڑھے جو ہو کے تم سے کہیں وہ اے ظفر
بولو نہ تم کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

آخر تو پھر تیغ ستم کے وار ہمیں پر ہو دیں گے
اور کوئی ہوتا ہے گر سینہ سپر ہو لینے دو

جیسا کہ Mrs. Henry Duberly نے Suppression of Mutiny میں لکھا ہے اس عہد میں دو تین سو روپیہ میں لوگ جاسوسی کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ قلعہ اور پورے شہر دہلی میں نہ صرف جاٹ مل کے ایسے پیشہ ور جاسوس موجود تھے بلکہ مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ کے ایسے منافق بھی یہ کام انجام دے رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ بادشاہ کی چہیتی بیگم ملکہ زینت محل اپنے بیٹے کی ولی عہدی کے چکر میں انگریزوں کے ہاتھوں میں اس حد تک کھلونا بن چکی تھیں کہ انہیں کے توسط سے بخت خان کی تمام کوششوں کے باوجود بادشاہ دلی میں رکے رہے اور آخر خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انہیں جاسوسوں اور منافقوں کی طرف ظفر نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جابجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جا۔ ئے
گن گا رہے ہیں اگر یہاں جاسوس
بندہ کیا دیکھ کر نہ جائے گا

حقیقت کچھ نہ کچھ اپنی ادھر اڑتی سی پہنچی ہے
کہیں جاسوس کی ان کو خبر اڑتی سی پہنچی ہے

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

کیا یہ آخری شعر حکیم احسن اللہ خاں، مرزا الہی بخش اور ملکہ زینت محل کی طرف اشارہ نہیں کرتا؟

بلبلو دیکھو چمن میں اتنا
نہ کرو شور کہ صیاد آیا

بادشاہ کے احساسِ بے بسی کا اندازہ کچھ اس شعر سے ہو سکتا ہے:

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

وہ بے ضرر تھے لیکن پھر بھی بدگمانیوں کا شکار ہوتے رہے اور تاج زر ان کے لئے دردِ سر ہو گیا۔

شمع محفل نے کہا رو رو کے شب گلگیر سے
کیا وبال سر مرا یہ تاج زر پیدا ہوا
کہے تھی شب یہ گلگیر شمع رو رو کر
وبال سر پہ مرے تاج زر بنایا تھا

ان کے دل میں ہمیشہ ایک آزاد حکمران بننے کی خواہش رہی اور وہ جس قسم کے بادشاہ تھے اس کے مقابلے میں وہ درویش کو ہزار مرتبہ ترجیح دیتے تھے۔ ان کا یہ مشہور شعر ان کے بالکل حسب حال اور ان کے دل کی آواز ہے۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا

یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دوسروں پر ظلم کرنے والے خود ان مظلوموں سے بھی ڈرتے رہتے ہیں اور یہی کچھ کیفیت انگریزوں کی تھی۔

قفس میں مجھ کو نہ چین آیا پر فغاں سے مری
تمام رات نہ صیاد کو بھی خواب آیا

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہ بانوں کو
مرے زنجیر کی آواز نے سونے نہ دیا

یہ سب اشعار 1857ء سے بہت پہلے جب وہ دیوان اوّل مرتب کر رہے تھے کہے گئے ہیں لیکن ان سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابتدا ہی سے وہ حالات سے کس حد تک واقف تھے اور ان کے دل کی کیا کیفیت تھی اور اسی زمانے میں ان کے کہے ہوں بعض اشعار سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ گویا وہ چشم بصیرت سے آئندہ ہونے والے مقدمے میں اپنی تذلیل کے منظر بھی دیکھ رہے تھے۔

نمک چھڑکے ہے وہ کس کس مزے سے دل کے زخموں پر
مزے لیتا ہوں میں کیا کیا، ہا ہا ہا، اہا ہا ہا

مشق ستم رہی وہی اس کی کہ جب تک
ہر استخواں کو میرے نہ قط زن بنالیا

اسی ذہنی کرب اور احساس بے بسی کے تحت، جیسا کہ بادشاہ کے سکریٹری مکندر لال نے اپنی گواہی میں کہا، وہ دو سال سے کمپنی سے غیر مطمئن تھے پھر بھی یہ کہنا پورے طور سے غلط ہے کہ انہوں نے میرٹھ سے آنے والے باغیوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ وہ ابتدا میں 11 رمئی کو صبح کو آٹھ بجے تک بغاوت سے بے خبر تھے اور انگریزوں کے جاسوس جاٹ مل اور بہی خواہ احسن اللہ خاں تک نے اپنی گواہیوں میں اقرار کیا ہے کہ وہ بادشاہ اور باغی فوج کے لیڈروں کے درمیان خط و کتابت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بغاوت کی ابتدائی خبروں کو انہوں نے نہایت غیر سنجیدگی سے لیا اور وہ باغیوں سے اس بات پر کہ انہوں نے ان کا سکون درہم برہم کر دیا اس حد تک ناراض ہوئے کہ انہوں نے ان کے لئے بدمعاش کا لفظ استعمال کیا اور احسن اللہ خاں کے مشورے سے

اس روز آگرے کے لفٹنٹ گورنر کو خط لکھ کر تمام حالات سے باخبر کیا اور مدد مانگی۔ ساتھ ہی جب انہیں حالات کی نزاکت کا اندازہ ہونے لگا تو انہوں نے باغیوں اور انگریزوں میں ثالثی کی بھی کوشش کی لیکن ابتدا میں باغیوں کے دباؤ کے تحت اور خوف جان سے وہ بغاوت کی سربراہی کے لئے آمادہ ہوگئے اور اکیس توپوں کی ان کی سلامی قبول کر لی لیکن بعد کو جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ دہلی میں انگریزوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ یہ اندازہ صحیح تھا اور انقلاب کامیاب ہو چکا ہے تو بحیثیت ایک عوام کے منتخب کئے ہوئے حکمراں کے عوام کی بھلائی اور امن وامان قائم کرنے کے لئے انہوں نے زمام حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور سپاہیوں کے دباؤ کے بغیر بھی احکام صادر کرنے شروع کئے۔ Trial میں انہیں باغی اور غدار کہا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے اگر ابتدا سے غور کیا جائے تو باغی اور غدار کہلانے کا مستحق کون ہے۔ بادشاہ یا کمپنی؟ یہ صحیح ہے کہ "By force of Fraud" ملک پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن خود کمپنی کے عہدہ داروں کے رویہ سے ظاہر تھا کہ قلعہ کی حدود کے اندر اس وقت بھی بادشاہ مطلق العنان تھا۔ جام جہاں نما کی ایک خبر سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر ریزیڈنٹ ٹامس مٹکاف سوار ہو کر قلعہ آیا، ولی عہد کو تخت سلطنت پر جلوہ افروز کروایا اور ایک سوبیس اشرفیوں کی نذر پیش کی۔ کیا اس کے بعد بھی انہیں بادشاہ کے بجائے کمپنی کی رعایا سمجھنا چاہئے جیسا کہ مقدمہ کے دوران کہا گیا؟ حقیقت تو وہی ہے جسے ڈاکٹر کے۔ سی۔ یادو نے ...ی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغل بادشاہ کا نام شہنشاہ کی حیثیت سے اس وقت تک برقرار رکھا گیا جب تک اس سے انگریزوں کا فائدہ تھا۔ چنانچہ بغاوت کے قبل تک انہیں عالی جاہ بھی کہا جاتا رہا لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد انہیں کمپنی بہادر کی رعایا اور غدار قرار دیا گیا۔ اور مختلف تجاویز سے صرف نظر کرتے ہوئے انہیں ان کی رعایا کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے اور مغل شہنشاہ کے قانونی تصور (Image) کو دلوں سے مٹانے کے لئے ان کا مقدمہ لال قلعہ ہی میں پیش کیا گیا۔ انہیں حقائق کے پیش نظر نہ صرف ہندوستانی بلکہ خود بعض انگریز مصنفوں نے لکھا ہے کہ کمپنی کو ان پر مقدمہ چلانے کا حق ہی نہ تھا اس سلسلے میں F.W. Buckles نے اپنی تصنیف ThePolitical Theory of Ind an Mutiny میں (جو 1920ء میں اشاعت پذیر ہوئی) لکھا ہے کہ:

"It was the British East India Company which had rebelled against Bahadur Shah and not vice-versa."

شاید انہیں وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر این۔ کے۔ نگم اور دوسرے ہندوستانی مصنفین بادشاہ کو اس بات کا ملزم قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے کیوں مقدمہ کی حیثیت کو قبول کر لیا۔ وہ کمپنی کی رعایا نہ 11/ مئی 1857ء کے پہلے تھے اور نہ یکم اکتوبر کے بعد اس لئے کمپنی کو ان کے خلاف چارج شیٹ جاری کرنے یا مقدمہ چلانے کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔

حقیقت ہے کہ بہادر شاہ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بغاوت کی رہنمائی قبول کر لی تھی اور بہت سے وہ کاغذات جو مقدمے میں پیش ہوئے تھے ان کے دفاعی بیان کے اس حصہ کی کچھ حد تک نفی کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں میں محض قیدی کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے سامنے جو بھی کاغذات پیش کیے جاتے تھے وہ ان پر جان کے خوف سے دستخط کر دیتے تھے یا باغی جو کچھ چاہتے تھے وہ لکھ کر ان کی مہر لگا لیتے تھے۔ ان کاغذات میں بہت سے ایسے ہیں جو ان کی بیدار مغزی اور رعایا پروری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے بہت سے احکام وہ ہیں جو انہوں نے مرزا مغل یا دوسرے سرداروں کو رعایا کی فلاح و بہبود اور لٹیروں کے ساتھ سختی سے نپٹنے کے لئے جاری کئے تھے۔ 18/ جون 1857ء کو مرزا مغل کے نام اپنے ایک حکم نامے میں جو مقدمے کے دوران بطور Exhibit No 13 پیش ہوا انہوں نے کمانڈر ان چیف کو لکھا تھا کہ فوج کا کام حفاظت کرنا ہے نہ کہ لوٹنا اور برباد کرنا۔ لہٰذا فوج کے سردار اپنے سپاہیوں کو ایسی حرکتوں سے باز رکھیں۔ اس حکم نامہ کا انگریزی ترجمہ جو کورٹ کے سامنے پیش ہوا وہ یہ ہے۔

...least that yesterday an order was passed under our own special signature, on a petition from the inhabitants of the old fort, prohibiting acts of devastation against the petitioners and that this petition was then sent to you It is surprising that up to the present time no arrangement, should have been made you should not have given effect to the prohibition by sending out some cavlary. It is the business of the army to protect and not to desolate and plunder. The officers of the army will therefore immed ately restrain their men ffom the commission of these improprieties and further, as the intelligence of the approach of the enemy troops was fasle, these lawless soldiers should not now be kept in the old fort, but on the contrary, entrenchment should be constructed for them at a distance of five or six m les "

قابل غور امر یہ ہے کہ ایک ہی روز قبل پرانے قلعہ کے رہنے والوں کی عرضداشت پر مرزا مغل کو لوٹ مار روکنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس پر فوری عمل نہ ہونے کی وجہ سے مرزا مغل کو دوسرے

ہی دن سخت الفاظ میں مخاطب کیا گیا۔ بیاسی سال کی عمر میں اس قسم کے احکام بادشاہ کی بیدار مغزی اور انتظامی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں جس کا اعتراف بادشاہ کے جانی دشمن جان لارنس، چیف کمشنر پنجاب کو بھی کرنا پڑا جو ایک موقع پر لکھتا ہے:

"The papers referring to the system of the king's government exhibit in a remarkable manner the active personal share which the king himself took in the conduct of the affairs . It must be admitted that his orders were not unworthy of the situation. He did make an effort to preserve order in the city to repress rapine and murder in the village, check malversation and to restrain the excesses of the soldiery."

اس قسم کے رعایا پرور احکام کے علاوہ جن میں وہ احکام بھی شامل ہیں جن میں معمولی عوام کی عرضیوں پر ان کی حفاظت کیلئے سپاہیوں کی تعیناتی اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی (جس کا پورے طور پر نفاذ بھی ہوا) بھی شامل ہیں، ان کی دفاعی بیان کا وہ حصہ صحیح ہے جس میں انہوں نے بغاوت کے ابتدائی دور میں جب انگریزوں کا قتل ہو رہا تھا باغیوں کے ہاتھوں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ایک رحم دل، شریف الطبع، صوفی مشرب اور جذباتیت کی منزل سے گزر جانے والے بوڑھے انسان کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کسی بھی گروہ کے، خواہ وہ اس کے دشمنوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، بچوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم دے۔ کمپنی کے ایجنٹ مسٹر فریزر اور قلعہ دار مسٹر ڈگلس اور دوسرے انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے سلسلے میں خود کمپنی کے نمک حلال جاسوس جاٹ مل بخت اور سنگھ چپراسی اور غلام عباس اور حکیم احسن اللہ خاں کے بیانات سے ثابت ہے کہ بادشاہ کا نہ تو اس میں ہاتھ تھا اور نہ اسے اس کا علم ہوا۔ اس بات میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بادشاہ نے ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کی اور ان کی خواہش کے مطابق دو توپیں اور پالکیاں بھیجیں لیکن اس کے قبل ہی وہ لوگ قتل کیے جا چکے تھے۔ شہر سے قلعہ میں لائے جانے کے بعد یورپیوں کے قتل کے سلسلے میں جاسوس جاٹ مل گواہی دیتا ہے کہ سات آٹھ روز کے بعد جب وہ قلعہ گیا تو محل کے پہلے صحن میں اس نے یورپیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک باغی سپاہی نے فائر کیا جس سے بادشاہ کا ایک سپاہی مر گیا تب مجمع نے ان یورپیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے یہ بھی گواہی دی کہ بادشاہ سے قتل کی اجازت لینے کیلئے جب پہلی مرتبہ لوگ گئے تو انہیں اجازت نہیں دی گئی (اور اس حد تک حکیم احسن اللہ بھی اس سے متفق ہیں) لیکن بعد کو بسنت علی خاں نے لوگوں

کے اصرار پر بادشاہ پر یورپیوں کو باغیوں کے حوالے کر دیے جانے پر زور دیا۔ اور بادشاہ سے ملنے کے بعد بسنت علی خاں نے دیوان خاص کے پھاٹک پر آ کر اعلان کیا کہ بادشاہ نے ان لوگوں کی حوالگی کی اجازت دے دی۔ جاسوس نے یہ بھی گواہی دی کہ اس نے شہر میں سنا کہ بادشاہ یورپیوں کو بچانا چاہتا تھا لیکن فوج کے دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ Cross Examnation میں جب بادشاہ نے گواہ سے سوال کیا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ قتل کا حکم خود اس نے (یعنی بادشاہ نے) دیا تھا یا بسنت علی خاں نے اپنی طرف سے ایسا اعلان کیا تو گواہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایک دوسرے گواہ غلام عباس نے بھی شام کو پانچ چھ بجے کچھ یورپین پکڑے گئے لیکن بادشاہ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد اسے معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس یورپین مارے گئے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ احسن اللہ خاں سے اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے قتل کرنے سے روکا تھا۔ احسن اللہ خاں کے بیان میں اگر چہ کہا گیا ہے کہ خود اس کے مشورے پر بادشاہ نے پہلے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعد کو سوار فوج کے سردار گلاب شاہ اور پیدل سکندر اور رجمنٹوں کے افسروں کی خواہش کے مطابق خواجہ سرائن شیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں بادشاہ پر چھا گئے اور بسنت اور شیدی ناصر خاں قیدیوں کو گلاب شاہ کے حوالے کر دیا اور باغی سپاہیوں نے انہیں تلواروں سے قتل کر دیا۔ احسن اللہ خاں کے نزدیک اس قتل عام کے ذمہ دار سوار فوج کے رسالدار گلاب شاہ، پیدل رجمنٹوں سکندر اور رجمنٹ کے افسر، اور بادشاہ کے ملازموں میں سیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں اور شاہزادوں میں مرزا ابو بکر اور مرزا خیر سلطان (حضرت سلطان) شامل تھے۔ اور اس کے نزدیک بادشاہ اس حد تک ذمہ دار تھے کہ انہوں نے ان قیدیوں کو شاہی حرم میں نہیں چھپایا۔ کیا انگریزوں کے سب سے بڑے معتمد جاٹ مل کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یورپیوں کے قتل کے معاملے میں بادشاہ بے قصور تھے۔ وعدہ معاف گواہ احسن اللہ خاں کے بیان سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ اس حد تک ذمہ دار تھے کہ انہوں نے قیدیوں کو اندر حرم میں نہیں رکھا اور اگر وہ انہیں وہاں رکھتے تو غالباً باغی حرم میں گھس کے انہیں نہ نکالتے۔ یہ صرف ایک مفروضہ ہے۔ بادشاہ کے خواجہ سرا شیدی ناصر اور بسنت علی خاں باغی بسنت سپہ سے مل چکے تھے اور ان کے لیے حرم سے بھی قیدیوں کو نکال لانا دشوار نہ تھا، احسن اللہ خاں کے کردار کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب ظہیر دہلوی نے ان کے سامنے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ قیدی قتل

کر دیے جائیں گے اور یہ کہ انہیں (احسن اللہ کو) انہیں بچانے کی کوشش کرنا چاہیے تو احسن اللہ ٹال گئے اور ظہیر کو دُنیاداری کا یہ سبق پڑھایا کہ ایسے معاملے میں دخل اندازی موت کو دعوت دینا ہوتی ہے لیکن گواہی دیتے وقت وہ اپنی یہ بات بھول گئے جو حالات احسن اللہ خاں کے سامنے تھے وہی بہادر شاہ کے بھی سامنے تھے۔

مقدمے میں بادشاہ پر چار الزام لگائے گئے تھے : (1) برٹش گورنمنٹ کے پنشن یافتہ ہونے کے باوجود دس مئی سے یکم اکتوبر تک محمد بخت صوبیدار اور دوسرے افسروں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی۔ اس الزام کا بے بنیاد ہونا اسی بات سے ثابت ہے کہ محمد بخت خاں یکم جولائی کو دہلی پہنچے جب صحیح معنوں میں دہلی انگریزوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ دہلی میں بغاوت کے ابتدا میں میرٹھ سے آنے والی فوجوں کے ساتھ ہی ساتھ 11 رمئی 1857ء ہی کو ہو گئی تھی۔ (2) 10 رمئی اور یکم اکتوبر کے دوران بادشاہ نے مرزا مغل کو جو برطانوی رعایا تھے اور دوسرے سپاہیوں اور لوگوں کو حکومت کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کیا۔ اس الزام میں پہلے الزام سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے صرف بخت خاں کی جگہ مرزا مغل کا نام رکھ دیا ہے۔ ان دونوں الزام کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ 11 رمئی کے پہلے بادشاہ ہیں اور باغی فوجی کے لیڈروں میں ساز باز تھی لیکن جیسا کہ خود انگریز جاسوسوں اور وعدہ معاف گواہ کے بیان سے ظاہر ہے، ایسی کوئی بات نہ تھی۔ احسن اللہ خاں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ انہوں نے کچھ نہیں سنا کہ بادشاہ فوج کے افسروں سے ساز باز کرتا تھا:

I never heard that the king carried on correspondence with the native troops but he used to make anxious enquiries about the native army whenever any war took place and in as much as he was dissatisfied with the British Government, he took p[illegible]e in hearing of their defeat or reverses

مرزا مغل اور دوسرے شہز[illegible]ے باغی فوج کے دباؤ کے تحت کمانڈر انچیف اور دوسرے افسر بنائے گئے اور وہ بھی بغاوت کی ابتدا کے کئی روز کے بعد جب انگریزوں سے دہلی پوری طرح [illegible] ہو چکا تھا اور فوجیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ذمہ دار لوگوں کی ضرورت تھی۔ (3) انگریز رعایا ہونے کے باوجود بحیثیت وفادار کے اپنے فرائض کو بھلا کر 11 رمئی کو یا اس کے بعد ایک غدار کی حیثیت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور غدارانہ طور پر دلی پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے مرزا

مغل، صوبیدار محمد بخت خاں اور دوسروں کی مدد سے ریاست میں بغاوت کی اور سرکار برطانیہ کو ختم کرنے کے لئے اپنے منصوبوں کے تحت دہلی میں فوج اکٹھا کی اور انہیں انگریزوں سے لڑنے کے لئے بھیجا۔ یہ الزام بھی غلط ہے۔ باغی فوج تو کبھی خود انگریزوں کی فوج کسی بھی دستاویز سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ نے خود کوئی فوج جمع کی۔ بقول ڈاکٹر اسلم پرویز کے "کاش انہوں نے ایسا کیا ہوتا" اور اگر ایسا ہوتا تو حالات کچھ اور ہی ہوتے اور امریکہ کی جنگ آزادی کی طرح یہ ناکام بغاوت کامیاب انقلاب بن گئی ہوتی۔ بادشاہ اگر واقعی ابتدا سے بغاوت میں شامل ہوتا تو اس کیلئے کچھ انتظامات بھی کئے ہوتے۔ اس نے تو باغیوں کو اپنے سے دور رکھنے کیلئے یہاں تک کہا تھا کہ اس کے پاس انہیں دینے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک بادشاہی کے اعلان کا تعلق ہے، جیسا پہلے کہا جا چکا ہے وہ تو پہلے ہی سے بادشاہ تھا اور اس کے تاجپوشی کے موقع پر خود کمپنی کی طرف سے اسے نذر دی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ بادشاہی کے اس اعلان اور تخت نشینی سے کئی روز پہلے ہی کمپنی کا اقتدار پورے طور پر ختم ہو گیا تھا اور مکمل نراجیت کا عالم تھا۔ ان حالات میں نئی حکومت بنانا ایک اصولی بات ہے۔ چنانچہ نئے سرے سے بادشاہت قائم کر کے بہادر شاہ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ تیسرے یہ کہ کمپنی کسی بھی معاہدے کے تحت دہلی کی قانونی حکمراں نہ تھی اور اس کا دعویٰ غلط تھا کہ بہادر شاہ یا کوئی بھی دہلی والا کسی قانون کے تحت اس کی رعایا تھا جس سے وفاداری کی امید کی جاتی۔ جنگل کے قانون کے مطابق انہوں نے دہلی پر قبضہ کیا تھا اور ویسے ہی وہ وہاں سے نکال دیئے گئے تھے اور اہل دہلی نے جائز بادشاہ کی بادشاہت کی تصدیق کر دی تھی۔ تخت حکومت پر بیٹھنے کا بہادر شاہ کو ویسا ہی حق تھا جیسا ملکہ الزبتھ کو انگلینڈ کے تخت پر بیٹھنے کا۔ غداری انہوں نے نہیں کی بلکہ خود کمپنی نے کی تھی اور مسلسل کرتی رہی۔(4) 11 رمئی 1857ء یا اس کے بعد دن کے قلعہ کی حدود میں انچاس یورپیوں کے قتل میں وہ ملوث تھے۔ اور 10 رمئی تا کم اکتوبر 1857ء انہوں نے باغی سپاہیوں کو یورپین افسران کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی اور باغیوں کو اعانت دی اور دوسرے دیسی حکمرانوں کو انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرنے کے فرامین بھیجے۔ یورپیوں کو قتل کے متعلق مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ خود انگریزوں کے جاسوس اور دوسرے گواہوں کے بیانات شاہد ہیں کہ انہوں نے انہیں بچانے کی کوشش کی۔ دیسی حکمرانوں سے مدد طلب کرنے کی حقیقت احسن اللہ خاں کے بیان سے نکل جاتی ہے۔

"When the king expected aid from Persia, no effort was made to win over any of the native princes"

کاش چند مہینے کی آزادی کے دوران وہ دیسی والیان ریاست میں آزادی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ان سے مدد حاصل کرتے۔ جہاں تک یورپین افسروں کو ہلاک کرنے کی ترغیب کا سوال ہے دو سو دستاویزوں سے کہیں یہ ثابت نہیں ہے اور نہ ہندوستانی گواہوں کے بیان میں یہ کہا گیا ہے اگر افسروں سے مراد فوجی افسر ہیں تو لڑائی میں کشت و خون کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ باغیوں کو انعامات سے نوازنے کا الزام بھی غلط ہے۔ چند روز کی بغاوت کے بعد انگریزوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد آزاد حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس کے سربراہ کو اپنے فوجیوں کو سزا دینے اور نوازنے دونوں باتوں کا حق تھا۔

بہادر شاہ کا مقدمہ ایک رسمی کارروائی تھی جس کا مقصد انگریزوں کی ایمانداری اور انصاف پسندی کا پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ پہلے یہ طے ہو چکا تھا کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن ان کی کردار کشی (Character Assassination) تو ہونا ہی تھی تاکہ ان کے ہم وطنوں کے دلوں سے انکا وقار ختم ہو جائے۔ اور ان کے دل و دماغ سے ان کے خاندان مغلیہ کا فرد ہونے کے رشتے سے سلطنت کا جائز وارث ہونے کا خیال نکل جائے۔ یہ خیال عوام کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ خواہ وہ مرہٹے ہوں یا جاٹ یا روہیلے یا افغان کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ خود تخت شاہی پر بیٹھ جاتے اور وہ اپنے کام شاہی خاندان کے ہی کسی فرد کو تخت پر بٹھا کر اور سے اپنے قابو میں رکھ کر چلایا کرتے تھے۔ انگریزوں کو اسی اعتقاد اور تصور کو ختم کرنے کیلئے بہادر شاہ کو سزا دینی تھی۔ لیکن اس انصاف پسندی کا پول اس وقت کھل جاتا ہے جب شاہی خاندان کے تین افراد مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازے کے قریب لا کر ہڈسن نے گولی ماردی۔ اور اس کے بعد محض شاہی خاندان کے فرد اور لال قلعہ کے مکین ہونے کے جرم میں دوسرے شاہزادوں کو محض شبہ کی بنیاد پر بے گھر کر دیا گیا۔ کیا انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا کہ بہادر شاہ کی طرح ان سب پر مقدمہ چلایا جاتا اور جرم ثابت ہونے کے بعد ہی ان کو سزا دی جاتی۔ کیا ہڈسن کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا جرم نہ تھا اور اگر تھا تو اسے سزا کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جرم بھی ویسا ہی تھا جیسا کسی فوج کے سردار کا، بہادر شاہ اور دوسروں کا۔ ان شاہزادوں کے علاوہ سیکڑوں بے گناہوں کو دہلی

کی سڑکوں پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کیا ان پر مقدمے چلا کر یہ معلوم کیا گیا تھا کہ وہ واقعی مجرم تھے؟ بغیر مقدمے چلائے پھانسی دینے کا سلسلہ صرف دہلی، لکھنؤ، کانپور وغیرہ تک محدود نہ تھا۔ مسز ہنری ڈیوبرلی نے اپنی کتاب (Suppression of Mutiny) میں لکھا ہے کہ دہلی کے سقوط کے بعد جب وہ بمبئی سے شمالی ہند کی طرف آ رہی تھیں تو راستے ہی میں انہیں جا بجا پھانسی پر لٹکتے ہوئے لوگ نظر آئے۔ کیا ان سبھوں پر مقدمہ چلائے جانے کا آج تک کوئی ثبوت ملا۔ بہادر شاہ بیشک جنگ آزادی کے ایک سربراہ ہونے کی حیثیت سے محترم ہیں لیکن محبان وطن کی نظروں میں ان کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا اگر وہ ہمت سے کام لے کر مقدمہ کو قبول نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کی طرح انہیں بھی قتل کر دیا جاتا اور زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہونے کے بعد بیاسی سال کی عمر میں انہیں شہادت کی نعمت بھی میسر آ جاتی جو ہر مومن کی آرزو ہوا کرتی ہے اور آج وہ ایک مظلوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سرفروش مجاہد کے طور پر یاد کئے جاتے ۔

کبھی جان اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی

مناسب ہوگا اگر یہاں اس بغاوت کے اسباب پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے جس نے بہادر شاہ کی مرضی کے خلاف انہیں اس کا سربراہ اور قومی مجاہد بنا دیا۔ اسباب بغاوت ہند کا سر سید احمد خاں نے تجزیہ کیا ہے لیکن بہادر شاہ کے مقدمے کے گواہوں کے بیانات سے بھی وہ بہت حد تک واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض دیسی والیان سلطنت کے معزول سربراہوں یا ان کے بہی خواہوں نے اس بغاوت میں عملی حصہ لیا لیکن اس کا اصل سبب خود انگریز فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی بے چینی تھی۔ وہ کمپنی کے سخت خلاف ہو گئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ بیجا سختی کی جا رہی ہے۔ وہ اس پر ناراض تھے کہ انہیں چھٹیاں جتنی ملنا چاہئے نہیں ملیں۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ ان کا بھتہ موقوف کر دیا گیا۔ انہیں جہازوں پر سمندر میں بھیجا جانا بھی ناپسند تھا اور ان کے دلوں میں گزشتہ کچھ برسوں کے حالات کے پیش نظر یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ انگریز کسی بھی دیسی حکمراں کو باقی نہ رہنے دیں گے اور یہ کہ ان کے دلوں میں کسی بھی ہندوستانی کا کوئی احترام نہ تھا۔ ان تمام شکایتوں نے مئی 1857ء سے بہت پہلے ہی نفرت کی شکل اختیار کر لی تھی اور کلکتہ سے لے کر پیشاور تک تمام چھاؤنیوں میں وہ آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ مذہب خطرے میں پڑنے کے خیال نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ احسن اللہ خاں کے بیان سے پتا چلتا ہے:

دہلی اور میرٹھ کی سپاہ میں پہلے ہی سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی یہ کہ میرٹھ کی سپاہ کا تقریباً سبھی اہم چھاؤنیوں کے ہندوستانی سپاہیوں سے رابطہ تھا۔ بغاوت کے اہم لیڈروں نے افواہوں کا سہارا لے کر ملک بھر کے سپاہیوں میں بے اطمینانی پھیلا دی تھی ساتھ ہی عوام الناس کو مذہب کے نام پر بھڑ کانے میں کوئی کمی نہ رکھی، یہاں تک کہ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کمانڈر انچیف نے دو سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بھی مشہور کیا گیا تھا کہ آٹے میں ہڈیوں کا برادہ ملا کر فوجیوں کا مذہب خراب کیا جا رہا ہے سب سے آخر میں کارتوسوں میں چربی کی خبر پھیلی اور وہ وقت سے پہلے ہی بغاوت کا سبب بن گئی۔ چنانچہ 26 رفروری 1857ء کو بیرک پور کے سپاہیوں نے چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور منگل پانڈے نے میجر ہڈسن کو گولی ماردی۔ اپریل میں میرٹھ، لکھنؤ اور انبالہ میں انگریزوں کے گھر جلائے گئے اور 6 رمئی کو انگریزوں نے 85 سپاہیوں کا چربی آمیز کارتوس استعمال نہ کرنے کے جرم میں کورٹ مارشل کر دیا اور ان کی ناعاقبت اندیشی 10 رمئی 1857ء سے عام بغاوت پھیلنے کا باعث بنی۔ یہ تمام افواہیں 1857ء سے کئی سال پہلے سے گشت کر رہی تھیں۔ انگریزوں کے خلاف عوام کو بھڑ کانے کے ان کی ہمت بلند رکھنے کے لئے یہ خبر بھی عام ہوئی کہ شاہ ایران اور زار روس ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ سلیمان شکوہ کے پوتے مرزا حیدر شکوہ نے لکھنؤ سے دہلی آ کر بہادر شاہ کو بھی اس کا یقین دلایا تھا اور شاہ ایران کے نام خود ان کا لکھا ہوا یا بادشاہ کی طرف سے مرزا حیدر کا خود بادشاہ کی مہر کیا ہوا خط مرزا حیدر کے بھائی مرزا نجف کے توسط سے ایران بھیجا گیا اور جب وہاں سے جواب نہ آیا تو اودھ کی سلطنت کے خاتمے سے بھی پہلے حسن عسکری کے توسط سے شیدی قنبر کو جواب لانے کے لئے حج کے بہانے سے ایران بھیجا گیا۔ اسی زمانے میں جامع مسجد کی دیوار پر ایک پوسٹر بھی لگا ہوا پایا گیا جس میں اہل دہلی کو مطلع کیا گیا تھا کہ جلد ہی شاہ ایران ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ افواہیں صرف ایران تک محدود نہ تھیں، روسی حملے کے چرچے ہوتے تھے اور ایک عام خیال تھا کہ اگر روسیوں نے ایرانیوں کی مدد کر دی تو ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کر دیا جائے گا۔ ترکی اور فرانس سے بھی مدد کی خبریں مل رہی تھیں۔ مذہب کا معاملہ ایسا تھا کہ ہر ہندوستانی انگریزوں سے بدگمان ہو چکا تھا۔ نانا صاحب کی پنشن کا مسئلہ، اودھ کا سقوط اور رانی جھانسی کو بچہ گود لینے کی اجازت نہ ملنا اس عام بے چینی میں اضافہ کا باعث ہوئے۔ بغاوت اصل

میں ہندوستانی فوج کو کرنا تھا اور غالباً اس کے لئے کوئی خاص وقت بھی مقرر تھا جیسا کہ مختلف مقامات پر چپاتیوں کی تقسیم سے ظاہر ہے جو غالباً کسی خاص وقت پر بغاوت شروع کرنے کا شارہ تھا لیکن میرٹھ کے کورٹ مارشل نے اس چنگاری کو وقت سے پہلے ہی شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ احسن اللہ خاں کے بیان کے مطابق بغاوت کے پھوٹ پڑنے کا سبب صرف کارتوسوں کی چربی نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی بغاوت ہوتی اس لئے کہ فوج کو یقین تھا کہ اسے انصاف نہ ملے گا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ کمپنی کی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور یہ کہ اس کے خلاف لڑنے کے انگریزوں کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔ احسن اللہ خاں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے باغیوں سے روابط رکھنے والے حیدر حسن سے یہ بھی سنا کہ فوجیوں کا خیال تھا کہ اگر وہ متحد ہو جائیں گے تو جلد ہی ملک کے مالک بن جائیں گے۔

1857ء کی تحریک میں ملک کے مختلف طبقوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے حصہ لیا اور ان میں کسی قسم کا تنظیمی اتحاد نہ تھا اور یہی چیز ناکامی کا باعث بنی۔ بغاوت فوج نے شروع کی تھی لیکن فوج کے علاوہ سابق حکمران طبقہ، ملازمت پیشگان، اور طبقۂ علماء سب اس میں شریک ہو گئے تھے لیکن سب کے مقصد جدا جدا تھے۔ بغاوت تین قسم کے لیڈروں کے تحت جاری تھی۔ (1) فوجی لیڈر۔ ان میں کوئی خاص فرد لیڈری کے فرائض انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ پنچایتی فیصلوں پر سردار عمل درآمد کرتے تھے۔ ان سرداروں میں لکھنؤ میں ممو خان اور دہلی میں بخت خان پیش پیش تھے۔ (2) عوامی لیڈر۔ یہ اونچے طبقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے اور ان کے پیش نظر عموماً مذہب تھا۔ ایسے لیڈروں میں مولوی احمد اللہ شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ (3) دیسی سابق حکمران ان کے پیش نظر ذاتی مفادات تھے اور اس کے لئے وہ فوجیں تیار کر کے جدوجہد کر رہے تھے۔ پہلے دو طبقوں کے لیڈروں کو صاحب وجاہت، شخاص کی تلاش تھی چنانچہ انہوں نے دیسی حکمرانوں کو ان کی مرضی سے یا زبردستی اپنے ساتھ لیا جیسا کہ لکھنؤ اور دہلی میں ہوا۔ یہ حضرات جن پر بزرگی بزور لا دی گئی تھی آخر میں بہ رضا و رغبت بغاوت میں حصہ لینے کو تیار ہوئے اور بغاوت کی ناکامی پر سزا کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ یہ تمام گروہ انگریزوں کو ملک سے نکالنا چاہتے تو تھے لیکن ان میں نہ تو تنظیم واتحاد تھا اور نہ ہی مقصد کے تئیں یگانگت۔ جس کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ثابت ہوئی۔

انقلابِ ستاون کی تاریخ ساز خواتین

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی میں گر مردوں نے بے مثال شجاعت، ہمت اور استقلال سے کام لیتے ہوئے اپنی لازوال قربانیوں کے ذریعے ملک کو ان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی تو ان کے شانہ بشانہ ہندوستانی خواتین نے بھی کچھ کم جرأت وہمت، عزم واستقلال اور شجاعت وشہامت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اس کی جنگ آزادی میں کئی ایسے بے مثل نقوش ثبت کر گئیں جو خواتین کے لئے آج بھی مشعل راہ ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ کوئی بھی انقلاب تحریک یا جدوجہد عورتوں کی بیداری اور تعاون کے بغیر ہرگز پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اس کی مثالیں تاریخ عالم میں بھری پڑی ہیں بعینہ ہندوستان کو انگریزوں کے جبر واستبداد سے آزاد کرنے میں ہندوستان کی خواتین نے اپنی تمام تر صلاحیتیں استعمال کیں جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ خواتین نے اپنے گود کے پالوں کو آنکھوں کے سامنے تڑپتے ہوئے دیکھا، بیوگی کا غم اٹھایا، بھائیوں کو خون میں غلطاں دیکھا، خود اپنے ساتھ بہیمانہ سلوک برداشت کئے لیکن مادر وطن کی حرمت کے تحفظ کے لیے انگریزوں کے خلاف کسی بھی قسم کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کیا یوں تو بغاوتیں پہلے بھی ہوئیں لیکن وہ صرف بغاوت تک محدود رہیں اور وہ کام نہ کرسکیں جو انقلاب ستاون نے کیا۔ میرٹھ میں انقلاب ستاون یا تحریک آزادی کی پہلی آواز بلند ہوئی وجہ سور اور گائے کی چربی ملے ہوئے کارتوس کا استعمال نہ کرنا تھا اس ایک نہیں نے ان سپاہیوں کا کورٹ مارشل کروا دیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سامراجی طاقت کے زیرنگیں کام کرنے والے ہندوستانی سپاہیوں کو سپاہی بیرک کی طرف لے جا رہے تھے تو سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر عورتوں ہی نے ان ہندوستانی سپاہیوں کی تحقیر وتذلیل کی جو اپنے ہی بھائیوں کو سزا کے لئے لے جا رہے تھے چنانچہ ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں:

''ان میں کثر عورتیں تھیں جن کے ورثا محبوس تھے انھوں نے طعن وتشنیع سے

> پنکھا جھل جھل کر نائرۂ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور ان کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی ...... ان عورتوں نے مردوں کو طعنے دینے شروع کیے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہی گری کا دعویٰ کرتے ہو مگر نہایت بزدل، بے غیرت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی ہیں تم کو شرم نہیں آئی کہ تمہارے سامنے افسروں کے ہتھکڑیاں، بیڑیاں پڑ گئیں مگر تم کھڑے دیکھا کیے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ یہ لو چوڑیاں تو تم پہن لو اور ہتھیار ہم کو دے دو ہم افسروں کو چھڑا کر لاتی ہیں ان کلمات نے اشتعال طبع پیدا کیا... مردانگی کی آگ بھڑک اٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے"۔

میرٹھ کے اس واقعہ نے چہار جانب انگریزوں کے خلاف نفرت کی لہر پیدا کر دی ہر ہندوستانی انگریزوں کے اس بہیمانہ سلوک سے نجات پانے کے لئے سر وتن کی بازی لگانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا حصول آزادی کی خاطر آزادی کے متوالوں نے انگریز پولس کی لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں، کالے پانی کی صعوبتیں برداشت کیں، قید و بند کی سختیوں اور زنداں کی صعوبتوں کو جھیلا، ناروا سلوک اور آگ کے شعلوں کی نذر ہونا گوارہ کیا لیکن آزادی کے نعرہ کو، بغاوت کے علم کو ہندوستانیوں نے کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ ان روایتوں اور احکام کی بھی پاسداری نہ کی جو کہ ہندوستانی عورت کے لئے نہایت اہم ہوا کرتی ہے۔

مذہب اسلام میں پردہ کی حد درجہ اہمیت ہے لیکن جب مسلم خواتین نے ملک پر خطرات کے بادل منڈلاتے ہوئے دیکھے تو گھر کی چہار دیواری سے باہر آ کر جنگ آزادی کی تحریک میں تن من دھن سے شریک ہو گئیں یوں تو ان خواتین کی فہرست طویل ہے لیکن یہاں صرف چند جاں باز خواتین مجاہدہ کا ذکر کیا جائے گا جس میں زینت محل کا نام سر فہرست ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے کوئی بات کھل کر نہیں کرتی تھی وہ بادشاہ کے سامنے کوئی مسئلہ رکھتی بھی تھیں تو اتنی ہوشمندی سے کہ بادشاہ ان ہی کے خیالات کی تائید اپنی زبان سے کر دیتے تھے۔ زینت محل کے ہی کہنے پر بہادر شاہ ظفر نے کچھ جگہوں پر خفیہ خطوط بھیجے لیکن انھیں کہیں سے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ زینت محل نے خود عہدے داروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی انھوں نے اپنے وقت میں چاروں طرف پھیلی بے چینی کو دیکھا اور سمجھا اور اپنی تقاریر کے ذریعے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تقریر کا اثر تھا کہ آخری تاجدار مغل بادشاہ بہادر شاہ

ظفر کی رگوں میں مغلیہ خون جوش مارنے لگا اور انجام کی پروا کیے بغیر ان کے ذریعہ جنگ کا بگل بجا دیا گیا۔ بس اب کیا تھا، چہار جانب قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ میرٹھ میں مقیم ہندوستانی فوج کی چند ٹکڑیوں نے مقررہ تاریخ سے پہلے ہی بغاوت شروع کر دی۔ باغیوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا اور مغل بادشاہ ظفر کے ہندوستان کے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا لیکن سامان کی کمی اور دیگر عناصر کے سبب انہیں پسپا ہونا پڑا۔ انگریزوں نے بغاوت کو بہت بے رحمی سے کچلا اور دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا لیکن بغاوت کا جذبہ فرو نہیں ہوا اور بغاوت کی آگ دہلی سے لکھنؤ کی جانب مڑ گئی زینت محل نے اس پورے عرصہ میں اپنی فراست و فطانت کا بھرپور ثبوت پیش کیا دراصل بہادر شاہ ظفر زینت محل ہی کے سبب جنگ آزادی کی تاریخ میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ان کے متعلق کیپٹن ڈیوڈ لکھتا ہے:

"زینت محل خوب صورت اور صحت مند خاتون تھیں، تعلیم یافتہ اور دانشور تھیں"

جنگ آزادی کی اس لڑائی میں اہل دہلی نے سبز رنگ کے لباس میں ایک ضعیف خاتون کو گھوڑے پر سوار دیکھا۔ انہوں نے جہاں بھی انگریزوں کا احتجاج دیکھا، اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دلیرانہ حملے کر کے بے شمار انگریزوں کو تہ تیغ کر دیا انھوں نے مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا۔ بالآخر لیفٹننٹ جنرل ہڈسن نے سبز پوش کو گرفتار کر کے انبالہ میں اسیر کر دیا اس سبز پوش خاتون پر پروفیسر مجیب کا ڈرامہ "آزمائش" دیکھا جا سکتا ہے۔ ہڈسن اپنے ایک خط میں سبز پوش خاتون کے متعلق کچھ اس قسم کے الفاظ تحریر کرتا ہے:

"سبز پوش خاتون زبردست قوت کی مالک ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے جسم میں پانچ پانچ بہادروں کی طاقت کے برابر قوت ہے اسے تو ہندوستان کی "جون آف آرک" کہنا چاہیے"۔

جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے والی خواتین کو انگریزوں کے ہاتھوں نت نئی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے گھر کی عورتوں کو پھانسیوں کے پھندے پر لٹکا دیا گیا۔ زندہ نذر آتش کیا جانا اور عورتوں کی کھلم کھلا بے حرمتی کیا جانا تو عام تھا بلکہ حد تو یہ ہے کہ کم سن لڑکیوں کو ناقابل بیان اذیتیں پہنچائی گئیں، جس کے سبب باحیا مردوں نے مجبور ہو کر اپنی عورتوں کی عصمت بچانے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی عورتوں کو قتل کر دیا تا کہ وہ انگریزوں کے ظلم و بربریت سے

محفوظ و مامون رہیں جیسا کہ دی انڈین امپائر میں مارٹن نے ایک ہم عصر انگریز کے بیان کو نقل کیا ہے:

> ''میں نے دہلی کی گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ کل جب ایک افسر اور میں خود بیس جوانوں کے ایک دستے کو گشت کے لئے باہر گئے تو ہم نے چودہ چودہ مردہ عورتوں کو دیکھا۔ ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیئے تھے اور انہیں شالوں میں لپیٹ کر لٹا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس ڈر سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے چنگل میں گرفتار نہ ہو جائیں پھر اس نے ان کے خاوندوں کی لاشیں ہمیں دکھائیں جنہوں نے نیک ترین کام کیا اور بعد میں خودکشی کر لی''

انگریزوں کے ہاتھوں اس طرح کی بے شمار مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی ہندوستان کی جیالی بیٹیاں میدان عمل میں ڈٹ کر مقابلہ کرتی رہیں اور انھوں نے جنگ آزادی کی تحریک میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی اور وہ انکے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہیں۔

جب 1857 کے شعلے کو دہلی سے لکھنؤ کی جانب بڑھتے ہوئے واجد علی شاہ کی پردہ نشین بیگم حضرت محل نے دیکھا تو عوام کو انگریزی فوج کے ظلم وجور سے بچانے کے لئے 5 جولائی 1857ء کو اپنے نابالغ فرزند برجیس قدر کو چاندی والی بارہ دری میں تخت نشین کرا کے انگریزوں سے لڑنے کے لئے آگے کر دیا حالانکہ اودھ کا یہ تخت شاہی کانٹوں کی سیج بنا ہوا تھا لیکن انھوں نے اپنے بیٹے کے سر پر کانٹوں کا یہ تاج رکھنے کی رضامندی دے دی جب کہ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ نام تو برجیس قدر کا رہے گا مگر سارے امور خود انھیں انجام دینے ہوں گے اور ہوا بھی یہی دنیا نے دیکھ لیا کہ محل میں پردے کے اندر زندگی گذارنے والی خاتون راج ماتا بن کر انگریزوں کے خلاف اس طرح کھڑی ہو گئیں گویا کہ اس عورت کی پوری زندگی تلواروں سے کھیلتے گذری ہو۔

بیگم حضرت محل نے امور سلطنت کی انجام دہی کیلئے ایک فوجی کونسل بھی تشکیل دی۔ یہیں سے بیگم نے انگریزی سامراج سے ٹکر لینے کی ابتداء کی اور خود بیگم حضرت محل ملک کو انگریزوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد کرانے اور جام شہادت نوش کرنے کے جذبہ کے تحت پردے سے باہر نکل گئیں اور جنگ کی باگ ڈور سنبھال کر انگریزوں سے بہت دلیرانہ مقابلہ کیا انھوں نے جنگ کے میدان میں کہیں سے کمزوری کا مظاہرہ نہیں ہونے دیا ان کی دلیری کو دیکھ کر محل کی دوسری بیگمیں

حیران رہ گئیں ایک بیگم نے بادشاہ کو لکھا:

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہو تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہو گا"

حضرت محل نے محض گیارہ دن میں اس حکمت عملی سے جنگ لڑی کہ کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کا کوئی حاکم نظر نہ آتا تھا بلکہ انگریزی عملداری خواب معلوم ہونے لگی تھی چنانچہ ایک انگریز افسر سر ہنری لارنس نے لیفٹیننٹ گورنر کو لکھا

"تمام ضلعوں میں حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور روز بروز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقداروں نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں اور جنھوں نے دیہاتوں پر قبضہ کر لیا ہے۔"

بلاشبہ بیگم حضرت محل بڑے ہی عزم و حوصلہ کی خاتون تھیں انھوں نے مہادیوا میں ایسی پر اثر تقریر کی کہ ہزاروں ہندو مسلمان تلواریں اٹھا کر ملک کے لئے اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے چنانچہ برطانوی مورخ رسل لکھتا ہے:

"بیگم بڑی طاقت اور لیاقت والی عورت ہیں۔ انھوں نے پورے اودھ کو اپنے تخت نشین بیٹے کا ساتھ دینے کے لئے تیار کر لیا ہے ان کی آواز میں وہ دم ہے کہ فوجی سرداروں نے ان کے بیٹے کی وفاداری میں ساتھ نبھانے اور جان لٹوانے کی قسمیں کھا رکھی ہیں۔"

حالانکہ بیگم حضرت محل کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا کیونکہ انہیں بیک وقت دو لڑائیاں لڑنی پڑ رہی تھیں ایک محل کے باہر انگریزوں سے ور دوسرے محل کے اندر بیگموں سے، جن کا کہنا یہ تھا کہ اگر بیلی گارد کے انگریزوں کو قتل کر دیا گیا تو کلکتہ میں واجد علی شاہ اور ان کے ساتھیوں کو تہہ تیغ کر دیا جائے گا اس طرح بیگم کے سامنے طنز آمیز جملے اور مخالفت کی ایک گھنی باڑھ تھی یہی نہیں بلکہ کئی بیگموں نے تو واجد علی شاہ کو شکایتی خط بھی تحریر کیا تھا شیدا بیگم لکھتی ہیں:

"حضرت محل آپ کی محبوبہ، سرکار سے جوڑ توڑ کر کے باغیوں کی سردار بنی ہے۔ نواب محمد علی کے بہکاوے میں آ گئی ہے شورا پشتی دکھا رہی ہے دیکھئے اونٹ

کس کروٹ بیٹھے......"

لیکن ایسے ناگفتہ بہہ حالات میں بھی بیگم حضرت محل نے انگریزوں سے اس طرح جنگ کی کہ کارل مارکس کو لکھنا پڑا کہ لکھنؤ میں ایک ایک انچ زمین کی خاطر انگریزی فوج کو سخت جدو جہد کرنی پڑ رہی ہے ایک اور مورخ یوں رقمطراز ہے:

"حضرت محل اودھ کی بیگم نے ہندوستان کی جدو جہد آزادی 59-1857ء تک مجاہدین کی قیادت کی حضرت محل نے پورے اودھ کو لڑنے پر آمادہ کیا اور میدان جنگ میں انگریزوں کے مقابلے میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے"

محمدی بیگم یعنی حضرت محل نے انگریزوں کا قلع قمع کرنے کیلئے اس حکمت عملی سے کام لیا کہ اودھ کی جنگ آزادی میں تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں نے حصہ لیا چھٹ، بیگم کوٹھی، بیلی گارد، سکندر باغ، دلکشا، جلال آباد، قدم رسول اور عالم باغ میں بہت گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں تقریباً 75 ہزار سپاہیوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان آفریں کے سپرد کردی ان کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس جنگ آزادی میں انھوں نے ہندوستان کو فخر و افتخار کا موقع بھی عنایت کیا کیونکہ جس ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کے شہزادوں کو مجمع کثیر میں دہلی گیٹ پر گولی مار کر سرو تن میں جدائی کر کے بادشاہ کے سامنے سروں کو پیش کر کے بادشاہ کی تذلیل و توہین کی تھی اسی ہڈسن کو 11 مارچ 1857ء کو حضرت گنج میں بیگم کے جانباز سپاہیوں نے دھول چٹاتے ہوئے اپنے بادشاہ کی اہانت کا پورا پورا بدلہ لیا۔

25 فروری 1857ء میں گومتی کے کنارے موسیٰ باغ میں آخری جنگ ہوئی بیگم حضرت محل نے مردانہ لباس میں ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ کی قیادت کرتے ہوئے فوجیوں کا حوصلہ بڑھایا لیکن انگد تیواری، واجد علی، خورد محل اور قنوجی لال جیسے غداروں کے سبب بیگم کو شکست ہوئی بالآخر چند ساتھیوں کے ساتھ لڑتے بھڑتے جنگلوں سے ہوتے ہوئے بیگم نیپال پہنچ گئیں مہاراجہ نیپال نے انھیں پناہ دے دی بیگم کو مجبوراً پناہ لینی پڑی لیکن اس موقع پر بھی انھوں نے انتہائی حکمت عملی کا ثبوت پیش کیا یعنی حضرت محل نے انگریزوں کی گرفت سے اپنے کو بچا کر اودھ کو ذلیل ہونے سے بچا لیا انگریزوں نے بیگم کو آزادی کی ضد چھوڑ کر خاطر خواہ پنشن لے کر کلکتہ میں رہنے کا لالچ دیا مگر برطانوی حکومت کی پیشکش کو ٹھکرا کر حضرت محل نے تکلیف دہ زندگی بسر کرنا گوارہ کر لیا اور نیپال

میں ہی موت وزیست سے نبرد آزما رہیں اور وہیں سپرد خاک کی گئیں آج ان کی قبر وہاں موجود ہے حکومت نیپال کے ذریعہ بیگم کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے وہاں ایک مسجد تعمیر کردی گئی ہے۔

اودھ کی 1857 کی آخری لڑائی سکندر باغ میں ہوئی جس میں انگریزی فوج اپنی پوری طاقت کے ساتھ اودھ پر قبضہ کرنے کے لیے سرگرم عمل تھی اس موقع پر لکھنؤ کی اجریاؤں گاؤں کی اودا دیوی اپنی جان کی بازی لگا کر ایک پیڑ کی ڈال پر چھپ کر بیٹھ گئیں اور انھوں نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے انگریزوں کا سکندر باغ کے اندر داخل ہونا مشکل کردیا۔ تقریباً 35 نگریزوں کو جب اس محب وطن نے اپنی اپنی گولیوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا تو انگریز چونکے کیونکہ مرنے والوں میں کیپر اور لمیڈن جیسے جنرل بھی شامل تھے پیڑ کے نیچے جاتے ہی انگریزوں کا گولی کھا کر موت کے منھ میں پہنچنا دیکھ کر انگریزوں نے پیڑ پر بیٹھے ہوئے شخص پر نشانہ لگایا جو لال رنگ کی چست جیکٹ اور گلابی رنگ کا پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جب زخمی مجاہدہ زمیں پر آئی تو انگریز ڈرتے ہوئے اس کے قریب گئے ، قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایک عورت ہے۔ جس کے پاس دو بھری پستولیں بھی ہیں جسے اودا دیوی کے نام سے شہرت حاصل ہے اس کے علاوہ سکندر باغ کی لڑائی میں افریقی عورتوں نے بھی جنگلی بلیوں کے مثل انگریزوں سے لڑائیاں لڑی تھیں۔

بیگم حضرت محل نے جو فوجی دستہ بنایا تھا اس میں فوجی عورتوں کی قیادت ایک خاتون نے ہی کی تھی جن کا نام رحیمی تھا اس نے فوجی لباس زیب تن کر کے انھیں اپنے ہمنواؤں کو توپ کے ذریعے گولہ باری کرنا اور بندوق چلانا سکھایا تھا وہ اپنی فوج کے ہمراہ جہاں پہنچ جاتیں، انگریزوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیتیں، خود رحیمی بیگم جب تلوار چلاتیں تو انگریز سامنے سے راہ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھتے۔ ان کی تلوار میدان جنگ میں بجلی کی طرح کوندتی رہی، جب اسے انگریزوں نے گرفتار کرلیا اور معافی مانگنے کو کہا تو اس نے انگریزوں کی جانب حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور ان کی تجویز کو ٹھکرا دیا اس کی پاداش میں اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور اس نے انگریزوں کی دی ہوئی سزا کو بسروچشم ہنستے ہنستے ہوئے قبول کیا بلاشبہ سرفروشی اور حب الوطنی کی ایسی ہی مثالیں اپنی نسل کے لیے سرمایہ افتخار ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ عمل ہیں۔

قومی یکجہتی کی علمبردار اور ہند کی جیالی بیٹیوں میں جھانسی کی رانی لچھمی بائی کا نام نا محتاج تعارف نہیں جھانسی کی رانی انگریزوں سے بغاوت میں ایک ہیروئن بن کے سامنے آئیں۔ جب

4/جون 1857ء کو جھانسی میں بغاوت کی چنگاریاں بھڑکیں تو مہارانی جھی بائی کو انگریزوں نے ہر طرح کا لالچ دیا۔ حالات ناسازگار ہو چکے تھے انگریزوں سے لڑائی کرنے کے سلسلے میں رانی کے مشیروں میں تین گھنٹے تک گرما گرم بحث ہوتی رہی بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو ان فرنگیوں سے آخری وقت تک جنگ لڑی جائے گی اس سلسلے میں انھوں نے اندرونی کی بھیمہ بائی بولیا کی بھی کمک حاصل کرلی جو بظاہر باغیوں سے فاصلہ رکھتی تھیں۔ رانی نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ایسی قیامت برپا کی کہ انگریز پرچہ نویسوں کو یہ لکھنا پڑا کہ:

"رانی کے ہمراہیوں میں بے مثال اتحاد ہے"۔

رانی نے اپنے ساتھیوں میں جوش وولولہ حب وطن دلیری اور خود اعتمادی پیدا کی۔ اس نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مان پور کے راجہ مردان سنگھ سے بھی مدد مانگی اور جھانسی کی عورتوں کو انگریزوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مردوں کے دوش بدوش لڑنے کی ترغیب دی۔ اس نے نہایت شجاعت و بہادری کے ساتھ دشمنوں سے منظم جنگ کی اور آزادی کا وہ شعلہ جو عوام کے دلوں میں پوشیدہ تھا اسے شعلہ جوالہ بنایا جھانسی کی رانی کے توپ خانہ میں ایک توپ کا نام "کڑک بجلی" تھا جسے رانی کے اسلحے خانہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی درحقیقت جھانسی کی رانی کو بخوبی یہ احساس تھا میدان جنگ میں جذبہ اور اسلحہ دونوں برابر کام کرتے ہیں اسی لئے رانی نے توپیں ڈھالنے کا حکم دیا تھا انہیں آٹھ توپیں مل بھی گئی تھیں لیکن اگر رانی کو تھوڑا اور موقع مل جاتا تو جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ جھی بائی کے جیالے سپاہی عجیب عزم واستقلال کے پیکر تھے انہوں نے ہر اہم موقع اور محاذ پر مردانگی کا ثبوت دیا، دیوانوں کے مثل اصطبل کی حفاظت کی اور ایک بار جب ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو انہوں نے خود کی آگ بجھانے کو ترجیح نہ دی بلکہ اس کے بجائے وہ جلتے ہوئے کپڑوں کے ساتھ حملہ آوروں پر چڑھ دوڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں کے کپڑوں میں بھی آگ لگ گئی اور دشمن پسپا ہوئے۔

جھی بائی کالپی میں لڑیں، گوالیر انھوں نے فتح کیا لیکن انہیں وہاں سے بہت جلد نکلنا پڑا تانتیا ٹوپے نے رانی کا ساتھ دیا لیکن سرہیوروز کی تجربہ کار اور تربیت یافتہ فوج کے سامنے تانتیا ٹوپے کی غیر منظم فوج ٹھہر نہ پائی میدان جنگ میں ایک گولے سے نواب باندہ کا ہاتھ اڑ گیا جھانسی کی رانی کے سینہ پر بھی گولہ آکر لگا اور وہ میدان جنگ میں 18/جون کو جمعہ کے دن 2 بجے شہید

ہوگئیں رانی کی لاش صندل کی لکڑیوں کی چتا بنا کر نذر آتش کر دی گئی۔ اس مہم کے خاتمے پر برطانوی سپہ سالار نے سرکاری رپورٹ میں یہ الفاظ لکھے:

> ”اگرچہ وہ ایک عورت تھی لیکن باغیوں کی سب سے زیادہ بہادر اور بہترین فوجی رہنما تھی۔ باغیوں میں ایک مرد تھی۔“

لچھمی بائی کے مثل جھلکاری بائی نے بھی انگریزوں کے خلاف بے مثل جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا وہ لچھمی بائی کی فوج میں ایک ایسی خاتون تھیں جن پر جھانسی کی رانی کو مکمل اعتماد و یقین تھا جب انگریزوں نے جھانسی کا محاصرہ کر لیا اور انگریز فوجیوں کا جھانسی پر قبضہ تقریباً ہونے کو ہی تھا تو منصوبہ بند طریقے سے جھانسی کی رانی اپنے جانشین فرزند اور معاون فوجیوں کے ہمراہ 4 را پریل کو رات میں جھانسی چھوڑ کر کالپی کے لئے روانہ ہوئیں اس وقت رانی کے بھیس میں جھلکاری بائی نے فوج کی کمان سنبھالی کرنل ہیوروز نے یہی سمجھا کہ میدان جنگ میں لچھمی بائی ہی ہیں۔ جو تلوار لئے اپنی صلاحیتوں کا اس وقت تک ثبوت دیتی رہیں گی جب تک انکی جان میں جان ہے۔ وہ اس وقت تک کہ جھانسی کو بچانے کی کوشش کریں گی جب تک ان کی گولی میں گردش خون ہے لیکن انگریز فوج کی رسد نے جنرل ہیوروز کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور لچھمی بائی کو قید کر لیا گیا جو کہ جھلکاری بائی تھیں۔ انگریزوں کو جب حقیقت حال کا علم ہوا تو جنرل ہیوروز نے جھلکاری بائی کو ڈپٹتے ہوئے کہا:

> ”تم نے رانی بن کر ہم کو دھوکا دیا ہے اور لچھمی بائی کو یہاں سے فرار ہونے میں مدد کی ہے۔ تم نے ہماری فوج کی بھی جان لی ہے، میں بھی تمہاری جان لوں گا“
>
> اس کی اس بات کو سن کر جھلکاری نے انتہائی فخر سے کہا ”   مار دے گولی؟ میں حاضر ہوں، اس دوران ایک افسر نے کہا“ مجھے یہ عورت پاگل معلوم ہوتی ہے، ”جس پر جنرل ہیوروز نے جواب دیا“ اگر ہندوستان کی ایک فیصد عوتیں اس طرح پاگل ہو جائیں تو ہم انگریزوں کو سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے چلے جانا ہوگا“

جھلکاری بائی کو قید کر لیا گیا لیکن موقع ملتے ہی وہ رات کی تاریکی میں چپکے سے فرار ہو گئیں جنرل ہیوروز نے قلعہ پر حملہ بول دیا۔ وہاں بھی اس نے دیکھا کہ جھلکاری بائی جواباً انگریزوں پر گولیاں برسا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر فوج نے جھلکاری کو مارنے کے لئے پوری قوت صرف کر دی بالآخر جھلکاری بائی انگریزوں کی توپ کی زد میں آ کر راہی عدم ہو گئیں۔

1857 کی لڑائی میں معاشرہ کے ہر طبقہ کے لوگوں نے حصہ لیا خواہ امیر ہو یا کہ غریب، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ بوڑھا ہو یا جوان، شاعر ہو یا ادیب، عالم ہو یا خطیب یا پھر سماج کا متروک طبقہ ہی کیوں نہ ہو، انھیں لوگوں میں کانپور کے نزدیک قصبہ لور کی رہنے والی عزیزن بائی بھی تھیں جو بنیادی طور پر سماج کے متروک طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں وہ مشہور طوائف اور بے مثل رقاصہ تھیں رنگین مزاج افراد تو ان کے ابرو کے اشارے پر ہی ناچتے تھے لیکن عزیزن کے دل میں ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا جذبہ موجزن تھا وہ ایک سچی محب وطن تھی وہ انگریزوں کی کسی تقریب میں شریک نہ ہوتی تھیں انہیں انگریزوں سے سخت نفرت تھی جب 7/ جون 1857ء کو کانپور کے پیشوا نانا صاحب نے ایک تاریخی اعلان نامہ جاری کیا کہ تمام ہندو اور مسلمان برٹش حکمرانوں کے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں اور اپنی تحریک کو اس وقت تک جاری رکھیں جب تک ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل نہ ہو جائے تو اس اعلان سے عزیزن اس قدر متاثر ہوئیں کہ وہ عیش و آرام کی زندگی کو تج کر نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے کے ہمراہ جنگ آزادی میں مردانہ وار کود پڑیں۔ دراصل عزیزن بائی کا دل وطن کی غلامی کے کرب کا شکار تھا۔ وہ وطن کی آزادی کیلئے کچھ کر گذرنے کو بے تاب تھیں۔ اس لیے عزیزن نے انگریزوں سے لڑنے کیلئے عورتوں کی ایک بڑی فوج تیار کی جو اسلحہ اور بارود وغیرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا کام کرتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی یہی نہیں بلکہ وہ انگریزوں کے کیمپ میں بھی آتی جاتیں اور ان کے تمام راز سے ہندوستانی مجاہدین کو باخبر رکھتیں چنانچہ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے:

> ''وہ اسلحہ باندھے گھوڑے پر سوار بجلی کی طرح شہر کی گلیوں اور فوجی چھاؤنیوں میں چکر لگایا کرتی۔ کبھی وہ گلیوں میں گھوم گھوم کر بے حال اور زخمی سپاہیوں کو دودھ مٹھائی بانٹتی اور کبھی پھل بانٹتی تھی۔ کبھی زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی اسکے ساتھ ہی انگریزوں کے قلعے کی دیوار کے نیچے باغی سپاہیوں کے حوصلوں کو بڑھاتی تھی۔ وہ محاذ پر گولہ بارود اور اپنے سپاہیوں کو ناشتہ کھانا بھی پہنچاتی تھی''

عزیزن کا عاشق شمس الدین کانپور کے باغی سپاہیوں کا رہنما تھا اسے عزیزن کی راگ بھیروی سے عشق تھا وہ عزیزن کی محفل میں اکثر انقلابی منصوبے بناتا۔ وہ جب فرنگیوں کے مظالم اور بے رحمانہ قتل کے مناظر کھینچتا تو عزیزن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے وہ شیرنی کی طرح منتقمانہ جذبات سے بپھر جاتی

جب وطن پرستوں نے 10 رمئی 1857ء کو میرٹھ میں انقلاب کا بگل بجایا تو انھیں دنوں اٹاوہ کے انقلابی سرگرمیوں میں عزیزن کے بھائی اور دیگر افراد خانوادہ کو انگریزوں نے تہ تیغ کر دیا عزیزن کے لئے یہ خبر بجلی بن کر گری وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نصف شب میں شمس الدین نے جب عزیزن کو روتے ہوئے دیکھا تو وہ سکتے میں آ گیا۔ عزیزن سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے روتے ہوئے بتایا کہ فرنگیوں نے ہمارے تمام اعزہ واقرباء کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا ہے انقلابیوں نے میرٹھ، دلی، جھانسی، آگرہ علی گڑھ وغیرہ میں علم بغاوت بلند کر دیا ہے لیکن تم لوگ ابھی تک خاموش بیٹھے ہوئے ہو عزیزن کے آنسوؤں نے جلتے ہوئے پر گھی کا کام کیا اور 4 رجون 1857ء کو کانپور میں بغاوت کا بگل بج اٹھا انگریزوں کے تمام بنگلے نذر آتش کر دیے گئے کانپور کی تمام طوائفیں جنگ آزادی کی لڑائی میں کود پڑیں انقلابیوں کے درمیان عزیزن اسلحہ لئے گھوڑے پر آگے آگے چل رہی تھیں وہ فرنگیوں کیلئے مجسم موت بنی ہوئی تھیں وہ انقلابیوں کی ہر طرح سے مدد کر رہی تھیں عزیزن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے جب سڑکوں پر نکلتیں تو قصبہ کی پوری فضا "عزیزن کی جے" کے نعروں سے گونج اٹھتی انگریزوں کا ایک طرفدار نانک چند عزیزن کے بارے میں اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

> "ہتھیاروں سے لیس عزیزن لگاتار ادھر ادھر بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔ اکثر وہ سڑکوں پر بے حال اور زخمی باغی فوجیوں کو پھل، دودھ اور مٹھائی تقسیم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

عزیزن کی قائم کردہ بریگیڈ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کے لئے ذہن سازی کا بھی کام کرتی تھی اگر نوجوان برٹش سامراج کے خوف سے تحریک آزادی میں حصہ لینے سے کتراتے تو انہیں ایک خاص پیغام کے ساتھ "چوڑیاں" بھیج کر غیرت دلاتی اس حربے سے بزدل نوجوانوں پر خاطر خواہ اثر ہوا ان کے دلوں میں اس حربے کا نتیجہ یہ ہو کہ بزدل نوجوانوں اور منہ چھپا کر گھر میں روپوش بیٹھے ہوئے افراد کی رگ حمیت بھڑکی اور ان میں ایسا جوش وولولہ پیدا ہوا کہ لوگ ہر قسم کی قربانی کا عزم دل میں لیے ہوئے گھروں سے نکل پڑے اور نانا صاحب کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ عزیزن کے متعلق اس عہد کا ایک مورخ قلم کار لکھتا ہے:

> "عزیزن آزادی وطن کے جذبے سے اس قدر سرشار تھیں کہ ہر وقت فوجی وردی پہنے رہتی تھیں۔ اپنے فوجی ساتھیوں سے برابر رابطہ قائم رکھتی تھیں۔ ان کے سامنے ایک

ہی مقصد تھا ملک کی آزادی، مادر وطن کا برٹش سامراج کے مظالم سے چھٹکارا۔"

کانپور کے انقلابیوں کو 25 رجون 1857ء کو انگریزوں کے مقابل فتح حاصل ہوئی انقلابیوں کے سامنے انگریز سپہ سالار وھیلر نے ہتھیار ڈال دیے پناہ گزیں انگریزوں کو نانا صاحب نے الٰہ آباد روانہ کرنے کے لیے ستی چورا گھاٹ پر بھیجا انگریز کشتیوں پر بحفاظت بیٹھ بھی گئے لیکن انتقام کی آگ میں جل رہے عوام بے ستی چورا گھاٹ پر قتل عام برپا کر دیا اور گنگا کا پانی فرنگیوں کے خون سے سرخ ہو گیا نانا صاحب کو جب اس قتل عام کی اطلاع ملی تو انھوں نے آنا فانا آکر اس قتل عام کو بند کرایا لیکن اس وقت تک بے شمار انگریز واصل جہنم ہو چکے تھے۔ انگریزوں کی تقریباً 150 عورتیں اور بچے جو باقی رہ گئے تھے انھیں نانا صاحب نے بی بی گھر کی عمارت میں بحفاظت پہونچا کر عزیزن کو جیلر کی حیثیت سے متعین کر دیا عزیزن تو پہلے ہی سے انتقام کی آگ میں جل رہی تھیں کیونکہ 12 رجولائی 1857ء کو فتح پور کے انقلاب میں جو جانباز انقلابی شہید ہوئے تھے ان میں عزیزن کا عاشق شمس الدین بھی شامل تھا جذبۂ انتقام سے پھول کے مثل نازک دل پتھر سے زیادہ سخت ہو چکا تھا چنانچہ عزیزن نے نانا صاحب کے سپہ سالار پنڈت رام چندر راؤ تانتیا ٹوپے سے کہا کہ جنگ میں جب بدلہ لینے کا موقع ملے تو رحم دلی نہیں دکھانی چاہیے اس لیے "بی بی گھر" کی انگریز عورتوں کو قتل کر کے ان کی بے رحمی اور مظالم کا ہمیں انتقام لینا چاہیے کیونکہ یہ وہی عورتیں ہیں جو الہ آباد خط بھجواتیں اور جاسوسی کرتی ہیں انھوں نے ہی اپنے شوہروں کو انقلابیوں کو قتل کرنے کے لئے بندوقیں بھر بھر کر دیں تھیں لہٰذا انتقام کا جب موقع ملے تو اسے گنوانا نہیں چاہیے۔ ہمیں انھیں تہہ تیغ کر کے انگریزوں کے مظالم کا بدلہ لینا چاہئے۔ یہ سن کر تانتیا ٹوپے نے جواب دیا یہ تمام باتیں درست ہیں لیکن عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردوں کو زیب نہیں دیتا تانتیا صاحب کے اس جواب کو سن کر عزیزن نے کہا تانتیا صاحب انگریزوں نے ہماری جیسی بے گناہ عورتوں پر کبھی رحم دلی اور عفو و کرم سے کام نہیں لیا تو ہم کیوں رحم دلی سے کام لیں۔ ہم تو بدلہ لئے بغیر نہ رہیں گے یہ کہہ کر عزیزن "بی بی گھر" کی طرف چل دیں اور وہاں پر سپاہیوں کو انگریز قیدیوں کو تہ تیغ کرنے کی اجازت دے دی لیکن انھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کا خون بہانے سے انکار کر دیا تو عزیزن نے کہا تم بہادر ہو اور ان ناپاک عورتوں کے خون سے اپنی تلواروں کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تو مجھے یہ کام قصائیوں سے لینا پڑے گا بالآخر یہی ہوا جو عزیزن کا منشا تھا۔ بی بی گھر میں 150 فرنگی عورتوں اور بچوں کو عزیزن نے قتل کرادیا پھر بھی انگریزوں کے ہاتھوں ہوئے گئے ظلم و جبر کے مقابلہ بی بی گھر کا یہ واقعہ نہ کے برابر تھا۔ اس واقعہ کے بعد عزیزن کی شہرت چاردانگ پھیل گئی اس کے بعد جنرل ہیولاک کی فوج نے

پھر حملہ بول دیا اور اس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا اس حالت میں بھی عزیزن نے انقلابیوں کی بھر پور مدد کی لیکن اس عالی حوصلہ اور مضبوط عزم رکھنے والی خاتون کو دھوکہ سے ایک تاجر نے گرفتار کرادیا۔ انگریز جنرل ہیولاک نے عزیزن کے حسن پر فریفتہ ہوکر معافی مانگنے کے لیے کہا لیکن اس مجاہدہ نے معافی مانگنے سے انکار کرتے ہوئے بڑے ہی جرأت و ہمت سے کہا:

"میں صرف برطانوی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ چاہتی ہوں"

اس جرأت و دلیری کو دیکھ کر جنرل ہیولاک آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ:

"اسے گولیوں سے اڑادو" وہ چیخ پڑا اس کے حکم کے مطابق عزیزن کے پھول جیسے نازک جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل قلم کے ذریعہ دلیری اور دلاوری کی یہ خوں چکاں تاریخ ہمیں عزیزن بائی کے جاہ وجلال عزم واستقلال کے وہ مرقع دکھاتی ہے جو حسن وجمال کے تذکرے سے زیادہ دلکش ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں مظفر نگر کی رہنے والی اصغری بیگم نے بھی برطانوی حکومت سے بارہا ٹکر لی۔ آخر کار گرفتار کر لی گئیں انگریزوں نے انھیں زندہ نذر آتش کر دیا۔ ناناصاحب کی لڑکی مینا بائی اسلحہ چلانے میں ماہر تھیں وہ رانی جھانسی بائی کی طرح اچھی گھوڑ سوار بھی تھیں۔ انھوں نے گھوڑے پر بیٹھ کر انگریزوں سے جنگ کی۔ آخر گرفتار ہو گئیں معافی نہ مانگنے پر انہیں بھی زندہ جلادیا گیا۔ انوپ شہر کے تھانے پر لگے یونین جیک کو اتار کر ہرا جھنڈا لہرانے والی بھی ایک خاتون مجاہدہ ہی تھیں جس کا نام چوہان رانی تھا۔ مظفر نگر ضلع میں آشا دیوی گوجر کے ساتھ جن گیارہ خواتین کو بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے پھانسی دی ان خواتین میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھیں۔

ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کیلئے نہ جانے کتنی خواتین نے بہادری اور دلیری کے ساتھ انگریزوں سے مقابلہ کیا اور یہ سلسلہ آزادی ہند تک جاری رہا۔ آخر کار بغاوت انقلاب کی چنگاریوں میں تبدیل ہو کر انگریزوں کی جابرانہ رعونتوں، حاکمانہ سطوتوں اور نخوتوں کا خرمن رفتہ رفتہ پھونکتی رہیں حتی کہ صبح آزادی نمودار ہوئی اور ہمارا ملک بدیشی حکومت کی غلامی سے نجات پا گیا۔ ہندا ان مظلوم خواتین کی جاں فشانیوں، سرفروشیوں، قربانیوں اور بہادریوں و دلیری کا ذکر اس موقع پر بھی اشد ضروری ہے کیونکہ اس ذکر کا اعادہ کر کے آج ہم بھی عصر حاضر کی خواتین کو ملک و قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کیلئے حوصلہ اور سبق دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈ کرلب ودر

ڈنکا شاہ مولوی احمد اللہ

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
ان ہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

1857ء کی شورش جسے کوئی غدر کہتا ہے تو کوئی بغاوت اور کوئی جنگ آزادی۔ وہ بھی پہلی گویا اور بھی جنگیں ہوئیں لیکن یہ پہلی تھی ایک ایسی پہیلی ہے جس کی بوجھ ارباب فکر ونظر کو اب تک پریشان کیے ہوئے ہے۔ ذاتی اغراض ومقاصد نے قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح سیاسی اور مذہبی ملکی اور ملی مصلحتوں کے تانے بانے سے ایک ایسی شطرنج بچھادی ہے جس پر ہر مکتب فکر کے طالب علم کے لئے گنجائش ہے(1) مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو جب میرٹھ کے باغی سپاہیوں نے مئی 1857ء میں مجبور کیا کہ جہاں پناہ ان کو بھی اپنی پناہ میں لے لیں تو باغیوں کی قیادت آزادی کی سربراہی قرار پائی اور ظل الٰہی اپنی اسی خطا کی سزا میں رنگون بھیج دیے گئے جہاں 11 نومبر 1857ء میں انھوں نے قید حیات سے نجات پائی۔

(2) جنوری 1858ء تک جھانسی کی رانی لکشمی بائی اپنے لے پالک بچے کے حق کی طلب گار تھیں اور اگر ان کے مطالبات انگریزوں نے منظور کر لئے ہوتے تو فرنگیوں کی ہوا خواہ (3) رانی باغی سپاہیوں کے دوش بدوش مردانہ وار اپنی تیغ زنی کا مظاہرہ نہ کرتیں اور 17 جون 1858ء کو ایک انگریز افسر کی گولی کا نشانہ نہ بنتیں۔(4) تقریباً یہی حشر اودھ کی بیگم حضرت محل کا بھی ہوا جو اپنے اکلوتے لختِ جگر برجیس قدر کے حق کی طلب میں مہینوں برسرِ پیکار رہیں اور صلح صفائی کی تمام شرطیں متواتر ٹھکرا کے 7/اپریل 1879ء میں زندہ درگور کوہستان نیپال میں پیوند خاک ہوئیں۔(5) اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ان تینوں والیانِ ملک کی فرمانروائی اگر قبول کر لی جاتی تو کیا اسے جنگ آزادی کہا جاتا؟

ان والیان ملک اور ان کے ماتحت افراد میں اتنی سکت نہ تھی کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے

اقتدار کو للکارنے کی جرأت کرتے۔ یہ جرأت ان میں اس وقت آئی جب کسی کا گھر جلے کوئی تاپے کے مصداق خود انگریزوں کے تربیت یافتہ شمالی ہند کے سپاہی جن کے بل پر انھوں نے اپنی مکاری سے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا، اپنے مذہب کے جاگیرداری نظام اور تمدن کو خطرے میں دیکھ کر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے خونِ ناحق سے گنگا و جمنا کی وادیوں کو داغ دار کرنا شروع کر دیا۔ مرہٹہ عسکریت کے پیشوا نانا راؤ ان کے سُر میں سُر ملاتے اور ''مذہب بچاؤ'' کا نعرہ لگاتے ہوئے کانپور ستی چورا گھاٹ کے شرمناک واقعے کے بعد خونریزی اور بربریت کے مظاہرے میں ان سب سے بازی لے گئے۔ انگریزوں کی تادیبی اور انتقامی کارروائی میں جنرل نیل کی بنارس سے کانپور تک قتل و غارت گری، گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد کرنا اور انگلستان میں خاص نانا راؤ کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار انسانیت سوز مظالم کا ردعمل تھا۔(6) نومبر 1859ء تک نانا انگریزوں کی گرفت میں نہ آیا لیکن جن لفظوں میں ایک ہندوستانی معاصر صحافی نے اس کے راہِ فرار اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے:

''نانا مفسد ہر وقت بھاگنے کو تیار ہے اور جہاں راپتی کی دھارا پچھم کی طرف بہتی ہے وہیں پر نانا ملعون موجود ہے اور نانا کے ہمراہیوں کے پاس نہ روپیہ ہے نہ رسد ہے''(7)

اس عقیدت مندانہ پیرایہ بیان سے بالکل مختلف ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد اس کے حصہ میں آئی۔ برخلاف اس دورنگی کے اسی آزادی کی کشاکش میں ایک مردِ میدان ایسا بھی تھا جو انگریزوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے کے باوجود ان کے بے لاگ تعریف کا مستحق قرار پایا:

''اگر محبِ وطن کی تعریف یہ ہے کہ وہ اس آزادی کی خاطر جنگ کرتا اور جال بچھاتا ہے جس سے اسے بلا سبب محروم کیا گیا ہے تو یہ مولوی بلا شبہ ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کسی کو دغا بازی سے قتل کر کے رنگین نہیں کی اور نہ ہی کسی کو ہلاک کرنے میں کسی حیلے بہانے سے کام لیا۔ اس نے کھلے میدان میں مردانگی کے ساتھ صدق و صفائی سے ایسے لوگوں کا مقابلہ کیا جنھوں نے اس کی جنم بھومی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دلیری اور سچائی کی قدر کرنے والے خواہ کسی قوم کے ہوں اس کی یاد کو ہمیشہ عزیز رکھیں گے۔''(8) (ترجمہ میلیسن)

''یہ مولوی بڑی صلاحیتوں، ناقابلِ تسخیر ہمت، اٹل ارادے اور باغیوں میں

فنونِ حرب کا بہترین جاننے والا تھا۔(8)(ترجمہ سر تھامس سیاٹن)

تاریخ میں ہم اس مولوی کو احمد اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ شاہ کی شرکت ایک توصیفی اضافہ اس لئے ہے کہ ان کے مریدان کو صاحبِ کرامت فقیر جانتے تھے۔ قیصر التواریخ میں ان کا ابتدائی تعارف اسی کلمہ فقیر سے ہوا ہے اور بجائے "ڈنکا شاہ" کے جوان کی مقبول عام عرفیت تھی "نقار شاہ" لکھا ہے۔(9) سبب یہ ہے کہ جب وہ عوام کو بیدار کرنے اپنی تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلتے تھے تو مرید آگے آگے ڈنکا بجاتے ساتھ ہوتے تھے۔ مرقع خسروی نے ان کا واجبی تعارف قدرے تفصیل سے کیا ہے:

"حقیقت حال احمد اللہ شاہ، جرار بے مثال بظاہر صاحب کمال۔ یہ شخص، مرد سیاح وسخی، صاحبِ خلاق وسیع، خوش رو، ژولیدہ مو، ریاست شناس، فقیر لباس، پرسن چالیس یا انتالیس، یک سن و سال، صاحب حسن و جمال، رئیس زادگی بشرے سے عیاں اور شجاعت بیروں از وہم وگماں، کسی مغربی اضلاع کا رئیس زادہ تھا۔ حقیقت مولود و مسکن سے اس کے کوئی مطلع نہ ہوا۔ ابتدائے سن میں فکر بلند وہمت ارجمند سے ذوق وشوق میں آگے اپنے وطن سے نکلے۔ دس پندرہ آدمی گھوڑا مع نشان نقارہ ساتھ ایک اجلی وضع سے سیاحی دوروز دیک میں رہے۔ لوگ ہر جگہ کے فقیر ذی اعتبار شریف صورت باوقار سمجھ کر بخیال کمال اور کوئی بنظر حسن و جمال ریاست خصال گرویدہ ہو کر شرائط تعظیم وتکریم بجالاتے۔ چنانچہ پہلے اس سے اس ملک اودھ میں ابتدائے انگریزی میں وارد لکھنؤ میں ہوئے اور محنہ گھسیاری منڈی میں ٹھہرے تھے تب لوگ یہاں کے بھی رجوع ہوئے، ڈنکے کی چوٹ نقارہ فقر وکمال کا بجایا کئے۔ اعلانیہ کہتے تھے کہ انگریزوں کو غارت کرنے آیا ہوں۔ ہنومان گڑھی کھودنے جاتا ہوں۔ آخر جب بہت اس طرح کی بڑیں مارنے لگے تب حکام ذی انجام بدحظ ہوئے۔ شہر سے باہر چلے جانے کا حکم قطعی دیا۔"(10)

اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن کاشف حال، زبان اور بیان کے لطف سے خالی نہیں اور وہ حوالہ ہی کیا جو راوی کی روایت کو نچوڑتے ہوئے خلاصہ میں اصل عبارت کی روح کو مجروح کردے۔ آنے والی سطروں میں اچھے تذکرہ نگاروں کی

پیروی کو برقرار رکھا ہے۔

1856ء میں واجد علی شاہ کو تخت و تاج سے محروم کرنا نہ صرف گومتی اور گھاگھرا کی وادی بلکہ گنگ و جمن کی تاریخ میں بھی ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ واجد علی شاہ کو سلطنت جانے کا جتنا قلق تھا عام ہندوستانیوں کو شاید ان سے زیادہ اس کا افسوس تھا۔ صرف باشندگان اودھ کا کیا ذکر کتنے ہی بندگان خدا اپنی روٹی روزی اور حاجت روائی کی خاطر اسی آستانے پر تکیہ کیے ہوئے بیٹھے تھے اور گر واجد علی شاہ کا بیان درست ہے تو صرف ان کے عہد میں دس ہزار افراد نے انگریزی اور دوسری ریاستوں کی سکونت ترک کر کے مملکت اودھ میں بود و باش اختیار کی تھی۔(11) ان سب کی آس پر اوس پڑتی دیکھ کر 1855ء سے ہی ایسی خفیہ تحریکیں کلبلانے لگی تھیں کہ اس آئی کو کیسے ٹالا جائے۔(12) تاج لمن ملکی کا سودا سر میں سمائے احمد اللہ اسی زمانے میں لکھنؤ آئے لیکن تعجب ہے کہ مولوی سید امیر علی کے سلسلے میں ہمیں اس کی شرکت کا ذکر نہیں ملتا۔ شاید اسی واقعہ کی شہرت نے ان کو متوجہ کیا کہ لکھنؤ کو ان کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ سے فیض آباد شہر بدر کئے جانے پر احمد اللہ کے مذہبی جنون میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ انھوں نے سکندر شاہ کے لقب سے ہتھیار بند مریدوں کے ساتھ وہاں کے بازاروں میں گشت لگانا اور انگریزوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا۔ مقامی ہندوؤں کو احمد اللہ کی فتنہ انگیزی سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن انگریز جو ابھی کوئی برس دن پہلے مولوی سید امیر کا سر اُتار کے (26 صفر 1272ھ مطابق 7 نومبر 1855ء) چین سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے اس دوسرے فسادی مولوی کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ 17 فروری 1857ء کو ایک معمولی سی جھڑپ کے بعد جس میں احمد اللہ کے دس فدائیوں میں سے تین کھیت رہے، سامراجی جاہ و جلال کو ہیچ جاننے والا یہ کلمہ گو فیض آباد کی فوجی چھاؤنی میں قید کر دیا گیا۔(13) عوام اور خواص کو ورغلانے کا یہ اچھا موقع تھا کہ اب فوج میں گھس کے فوج کو بھڑکایا جائے۔ اس کا پھل پانے میں کچھ بھی دیر نہیں ہوئی۔

10 مئی 1857ء کو میرٹھ میں انگریزوں کو "مارو بھاگنے نہ پائے" کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ 30 مئی تک لکھنؤ کے اضلاع تک اس کی لہریں پہنچنے لگیں۔(14) سابق مرکزی مقام فیض آباد میں ان کا جماؤ ہوا تو 8 جون کو فیض آباد کی ٹکڑی بھی ان کی شریک ہو گئی(15) لیکن یہ باغی فوجیں بجائے دلی کا رخ کرتے کے لکھنؤ کی طرف راہی تھیں۔ فیض آباد چھاؤنی کے نامی رسالدار سید برکات احمد کی ہمراہی میں احمد اللہ بھی تھے:

"پہلے فوج نے چاہا کہ اسے اپنا افسر کریں، ہمارا سرپرست ہو لیکن اس کی باتوں سے ڈرے کہ ہندوسے بہت بیزار و نفرت رکھتا ہے۔ اکثر انتقام ہنومن گڑھی کو بھی کہتا ہے مبادا اس کی جہت سے پھر ہندو مسلمان میں صورت فساد نکلے۔ اس جہت سے افسر نہ کیا۔(16)

دھن کے پکے سپہ گری کے فن اور رموز سے بخوبی واقف احمد اللہ شاہ کو اس کا بظاہر کوئی ملال نہ تھا۔ توکلت علی اللہ وہ اپنی جانبازی اور کارگزاری سے ایک مقام کے طلبگار تھے۔ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے نواب گنج کی منزل پر:

"احمد اللہ بھی بارادۂ فاسد بادشاہت لکھنؤ فوجی باغی کے ساتھ تھا۔ افسروں سے کہنے لگا "(17)

یہ لکھنؤ کے کسی امیر کی کارستانی کا مداوا تھا جو باغی فوج کو لوٹ لینے کی غرض سے رچی گئی تھی، "بادشاہت لکھنؤ" کے مدعی کی سوجھ بوجھ سے پٹ پڑی۔ اپنے خلوص اور دانائی کی متواتر دھاک بٹھانے کے بعد پھر تو:

"یہ بنی کہ جس سے سنو وہ میاں کہے اور جسے دیکھو گویا ان کا بندہ ہے،(18)

نواب گنج بارہ بنکی سے آگے بڑھے تو منزل "سپاہ بغاوت پناہ" کی کئی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ن کے جلو میں تھیں اور سابق ناظم خان علی خان سلون غازی شاہ جہاں پوری ان کے حمایتی تھے(19)

"شاہ احمد اللہ خدا کی پناہ انتہا کا جری، خدا جانے کون آدمی بے بدل خدا ساز کراماتی، عاقل، دلاوری میں سب سے افضل جس نے ان کی حرکات و جلادت اور خرق عادات شجاعت دیکھی فرشتہ گویا سمجھا اور مرشد جان کے آگے کیا"(20)

30 جون 1857ء (3 ذیقعدہ 1273ھ) لکھنؤ کے ناکے پر(21) چنہٹ کی گھمسان لڑائی میں احمد اللہ شاہ کی دلیری اور ان کے ساتھیوں کی جانبازی کے جوہر اور کھلے۔

"ایک ایک نے دو کئے تقریباً ایک سو چالیس گورے کام آئے، سکھ تلنگی گولہ انداز وغیرہ بہت کٹ گئے، کشتوں سے راستے اٹ گئے۔"(22) بھگوڑوں کو رگیدتے ہوئے پکے پل پر بین مچھی بھون کے نیچے آپہنچے۔ "چیف کمشنر

بہادر" (سر ہنری لارنس) کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ بیلی گارد کے دروازے کے سامنے کھڑے ہیں اور پوچھتے ہیں "پھاٹک کا موقع (موکھ) کہاں ہے؟" (23)
ایسے ہنگام کارزار میں کچھ مشکل نہ تھا کہ بیلی گارد میں داخل ہو جائے لیکن احمد اللہ شاہ کا پیر زخمی ہوا تارے والی کوٹھی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ (24)

انگریزوں کو اپنے وسیع مسائل کے باوصف جب جب کسی دیسی ریاست پر لشکر کشی کی ضرورت پیش آئی دوسری، تحت ریاستوں کو لوٹ کے فوج اور اسباب جنگ مہیا کیے۔ احمد اللہ فقیر کے پاس سوائے ہمت حوصلے اور جوش ایمانی کے تھا ہی کیا جو روئے زمین کے خطے زیر و زبر کرنے والوں سے لوہا لینے کی سوچتے۔ لیکن بقول اقبال ع:

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

کرشمۂ قدرت سے ایک کثیر تربیت یافتہ فوج جو سرکاری خزانے لوٹ کے اور بھی ڈھیٹ ہوگئی تھی ان کی تابع تھی اور لکھنؤ کے رئیسوں کا تسوں انگریز دوستی اور بے فکری نہ جفاکش گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے سلاطین دکن کے نام لیوا (25) کو پسند تھی نہ انگریزوں کے خلاف صف آرا فوجیوں کو۔ (26) احمد اللہ فقیر دعویدار تاج دسری کی شہ پر علی نقی خاں "وزیر بدتدبیر" کا محل وہ پہلا گھر تھا جو لٹیروں کے مشق ستم کا نشانہ بنا (27) اور پھر 30 جون سے 5 جولائی تک چن چن کے وہ تمام گھر لٹتے رہے جن پر انگریزوں سے ساز باز کا شبہ تھا خود احمد اللہ کی نظر رئیسوں کے خاصے کے گھوڑوں اور ہتھیاروں پر تھی کہ جو چیزیں رئیسوں کی شان کہلاتی ہیں میدان جنگ میں سپاہی کی جان ہوتی ہیں۔

لقمہ بدہ دندان سگ بسوختت کی غرض سے ممکن ہے یہ مصلحت احمد اللہ شاہ کے پیش نظر رہی ہو کہ غیر مسلم اور غیر فوجی جو اُن کے مخالف تھے مال دنیا سمیت کے ان کے ہم نوا بن جائیں گے لیکن اگر ایسا تھا تو یہ انداز کار جلد ہی ترک کرنا پڑا۔ لوٹ مار کی روک تھام بھی ان ہی کو سونپی گئی۔ (29) کل سپاہ بغاوت کی ان کے آگے آنکھ میچتی تھی۔ (30) لیکن ایک جہادی مولوی کا یہ عروج شاہی خاندان کے پشتینی نمک خواروں کو کب گوارا ہو سکتا تھا:

"ان کی بساط تو چیدہ تارا کوٹھی کی الٹ دی، اسباب لوٹ لیا۔ شاہ جی کو زیر چماق کندہ رکھ کر نکال دیا، وہ ننگے پاؤں بھاگ کر رگھوناتھ امراؤ سنگھ کی پلٹن میں جا چھپ رہے" (31)

اس طوائف الملوکی کے انسداد کے لئے ارباب لشکر نے راجہ جے لال سنگھ نصرت جنگ پسر غالب جنگ کی تحریک (32) اور:

> ''شاہ جی کی مشاورت　　پر میرزا برجیس قدر بہادر شاہزادہ نابالغ حضرت سلطان عالم　　کو　　ریاست کی گدی پر لا بٹھایا　　کل سپاہ بے پناہ نے نذریں دی اور شاہ صاحب نے خیر سے دعائے خیر (سے) گود بھری۔ (33)

احمد اللہ شاہ کے اس ایثار کا حضرت محل کو بخوبی احساس تھا کہ یک جہتی میں پھوٹ ڈالنے سے باز آئے:

> ''بیگم صاحب جناب عالیہ نے فوراً بہت سے خوان اور کشتیاں مملوبہ تحائف عمدہ و بے حساب ڈالیاں سب تر بختی کی نشانیاں شاہ جی صاحب کی خدمت میں بھیجیں۔ دعوت کی تیاریاں ہوئیں۔ وہاں شاہ صاحب کے یہاں دربار عام تھا، سوار اور پیادوں اور تلنگوں اور افسروں اور حاجتمندوں کا اژدہام تھا۔ سب سمجھے کہ اب طوائف الملوکی گئی، ریاست ایک کی سیر ہوئی۔'' (34)

اودھ کی باغی فوجی ٹکڑیوں کے بجائے دلی کا رخ کرنے کے لکھنؤ گھیر کے لانا غالباً احمد اللہ شاہ کا کارنامہ تھا۔ (35) جو اس شہر کے لوگوں اور غم و غصہ سے اچھی واقفیت رکھتے تھے لیکن اس کے اضلاع کے ہندوؤں کے اپنے تبلیغی دوروں میں مطلق پروانہ کی کہ رام چندر جی کی اس گدی (36) کو برہان الملک اور ان کی اولاد نے سوا سو برس سے کچھ اوپر کیوں کر ان ہی رام چندر جی کے ماننے والوں کی رضا و رغبت سے اپنا مطیع و فرمانبردار رکھا۔ گلی گلی اور نگری نگری ڈھنڈورچی کی پکار کہ:

> ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ دلی کا، حکم میرزا برجیس قدر کا۔ ان کے دل پر یقیناً شاق گزرتی ہوگی کہ جو مسند انھوں نے اپنے لئے بچھائی تھی اس پر یک ناز پروردہ ناتجربہ کار، آشوب زمانہ سے بیگانہ ''کنہیا'' (37) براجمان ہوا۔''

قیادت کے شرف سے محروم رہنے پر یہ ممکن تھا کہ احمد اللہ شاہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے شاہان اودھ کے عیب گنوانا شروع کر دیتے لیکن بجائے اس مکروہ فعل کے جس سے کچھ حاصل ہونا محال تھا، دلی پٹنے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ''فتح اسلام'' کے نام سے اپنا ایک پیغام ہندوستانی قوم کی اطلاع کے لئے جاری کیا جس میں مشترک انگریزوں کی چالبازیوں اور تباہ و برباد کرنے کی

تاکید کے ساتھ ہندوؤں کو متوجہ کیا گیا تھا کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں وہ کیسی عزت اور خوشحالی اور زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ دوراندیشی ہندوستان میں اپنے خلیفۃ اللہ ہونے کے دعوے کے پیش نظر کی گئی تھی اور ان کو شاید امید تھی کہ وہ ایک دن شیر شاہ سوری کی تاریخ دہرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بیلی گارد کو قلعہ بند انگریزوں سے خالی کروانا ایک مہم تھی جس کا سلسلہ پہلی جولائی سے 22 نومبر 1857ء تک (39) بغیر کسی انجام تک پہنچے چلتا رہا۔ 25 ستمبر 1857ء کو انگریزی فوج کی چھوٹی سی ٹکڑی محاصرہ توڑ کے اور جنرل نیل (40) جیسے خونخوار آزمودہ کار سپاہیوں کو کھو کے بیلی گارد کے اندر داخل تو ہو گئی لیکن محصور انگریزوں کو نجات دلانا تو در کنار ہندوستانی سپاہیوں کی کثرت کے پیش نظر صحیح سلامت حصار سے باہر نکلنا ان کو بھی دشوار نظر آیا۔ احمد اللہ شاہ اس زور آزمائی کے خاموش تماشائی تھے:

> ''سید برکات احمد جنرل فوج باغی . بیوگل بجتا ہوا تلنگے بم مہادیو کہتے ہوئے بیلی گارد پر چلے۔ مگر سوار و توپ خانہ خدا کے فضل سے خاص بازار سے آگے نہ بڑھا۔ شاہ جی بھی برائے سیر سوار ہو کے آئے کہنے لگے یہ دھاوا ناحق ہوتا ہے جب تک میں نہ کہوں گا۔ پیش نہ ہوگا'' (41)

یہ فوجی قواعد تقریباً روزانہ ہوتی۔ اور چند آدمی ادھر اور ادھر کے ضائع کر کے ٹائیں ٹائیں فش نتیجہ نکلتا۔ ایک دوسرے موقعہ پر:

> ''احمد اللہ شاہ فقیر نے فوج سے کہلا بھیجا کہ تم ہمارے نوکر ہو اور بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو۔ اگر بیگم حکم لڑنے کا دیتی ہیں، تنخواہ بھی وہی دیں گی۔ جواب دیا ہم سب بھوکے ہیں۔ جب تک ہمارے پیٹ کی خبر نہ لی جائے گی ہم مرنے نہ جائیں گے۔ ممو خاں یا بیگم صاحبہ خود جائیں۔'' (42)

دراصل یہ لالچ فوج کے اپنی جان عزیز رکھنے والے عہدیداروں سے روپے اینٹھنے کے ہتھکنڈے تھے۔ جنرل، کپتان اور داروغہ کہلانے والے یہ شاہی ملازم (جن میں سے بیشتر انگریزوں کے مخبر تھے) ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے جو تربیت یافتہ فوج کے بس میں نہ تھا۔ (43) ادھر فوج لکھنؤ والوں کی چندروزہ صحبت سے اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ جب بیلی گارد خالی

ہو جائے گا تو ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یہ خاطر داری چند روزہ ہے، انھیں مرنے مارنے کسی اور طرف ڈھکیل دیا جائے گا۔(44) قیصر التواریخ نے باغی فوج کی تعداد تلنگہ، سوار، توپ خانہ پچاس ہزار اور فوج شاہی مع "گنوار (دیہاتی)" ایک لاکھ پچاس ہزار پانچ سو لکھی ہے۔(45)

احمد اللہ شاہ کی طرف سے جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد بیلی گارد پر جہادی حملہ کا اعلان ہوتا (46) اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ترک کر دیا جاتا:

> "31 جولائی 1857 کو جب فوج مع احمد اللہ شاہ فقیر دھاوے کو تیار ہو کر چلی شاہ جی کے آگے نقیب بولتا جاتا تھا ڈنکا بجتا ہوا۔ جب مورچوں پر پہنچے۔ روئی کے گٹھے جابجا رکھے ان کی آڑ میں دھاوا کیا. سرکار میں دفعتاً ایک ہرکارہ خبر لایا دھاوا پیش ہو گیا۔ سب انگریز مارے گئے. دوسرا بھاگنے کی خبر لایا، یہ سنتے ہی تلاطم پڑ گیا۔"(47)

ذرا سی جیت پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے مال غنیمت پر ٹوٹ پڑنا اور نقشہ بگڑتا دیکھ کے بھاگنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں تیزی دکھانا اس فوج کا دستور بن گیا تھا جو احمد اللہ شاہ کی مدد کیلئے بھیجی جاتی تھی۔ ایک شروع کے معرکے میں:

> "چھ دن اور رات تک طرفین سے مینہ گولے اور گولیوں کا برستا رہا۔ جمعہ کے دن وقت عصر احمد اللہ شاہ نے دھاوا کیا۔ بیلی گارد کے زیر دیوار پھاٹک پر جا پہنچے. محصورین کو یقین اپنی ہلاکت کا ہو گیا گورے ہندوستانی جتنے مورچوں پر تھے کئی دن کے علی الاتصال لڑنے سے تھک گئے تھے، ہاتھ پاؤں سب کی سکت جاتی رہی تھی۔ خصوصاً میم کا حال اضطرار و سراسیمگی اس وقت کا بیان سے باہر ہے موت ہر ایک کی نظر میں پھر گئی۔ شاہ جی پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کئے کہ بس اس حملے میں سب کا کام تمام ہے مگر کسی کی جرأت قدم سے قدم بڑھانے کی نہ رہی۔"(48)

اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا۔ احمد اللہ شاہ نے اپنے کفن بردوش جیالے کسی اور دن کے لئے ذخیرہ کئے تھے۔ یہیں کٹوا دیتے تو اس وقت کون کام آتا۔ شاہی اہل کاروں نے کئی پرانے کماندار موقوف کر کے بیسیوں اپنے متوسل بھرتی کئے تھے۔(49) یہ اپنی کارگزاری دکھاتے بھی تو کیوں؟

جب ادھر رزم گاہ میں پیادے اپنی جان کی بازی لگائے منھ پر گولے کھا رہے ہوتے ان کے آقاؤں میں سے ''وہاں کوئی نہ جاتا، یہاں مسند پر بیٹھے، تکیہ لگائے پادر ہے''(50) ہوتے۔ بدوڑوں کے اس دنگل نے ''عیش باغ میں بندروں کی لڑائی دیکھی ہو(51) تو دیکھی ہو، لاش پر لاش گرتے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ انگریزوں نے انھیں جس عافیت کی زندگی کا عادی بنادیا تھا، احمد اللہ شاہ جیسے خدائی فوجداروں کی لائی ہوئی آفت مفت کی بلائے ناگہانی تھی جو سانپ کے منھ میں چھچھوندر کی طرح نہ اگلتے بنتی تھی نہ نگلتے۔ احمد اللہ شاہ ایسے ناکارہ لوگوں سے الجھ کے اپنے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کے بجائے ایسی نیک ساعت کا انتظار کرتے رہے جب میدان کارزار پھر گرم ہوا اور ان کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ملے۔

احمد اللہ شاہ کے لیے وہ نیک ساعت آئی تو سہی لیکن کب؟ جب انگریزی فوجیں گورکھوں، بھوٹیوں اور سکھوں وا پی کمک میں نئے دلی کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد لکھنؤ کے افق پر منڈلانے لگی تھیں۔ باغی فوج کی ہمت ستمبر اور نومبر 1857ء کے معرکوں کے بعد پہلے ہی پست ہو چکی تھی۔ مارچ 1858ء کی یورش پر بالکل ہی جواب دے گئی۔ لڑنے سے زیادہ لڑانا مشکل سمجھا جاتا ہے اور نظم وضبط فوج کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔(52) انگریز افسروں سے قطع نظر ''سرتاج افواج'' سید برکات احمد رسالدار کو کھو کر (53) ورلوٹ مار اور مہینوں نہتے عوام کے قتل وغارت گری نے باغی فوج کو بے تھا بنل بنادیا تھا جو کسی کے قابو میں نہ تھا۔ گوروں کی ہیبت اس پر مستزاد! لڑائی جب قیصر باغ سے ہوتی ہوئی لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پھیل گئی، خان علی خان غازی اور فیروز شاہ دلی کے شہزادے، احمد اللہ شاہ کے ہمراہ الگ الگ مورچے لے ان کے ساتھ تھے:

> ''شاہ جی گھبرا کر ہرنا کے سے فوج کو دوڑاتے تھے کسی کے پاؤں نہ ٹھہرتے تھے اور گورے کے نام سے بھاگتے تھے حالانکہ سب صاحب ہتھیار در کارزار ہندوستان دیکھے ہوئے تھے۔''(54)

27 رجب 1274ھ وقت ظہر حضرت محل نے قیصر باغ کو خیر یاد کہا اور قبل مغرب 29 رجب مطابق 16 مارچ 1858ء لکھنؤ کو۔(55) یہ درمیان کے دن پناہ کی تلاش میں پاپیادہ ایک ایک قدیم نمک خوار کے دروازے پر دستک دینے اور آزمانے میں گزارے کہ یہ کہیں انگریزوں کو اپنی خیر خواہی جتانے کی غرض سے خبر تو نہ کردیں گے۔ مگر رات کو شاہ جی کے مکان قدیم میں

رہی تھیں (56) کہ اس سے محفوظ تر جائے پناہ لکھنؤ میں اور کہیں نہیں تھی۔

"ایک کو دو اور دو کو چار کرنے" کے مشتاق بلکہ مشتاق احمد اللہ شاہ کے لئے پوری طرح سے کھل کھیلنے کا یہی موقع تھا۔ چوکھی لڑائی شروع کی، یعنی کبھی شہر کے ایک کونے پر تو کبھی دوسرے:

"30 رجب..... فوج انگریزی نے پہلے چاہا، حیدر گنج سے داخل شہر ہو، پلٹن جنگ بہادر عیش باغ سے۔ احمد اللہ شاہ سرائے معتمد الدولہ سے فوج لے کر عیش باغ میں جا پہنچا۔ خوب تلوار چلی کئی سو بھوٹیا مارا گیا۔ آخر باغ سے انھیں ہٹا دیا۔ وہ سب سمٹ کر کنار شہر آئے۔ ادھر سے فوج انگریزی آتی تھی۔ وہاں بھی شاہ جی دل کھول کر لڑے۔ فوج انگریزی کو نہر سے اس پار اترنے نہ دیا۔ شاہ جی کی طرف سے تین چار توپ بھی چلی۔ جب فوج انگریزی نے دھاوا کیا پہلے حملہ میں سوار بھاگے۔ وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ تین دن رات سے سوار ہر طرف دوڑتے رہے اور خود شاہ جی بھی فوج کو ہر طرف سے گھیر کر لاتے تھے"۔ (58)

اس گھمسان کی جنگ میں لاکھ تو تھم سو کرنے کے باوجود:

"غرہ شعبان پنجشنبہ کو گورے چوک، فرنگی محل، نخاس، کاظمین، منصور نگر تک پھیل گئے ایک مورچہ گھنٹہ بیگ کی گڑھیا پر قائم کیا مقابل درگاہ حضرت عباس شاہ جی نے ہٹ کر سعادت گنج لال کوٹھی پر مورچہ قائم کیا۔ دونوں طرف سے گولیاں برس رہی تھیں۔ اس عرصے میں گورے رعایا کے کوٹھوں سے داخل درگاہ حضرت عباس ہوئے (وہاں صدہا عورات پردہ نشین کا مجمع تھا) سب بھاگ گئے، قریب عصر شاہ جی کو دو مرید زبردستی بغلوں میں ہاتھ دے کر محبوب گنج تک پیادہ لے آئے۔ وہاں سے گھوڑے پر چڑھے تا کہ موسیٰ باغ سے لڑتے ہوئے نکلے پیچھے فوج انگریزی بھی تعاقب میں۔ قریب شام شاہ جی کسمنڈی کے نالے کے اس پار رہے ہوئے۔ فوج انگریزی پھر آئی۔ رعایا غریب جو شہر سے جاں بچا کر نکلی تھی مابین فوج انگریزی اور شاہ جی آ گئی، کچومر ہو گئی۔" (59)

شاہان اودھ صرف نام کے غازی تھے اور یہ نام نامی بھی انگریزوں کو گوارا نہ تھا۔ (60) بیگم حضرت محل کا یہ سینہ سپر غازی ان ہی انگریزوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا اپنی بیگم کے سے عزم کے

ساتھ لکھنؤ سے رخصت ہوا کہ یہ فیصلہ کن معرکہ نہ تھا زندہ رہے تو پھر ملیں گے اور آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔

خان بہادر خاں، حافظ رحمت خاں کے پوتے، اور فیروز شاہ، بہادر شاہ اول کے پر پوتے، احمد اللہ شاہ سے پہلے ہی بچھڑ چکے تھے۔ تین تفرقہ ہونے کے باوجود ان دشمن کے پکے تلوار کے دھنی سپوتوں کو ایک ہی لگن تھی کہ غاصب فرنگیوں کو کیونکر دفع کیا جائے۔ روہیل کھنڈ کو اپنی جولانگاہ بنائے احمد اللہ شاہ نے شاہجہاں پور پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے خلیفۃ اللہ اور بادشاہِ ہندوستان ہونے کے (61) اعلان کے ساتھ اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد، احمد اللہ بادشاہ (62)

اس تن بہ تقدیر بے تاج بادشاہ نے اپنے پیر محراب شاہ سے تن بہ مرگ دینے کی بیعت کی تھی۔ (63) اسے مصالحت کے بہانے گڑھی پوائین کے راجہ جگن ناتھ کی دعوت (64) کہیے یا ایفائے عہد کی گھڑی۔ 15 جون 1858ء شاہ جی نے جب وہاں پہنچنے پر گڑھی کا دروازہ بند پایا تو اپنے جنگی ہاتھی کو بے جگری سے مہمیز دی کہ دروازہ پیل کے اندر گھس جائیں۔ راجہ کے بھتیجے نرپت سنگھ (65) نے اندر سے گولی چلائی۔

احمد اللہ شاہ اور ان کے دست راست شفیع اللہ خاں، رئیس نجیب آباد وہیں ہودے کے پاس ہی ڈھیر ہو گئے۔ (66) دینداروں کے دین و ایمان کی خاطر اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر لیے سر گرداں مجاہد کا سر شاہجہاں پور کی کوتوالی پر لٹکا دیا گیا اور دھڑ نذر آتش کر کے خاک ندی میں بہا دی گئی۔ (67) فرزندان توحید میں سے یقیناً کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بجائے عبرت کے دعائے مغفرت کے ساتھ آرزومند ہوں گے کہ خدا ایسی ہی موت ان کو بھی نصیب کرے۔

تم ہی سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعل وفا فروغ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُر ضیا جبین کائنات ہے
کواکب بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

حواشی و مآخذ

Chopra, Dr. P N Who is Who of Indian Martyers, vol III, (1973)
Sen, S N : Eighteen, Fifty seven, Pub. Division, N. Delhi, (1995)
Taylor, P J.O : A Companion to the Indian Mutiry of 1857, (1997)

احسن التواریخ، منشی رام سہائے تمنا، لکھنؤ 1289ھ

قیصر التواریخ، سید کمال الدین حیدر، لکھنؤ 1896ء

مرقع خسروی، شیخ محمد عظمت علی، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، لکھنؤ 1986ء

نظارہ، ہفتہ وار، لکھنؤ ملکہ حضرت محل نمبر 1962ء

حوالہ جات

1۔ ٹیلر ص 46، 243
2۔ ایضاً ص 33

3۔ تاپتی رائے کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رودر انگشو مکھرجی، اخبار ٹیلی گراف کلکتہ 28/جولائی 2006ء

4۔ ٹیلر ص 171 اور ص 364

5۔ حضرت محل کی بہو مہتاب آرا اختر بہو بیگم کا اپنے شوہر برجیس قدر کے لئے امن اور مراعات کی خاطر سپاس نامہ بنام حکومت ہند (1891ء) اگر چہ ماں اور بیٹے دونوں کے نام سرکش باغیوں کی فہرست سے 1863ء میں ہی خارج کیے جا چکے تھے۔ (دیکھئے ٹیلر ص 365)

6۔ ٹیلر ص 40، 234
7۔ اودھ اخبار، لکھنؤ، 29/نومبر 1859ء
8۔ سین ص 357

9۔ قیصر التواریخ ص 203
10۔ مرقع خسروی ص 501

11۔ جواب بلو بک مؤلفہ واجد علی شاہ، ص 86
12۔ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات ص 51

13۔ ٹیلر ص 215
14۔ قیصر التواریخ ص 195

15۔ ٹیلر ص 120، احسن التواریخ ص 70
16۔ قیصر التواریخ ص 203

17۔ ایضاً ص 210
18۔ مرقع خسروی ص 501

19۔ ایضاً ص 494 / ایس۔ این۔ سین ص 492 کے مطابق یہ اودھ کے تعلقہ داروں کی فوج کے سربراہ تھے۔ جہت سے چوکھی کوٹھی پر یلغار کے موقع تک اپنی تندہی اور مستقل مزاجی سے نمایاں مقام

حاصل کرتے رہے (ٹیلر ص 267) لیکن آخری معرکے میں اتنی بری طرح زخمی ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے (مرقع خسروی اور قیصر التواریخ 333)۔ ایک نیام میں دو تلواروں کا رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے خان علی خان کے ہم نام خان بہادر خان کی احمد اللہ شاہ سے بالکل نہ بنی کیونکہ شاہ جی کے شاہ جہانپور کا رخ کرنے سے بہت پہلے خان بہادر خاں اس علاقہ میں جو ان کا موروثی علاقہ تھا پہلے ہی اپنے قدم جما چکے تھے۔ انھوں نے 30 مئی 857ء میں روہیل کھنڈ کی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے بریلی کو اس کا مرکز قرار دیا اور اس کے انتظام کے لئے مسلم اور غیر مسلم افراد کی ایک کمیٹی بنائی جس نے ایک برس کی مدت میں اپنی کارکردگی سے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ انگریزوں سے نبرد آزمائی جہاں کہیں بھی ہو بچی زندگی کا مقصد جانتے تھے۔ بریلی کی مئی 1858ء کی فیصلہ کن جنگ کے بعد دوسرے تارکین وطن کی طرح نیپال کی ترائی میں پناہ لی۔ خودکشی کا ارادہ تھا مگر رانا جنگ بہادر نے انصاف کی امید دلاتے ہوئے انگریزوں کے حوالے کیا۔ مقدمہ چلا جس میں بیباکی سے اپنے موقف کا اظہار کیا۔ پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مارچ 1860ء میں پھانسی دینے والوں نے بریلی کی پرانی کوتوالی پر لاش کو گھنٹہ بھر برائے عبرت تختۂ دار پر جھولنے دیا اور وارثوں کو نہ دیا کہ وہ اس پر مزار بنوائیں گے اور عرس کروائیں گے۔ بریلی جیل کی چاردیواری کے اندر دفن کئے گئے۔ (ٹیلر ص 181، قیصر التواریخ ص 360)

20۔ مرقع خسروی ص 495 21۔ قیصر التواریخ ص 212

22۔ مرقع خسروی ص 495 32۔ ایضاً ص 496

24۔ قیصر التواریخ ص 113 25۔ نظارہ، ملکہ حضرت محل نمبر ص 25

26۔ قیصر التواریخ ص 309-308 27۔ مرقع خسروی ص 497

28۔ قیصر التواریخ ص 220-92 218۔ ایضاً 224، 300، حسن التواریخ ص 76

30۔ مرقع خسروی ص 503

31۔ قیصر التواریخ ص 224۔ شاہ جی کو قابو میں رکھنے کا یہ ایک ہی مظاہرہ نہ تھا۔ کبھی ان کو یہ ان کا سرا سے فوج بھیجی جاتی اور پانچ گھنٹے کی طرفین سے گولہ باری اور گیارہ دن تک محاصرہ کرکے ان کا دانہ پانی بند کرتے پر بھی نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ کبھی شاہ جی کو جوش آتا، بر جیس قدر سے اطاعت اور بیگم سے بیعت کے طلبگار ہوتے۔ (ص 275)۔ "الغرض اسی صورت سے ہر روز گویا گھر میں لڑائی ہوا کرتی" (ص 276) اس روز روز کی جھک جھک سے تنگ آکر شاہ جی کا ارادہ تھا

کہ فیض آباد واپس چلے جائیں۔(301)

32۔ قیصر التواریخ ص225۔ باغی فوج نے پہلے تو اس راجہ کا گھر لوٹا پھر اسی کو اپنا نمائندہ بنایا کہ شاہی خاندان سے مسند نشینی کے لیے کسی معقول فرد کا انتخاب کرے۔ عہد برجیسی میں دریا آباد اور اعظم گڑھ کی علاقہ داری ٹکسال، قیدیوں کی نگہداری اور فوج کی سربراہی سب اسی راجہ کے نام تھی۔ مارچ 1858ء میں امان اور انصاف کے عام اعلان کے بعد راجہ صاحب اپنے موروثی علاقے پر قابض اور متمکن تھے کہ لکھنؤ پولیس چیف کے ایک کارندے دیبی پرشاد کی مخبری پر جو ان سے ذاتی عداوت رکھتا تھا کپتان پٹیرک آر کے بہیمانہ قتل کے سلسلے میں ماخوذ ہوئے۔ قصور صرف اتنا تھا کہ صاحب اختیار ہونے کے باوجود انھوں نے احمد اللہ شاہ اور ان کے تلنگوں کو کپتان آر کو سسکا سسکا کر گولیاں مارنے سے نہ روکا۔ پہلی اکتوبر 1859ء کو راجہ صاحب کے صدر مقام تارے والی کوٹھی کے سامنے اسی مقام پر جہاں کپتان آر کا قتل ہوا، ان کو پھانسی دی گئی۔ پھانسی کا پھندا راجہ صاحب نے خود اپنے گلے میں ڈالا اور بجائے بندوانے کریا کرم کے لاش کپتان آر کی یادگاری لاٹ کے پاس مٹی میں توپ دی گئی۔ (ٹیلر ص ۱۶۷، قیصر التواریخ ص283، 361۔360)

33۔ مرقع خسروی ص503 34۔ ایضاً ص504

35۔ قیصر التواریخ ص211

36۔ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے 1856ء کے سالانہ خطبے میں واجد علی شاہ کی معزولی کو اسی عنوان سے پیش کیا ہے۔

37۔ قیصر التواریخ ص230 38۔ ٹیلر ص134

39۔ قیصر التواریخ 291 40۔ سدرن کیجر (انگریزی)، سہ ماہی، حیدرآباد، جنوری 2001، ص82

41۔ قیصر التواریخ ص225 42۔ ایضاً ص260

43۔ ایضاً ص259، 239 44۔ ایضاً ص245

45۔ ایضاً ص244 46۔ ایضاً ص244

47۔ ایضاً ص233۔232 48۔ ایضاً ص230

49۔ ایضاً 229 50۔ ایضاً ص255

51۔ ایضاً ص224 52۔ ایضاً ص262

53۔ مرقع خسروی ص 518۔ 7۔5۔12ء / ذیقعدہ 1273ھ کو برجیس قدر کی مسند نشینی میں پیش پیش، مہینہ بھی تمام نہ ہوا تھا کہ بیلی گارد پر دھاوے کی غرض سے گھات کی تلاش میں جھلی سے جائے وقوع کا معائنہ کر رہے تھے کہ کسی قدر انداز نے آنکھ ہی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ 12 / ذی الحجہ ان کی سوئم کی مجلس میں دوسرے عمائدین شہر کے ساتھ منور الدولہ، سابق نائب سلطنت، بھی تھے اور وہیں سے جناب عالیہ کے حضور میں لے جائے گئے۔ قیصر التواریخ ص 243)۔

54۔ قیصر التواریخ ص 336

55۔ ایضاً ص 332، 336

56۔ ایضاً ص 334: گول دروازہ، لکھنؤ، کھن کھن جی کی کوٹھی کے پہلو کی تنگ گلی کی راہ سے آگے بڑھیے تو ایک شاہ دہ مکان کا دروازہ آتا ہے جس میں صحن اور دالان بھی ہے۔ 1957ء میں ہندی کے مشہور ادیب اور کتاب "غدر کے پھول" کے مؤلف امرت لال ناگر اس میں مقیم تھے اور وہی روای ہیں کہ حضرت محل نے قیصر باغ کی سکونت ترک کر کے ایک رات اسی گھر میں بسر کی تھی۔ قیاس ہے کہ یہی "شاہ جی کا مکان قدیم" رہا ہوگا۔

57۔ مرقع خسروی ص 499

58۔ قیصر التواریخ ص 343

59۔ ایضاً ص 345۔344

60۔ اقلیم سخن کے تاجدار ص 18

61۔ ٹیلر ص 215

62۔ قیصر التواریخ ص 467

63۔ نیا دور، لکھنؤ، ملکہ حضرت محل نمبر ص 28

64۔ ایضاً ص 25

65۔ ٹیلر ص 271: اگر قیصر التواریخ ص 347 کے بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ گولی کسی چمار نے ماری تھی جب بھی شاہ جی کے درجۂ شہادت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہنومان گڑھی کے واقعے میں مولوی سید امیر علی کی دعا تھی کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ مارے جائیں۔ (قیصر التواریخ ص 128) احمد اللہ شاہ کو وہی درجۂ شہادت بغیر مانگے عطا ہوا۔

66۔ ٹیلر ص 271

67۔ چوپڑا ص 4، چوپڑا اور سین نے اس واقعے کی تاریخ 5 / جون 1858ء لکھی ہے۔ اور ٹیلر نے 15 / جون جو زیادہ قابل اعتبار ہے۔

مرد مجاہد شیخ بھکاری

بات ان دنوں کی ہے جب زمینداروں کے ظلم و ستم کے تحت آدی باسی عوام بڑی بے چارگی اور کس مپرسی کی زندگی چھوٹا ناگپور میں گذار رہے تھے ایسے میں بیرونی طاقتوں نے حالات کو اور زیادہ وحشتناک بنا دیا تبدیلی مذہب کے نام پر عیسائی اور غیر عیسائی عوام کی تفریق قائم ہو گئی جرمن مشنیریز اور کیتھولک چرچ کے آپسی جھگڑوں نے بھی مذہبی عصبیت کو فروغ دیا دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و ستم نے عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا لہٰذا انہوں نے ظلم و ستم کے خلاف چھوٹی موٹی لڑائیاں 1857ء کے پہلے ہی شروع کر دی تھیں لیکن ایک ذمہ دار، دور اندیش اور سمجھدار قیادت کی کمی نے یہاں رونما ہونے والے سیاسی اتھل پتھل کو منظم انقلاب کی شکل اختیار کرنے سے روکے رکھا چھٹ پٹ واقعات بلاشبہ ہوتے رہے اور سینوں میں خاموش آگ دہکتی رہی۔ اس عہد کا لوک ادب پڑھئے تو آپ کو احتجاج کی زبردست لے سنائی دے گی مثلاً بیرونی افراد کے متعلق آدی باسی عورتوں کا یہ کہنا کہ وہ ہمارے کالے اور خوبصورت بالوں میں جوؤں کی حیثیت رکھتے ہیں یا ہو، اور سنتالی زبان میں اس طرح کے گیت ملتے ہیں جن کا مطلب ہے کہ اگر ہمیں روٹی کے ایک ٹکڑے پر ہی گذارا کرنا پڑے تو بھی ہم سے بانٹ کر کھانا ہے خواہ اس کے لئے ہمیں روٹی کے ٹکڑوں کو اکی کے پتوں پر ہی رکھ کر کیوں نہ کھانا پڑے۔ یہ اس سیاسی شعور کی علامت تھی جو شیخ بھکاری (1) کے ذریعے مختلف قبیلوں میں پنپ رہا تھا۔ انگریز اس خاموش غم و غصے کی لہر کو محسوس کر رہے تھے اس لئے انہوں نے CaptainL T Daltton کو جو شمال مشرقی سرحدی علاقے میں ضلع افسر تھے۔

1- شیخ بھکاری چھوٹا ناگپور کے علاقہ میں پیدا ہوئے تھے اور انقلاب 1857ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں نمایاں سرگرم رہے۔ انہوں نے اپنی دلیرانہ قیادت سے نہ صرف عوامی بیداری کا کام کیا بلکہ یہ تلقین بھی کرتے رہے کہ جب تک انہیں ماہر جنگی طاقتوں سے نجات نہیں مل جاتی مایوسی اور محرومیاں ان کا دامن نہیں چھوڑیں گی۔ زیر نظر مضمون پروفیسر شاہد حسن کی تحقیق کا ایک حصہ ہے جس میں انہوں نے اس مرد مجاہد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی ان کی مجاہدانہ حکمت عملی کا تجزیہ بھی کیا ہے
احسن مثنیٰ

چھوٹا ناگپور میں کمشنر اور خصوصی سیاسی ایجنٹ بنا کر بھیجا اس تقرری کے پیچھے لارڈ ڈلہوزی کا ہاتھ تھا۔ وہ ڈالٹن کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تو تھا ہی اس کی پچھلی تمام کارروائیوں سے آگاہ بھی تھا اس لئے اسے یقین ہو گیا کہ ڈالٹن چھوٹا ناگپور میں پنپنے والی تمام انگریز دشمن طاقت کو کچل دے گا۔ اور پورا علاقہ برٹش سرکار کے قبضے میں آجائے گا۔ مگر لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستانی انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس کی خبر نہیں تھی کہ پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک ماحول بن چکا ہے اور چھوٹا ناگپور بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ ڈالٹن نے اس علاقے کا چارج 7 مارچ 1857ء کو Wil Oakes سے لیا جو پورلیا میں جوڈیشل کمشنر تھے مگر اس کے چار ہی ماہ بعد 10 مئی کو میرٹھ کے فوجیوں نے بغاوت کا بگل بجا دیا اور 11 مئی کو دہلی انقلابیوں کے ہاتھوں میں پھر سے آگئی جہاں ایک بار بہادر شاہ ظفر کو از سر نو بادشاہ بنایا گیا ان خوشگوار واقعات نے چھوٹا ناگپور کے انقلابیوں کو یکجا کیا اور شیخ بھکاری کی قیادت میں اس پہاڑی علاقے میں آزادی کا بگل بجایا۔ اس لڑائی میں وشوناتھ سہدیو، امراؤ سنگھ، نادر علی خاں، قربان علی خاں، راجہ دھیراج سنگھ وغیرہ وغیرہ کا ایک گروپ پیش پیش رہا۔ وشوناتھ سہدیو کی عمر اس وقت 43 سال کی تھی 1857ء کی لڑائی سے ایک سال پہلے انہوں نے عیسائی مشنریز کے سیاہ کارناموں کی ایک رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی تھی دراصل یہ جرمن مشنریز آدی باسی عوام کو ایک جانب عیسائی بنا رہے تھے اور دوسری طرف آزادی کی اس پوری تحریک سے کول عوام کو الگ رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے جو انہوں نے بہت پہلے سے شروع کر رکھی تھیں انہیں دنوں جرمن مشنریز کا ایک دستہ رانچی آیا اور اس نے گوسنر چرچ کی بنیاد رکھی جو ابھی تک موجود ہے اور اس شہر کا ایک بڑا چرچ ہے مگر جرمن پادریوں کی یہ حکمت عملی کام نہ آئی اور جب داناپور میں بغاوت کا پہلا نعرہ پیر علی کی قیادت میں بلند ہوا تو اس کی گونج چھوٹا ناگپور کی وادیوں میں بھی سنائی دی جہاں پہلے سے ہی اس علاقے کے سرفروشوں نے شیخ بھکاری کو اپنا قائد تسلیم کر لیا تھا۔ جب آگ کی طرح داناپور کی بغاوت کی خبر پھیلی تو ہزاری باغ سے رانچی تک کا علاقہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ انگریزوں نے بدحواس ہو کر ہزاری باغ میں سرکاری دفاتر، جائداد اور خزانوں کی حفاظت کا انتظام کرنا شروع کیا۔ مگر اس وقت تک شیخ بھکاری کی رہنمائی میں آزادی کے متوالے دور تک جا چکے تھے۔ انگریزوں کو اس کی فکر ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گرینڈ ٹرنک روڈ پر شیخ کے جوانوں کا قبضہ ہو جائے اس لئے انقلابیوں کی سرکوبی کی خاطر

ڈالٹن کو خصوصی مراسلے بھیجے گئے تاکہ انگریز فوج شیخ بھکاری کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے انگریزوں کی حالت اس وقت تک خراب ہو چکی تھی ان کے افسروں کا دستہ راتوں رات ڈورنڈا اور ہزاری باغ سے بھاگتا ہوا بگوڈر کی طرف روانہ ہو گیا۔ انقلابیوں نے ان کے بنگلوں کو برباد کر دیا ہزاری باغ جیل سے قیدیوں کو نجات دلا دی خزانوں کو لوٹ کر فوجیوں میں تقسیم کر دیا۔ غرض پوری کوشش کے باوجود انگریز ہزاری باغ میں بغاوت کی کامیابی کو نہ روک سکے ہزاری باغ سے کچھ ہی فاصلے پر رام گڑھ تھا اور رامگڑھ میں ہندوستانی فوجیوں کا جم گھٹ تھا وہ سب انگریزوں کے وفادار تھے اور یہ سب سکھ فوجی افسروں کی ماتحتی میں تھے۔ شیخ بھکاری نے ان فوجیوں کے اعلیٰ سکھ افسروں سے بات چیت کی اور انہیں انگریزی حکومت کی وفاداری سے باز رکھا شیخ بھکاری کی سیاسی بصیرت نے سکھ قوم کو آزادی کی لڑائی میں ایک بار پھر سے شریک کیا۔ اور آزاد چھوٹا ناگپور میں ان کے لئے باعزت جگہ مخصوص کرنے کے لئے ان سے وعدہ کیا انگریزوں نے اس پھیلتی ہوئی جنگ کے پیش نظر ڈورنڈا کی ہندوستانی فوج سے ہتھیار چھین لینے کا منصوبہ بنایا اس وقت نادر علی خاں، شیخ امانت، مادھو سنگھ اور فیروز خاں اس بٹالین میں موجود تھے انگریزوں کو ان کی وفاداری پر بڑا بھروسہ تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ تمام لوگ شیخ بھکاری کے ہم راز تھے اور اس وقت کے منتظر تھے شیخ بھکاری نے وشوناتھ سہدیو سے مشترکہ کمان کے ساتھ اعلان جنگ کیا چنانچہ رانچی اور مانجھی، ہزاری باغ، رام گڑھ، اور چوٹو پلو کا علاقہ شیخ بھکاری نے ابتدائی مرحلوں میں ہی آزاد کرا لیا۔ اور ان آزاد علاقوں میں زمینی اصلاحات نافذ کر دیں جن کی زمینیں چھین لی گئی تھیں انہیں واپس مل گئیں۔ ان اصلاحات کی خبر جب جوڈیشنل کمشنر W H Oakes اور کیپٹن ابر ہیم کو ملی تو انہیں بہت تشویش ہوئی انہوں نے گرینڈ ٹرنک روڈ کی حفاظت اور چوٹو پالی کی گھاٹی صاف کرنے کے لئے سخت ترین ہدایتیں جاری کیں اور نئی کمک بھیجیں اس وقت شیخ بھکاری نے اپنے فوجی دستے کو ڈورنڈا کی طرف بڑھنے کا حکم جاری کر دیا تھا چوٹو پالو میں انگریز شیخ بھکاری سے شکست کھا کر Cannon چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اسے پھر سے حاصل کرنا ان کے لئے ضروری تھا مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ شیر کے منھ میں جائیں۔ شیخ کے جوانوں کی ایک جماعت دو sixponder cannon اور بارود کے ساتھ ڈورنڈا کی طرف کوچ کر گئی شیخ کی جماعت میں مادھو سنگھ ایک زبردست فوجی اور مجھدار آدمی تھا۔ جب شیخ کے جوان ڈورنڈا کی طرف بڑھ گئے تو چوٹو پالو میں جگت پال سنگھ

کو راستے میں رخنہ پیدا کرتے ہوئے پایا۔ یہ وہی جگت پال سنگھ پرگنیت ہے جو وشوناتھ سہدیو اور شیخ بھکاری کا رازداں اور ساتھی تھا اور جس نے انتہائی نازک موڑ پر نہ صرف ان دونوں کو دھوکہ دیا بلکہ شیخ بھکاری اور امراؤ سنگھ کی پھانسی کا سبب بھی بنا۔ اس نے پٹھوریہ گھاٹ کو کٹوا دیا تاکہ ہزاری باغ سے باغیوں کا دوسرا دستہ رانچی کی طرف نہ آئے مجبوراً جوانوں نے اپنا راستہ بدل دیا اور فاصلے سے ہی ڈورنڈا کے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا اور رانچی سے 20 کلومیٹر کی دوری پر بڑمو علاقے میں قیام کیا ہزاری باغ کے فوجیوں کی کمان اس وقت سندر ساہنی کے ہاتھوں میں تھی جو اپنا کوئی پرانا حساب انگریزوں سے چکانا چاہتا تھا ڈالٹن جو اس علاقے کا کمشنر تھا اس قسم کے واقعات سے پریشان تھا وہ انگریزی فوجوں کی مدد حاصل کرنے میں مصروف رہا۔ شیخ بھکاری کے وفادار دوست مادھو سنگھ اور نادر علی خاں ڈورنڈا بٹالین کے انقلابیوں کی قیادت کر رہے تھے۔ مادھو سنگھ کو رانچی پہنچنے کی جلدی تھی مگر شیخ بھکاری اور امراؤ سنگھ نے انقلابیوں کو یقین دلایا کہ چوٹو پالو کا پہاڑی راستہ انگریزوں کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس وقت رانچی میں تین بڑے زمیندار انگریزوں کے وفادار تھے بل بھدر سنگھ، پیامبر ساہی، اور جگت پال سنگھ۔ اس درمیان شیخ بھکاری نے اپنے وفادار سپاہیوں اور افسروں کو بھی سمجھا کر اپنے حلقہ اثر میں کر لیا یہی نہیں جے منگل پانڈے کو بھی انگریزوں کی مدد سے باز رکھا۔ ان فوجیوں کا براہ راست مقامی آبادی سے خصوصی رشتہ شیخ کی وجہ سے قائم ہو گیا۔ اس تعلق کے سبب مختلف قسم کی اطلاعات انہیں ملتی رہیں تشویش ناک حالات کو دیکھتے ہوئے انگریز افسروں نے ڈورنڈا سے فرار حاصل کرنا چاہا اور 2 اگست نصف شب میں نہایت خاموشی کے ساتھ یہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ان میں ڈالٹن جیسا مدبر، اور دانش مند کمشنر بھی شامل تھا۔ اس نے جرمن چرچ کے پادریوں اور افسروں کو بھی شہر چھوڑنے کا مشورہ دیا شیخ بھکاری بیک وقت فوجی نقل و حرکت کی رہبری کر رہے تھے اور حضرت محل ور بہادر شاہ ظفر سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ رانی کی جھانسی کا پیغام بھی ان کے نام آیا تھا اس طرح بیک وقت اس آدمی کی آنکھیں ہندوستان کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں مثل پارہ، شیخ بھکاری، متحرک تھے جب انہوں نے حالات کا جائزہ لے لیا تو مادھو سنگھ اور نادر علی خاں ساتھ 2 اگست کو چار بجے رانچی پہنچے جس وقت وہ رانچی کی سرحد میں داخل ہوئے تو عوام کا عظیم الشان جلوس ان کے استقبال کے لئے بڑھا اور W. H Oakes جو ڈیشنل کمشنر جو ہندوستانیوں کا بدترین دشمن تھا انقلابیوں کے غم و غصے کی زد میں

گھر گیا۔ اس کا بنگلہ جلا دیا گیا، سامان لوٹ لے گئے اور اس کے ساتھی Davis and Monclif کی رہائش گاہ بھی نذر آتش کر دی گئی رانچی جیل کی باری اس کے بعد آئی جہاں تمام قیدیوں کو رہائی دی گئی تھی۔ جیل کی سلاخیں توڑ دی گئیں اس کے بعد انقلابیوں کا کارواں ڈورنڈا کنٹونمنٹ کی طرف بڑھا راہ میں جرمن چرچ کے وہ پادری بھی زد میں آئے جو انقلاب دشمن تھے اور جن کے مذہبی تعصب کی وجہ سے آدی باسی عوام ظلم کا شکار ہوئے تھے انہوں نے گوسنر چرچ کے اوپر توپ سے گولے چھوڑے اس وقت جے منگل پانڈے بھی اس کنٹونمنٹ میں تھا اس نے انقلابیوں کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے صلح کی ترغیب دی مگر انقلابیوں نے ہرموندی کو پار کرتے ہوئے اسے اپنے قبضے میں کر لیا بچے کچھ انگریز افسروں نے بھاگ کر دامودر ندی کے کنارے پناہ لی اور پھر ہزاری باغ کی طرف کوچ کرنا چاہا مگر ہزاری باغ پہلے ہی شیخ بھکاری کے قبضے میں آ گیا تھا جہاں جوانوں نے انگریزوں کے بنگلوں کو جلا دیا اور خزانوں کو عوام میں تقسیم کر دیا تھا یہاں بھی رانچی کی طرح جیل کے قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ ہزاری باغ، رانچی اور ڈورنڈا کی کامیابی کے بعد شیخ بھکاری ان علاقوں کو مستحکم کرنے کی خاطر ترقیاتی منصوبہ بنانے میں لگ گئے لیکن چھوٹا ناگپور سے کلکتے کی سرحدیں ملتی تھیں جہاں انگریز کافی طاقتور تھے اور وہی ملک کا مرکزی مقام بھی بنا ہوا تھا اس لئے انگریزوں نے نہایت ہی عقلمندی کے ساتھ ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوششوں کو تیز کر دیا چھوٹا ناگپور کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان خالی کر دینا پڑتا۔ وہ اپنی جیتی ہوئی بازی کو ہارنے کے لئے کبھی تیار نہ تھے چنانچہ راجاؤں نوابوں، امیروں، زمینداروں اور دیگر غدار ہندوستانیوں کے ذریعے چھوٹا ناگپور کو پھر سے غلام بنانے کی مہم شروع کر دی گئی۔ اس سلسلے میں پٹھوریہ کے پرگنایت جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ان کے بہت کام آیا۔ پٹھوریہ وشوناتھ سہدیو اور شیخ بھکاری برابر آیا کرتے تھے انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ پرگنایت انگریزوں سے ملا ہوا ہے چنانچہ ساری فوجی حکمت عملی اور انقلاب کی توسیع کا پورا نقشہ پرگنایت نے انگریز کمشنر اور حاکم اعلیٰ کو بھیجنا شروع کر دیا اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شیخ بھکاری اور وشوناتھ سہدیو کے تعاون کے ذریعے صرف سیاسی انقلاب کے آنے کی امید نہیں تھی بلکہ پوری معیشت اور جاگیردارانہ نظام کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا جب انگریزوں سے چھینی ہوئی زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں اور ان پر کئے گئے مظالم کا تدارک شروع ہو گیا تو پٹھوریہ کے پرگنایت کو اپنے وجود کے

لئے خطرہ محسوس ہوا۔ وہ 84 گاؤں کا ایک بڑا زمیندار تھا اس کی رعایا اس کے ظلم وستم سے پریشان تھی لہٰذا اس نے انگریز دوستوں کو شیخ بھکاری کے منصوبوں سے آگاہ کر دیا اور ان دونوں کے خلاف ایک سازش رچی۔

جس دم ڈورنڈا اور رانچی پر انقلابیوں کے فتح کی خبریں لوگوں کو ملیں تو چائے باسہ اور سنبل پور اور چھوٹا ناگپور کے تمام علاقوں میں شادیانے بج اٹھے 1857 کی 2 اگست کی تاریخ رانچی اور ڈورنڈ کے لئے ایک تاریخی دن بن گیا اس فتح اور کامیابی کا سہرہ شیخ بھکاری وشوناتھ سہدیو، نادر علی خاں، مادھوسنگھ اور جے منگل پانڈے کے سرے۔ شیخ بھکاری کی مدبرانہ شخصیت کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اس علاقے کے عوام کو رنگ ونسل اور مذہبی عصبیت سے آزاد کر کے ایک قومی پرچم تلے متحد کیا شیخ بھکاری نے فوجی اور غیر فوجی شہریوں کے تعاون سے ایک مخلوط نظم ونسق کا بندوبست کیا اور اب اس عارضی نظم کو ایک مستحکم شکل دینی باقی تھی۔ شیخ بھکاری کو اس کا علم تھا کہ نہ لڑائی بھوکوں پیٹ لڑی جاسکتی ہے اور نہ جھوٹے وعدوں پر کوئی فوج دیر تک بھروسہ کر سکتی ہے اس لئے انہوں نے تمام چھوٹا ناگپور میں ایک مشترکہ محاذ بنا کر عوام کی فلاح کا کام بھی شروع کر دیا عوامی فلاح وبہبود کے مختلف اقدامات نے یہاں کے زمینداروں میں غلط فہمیاں پیدا کر دیں انہوں نے سمجھ لیا کہ شیخ بھکاری اور وشوناتھ سہدیو کی مشترکہ سیاسی حکمت عملی سے راجہ رجواڑوں اور بااثر خاندانوں اور افراد کی بالادستی ختم ہو جائے گی، زمینداری بٹ جائے گی۔ غریب اور مفلوک الحال عوام کے ہاتھوں میں حکومت چلی جائے گی اور صدیوں کا آمرانہ نظام مٹ جائے گا چونکہ شیخ بھکاری کے سارے پروگرام خفیہ نوعیت کے ہوا کرتے تھے اور وہ زمانہ میڈیا کے توسیع کا نہیں تھا اس لئے لوگوں کو انقلاب کے بامقصد ہونے کے طریقوں سے واقفیت نہیں کرائی جاسکی اور شیخ بھکاری کے دشمنوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سیاسی شعور کی کمی اور انگریزوں اور اعلیٰ طبقے کی ملی بھگت نے ان انقلابی اقدام کو دھکا لگایا جو شیخ بھکاری نے اپنی فہم وفراست سے اٹھائے تھے اور یہ اگر کامیابی سے چلتے رہتے تو ہندوستان کی تاریخ ہی بدل جاتی۔ چنانچہ رامگڑھ کے راجہ سمبھو سنگھ نے اس آنے والے خطرے کو اچھی طرح سمجھ لیا اور وہ انگریزوں کے پکے وفادار ہو گئے۔ انقلابیوں کی بغاوت کو ناکام بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا انہوں نے انقلاب کو کچلنے اور شیخ بھکاری کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے جانے کے لئے اپنے بھائی رام ناتھ سنگھ کو مقرر کیا جس نے میجر Sumpson اور اعلیٰ

حکومت سے رابطہ قائم کر کے چھوٹا ناگپور کی اس بغاوت کو کچلنے کا بیڑا اٹھایا چنانچہ ڈالٹن، Sumpsonاور اوک نے مل جل کر سازشوں کا ایک جال بنا اور چھوٹا ناگپور میں لڑی جانے والی پہلی آزادی کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک بڑا پروگرام بنایا۔

رام گڑھ میں اس وقت جو بٹالین موجود تھی وہ شیخ بھکاری کی قیادت میں بغاوت کا علم اٹھا چکی تھی اس لئے راجہ رام گڑھ کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا یہ غیر معمولی کام تھا اسے شیخ بھکاری کی سیاسی بصیرت اور راجہ وشوناتھ سہدیو کی رفاقت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے جب یہ سب کام شیخ کر رہے تھے تو اس علاقے کے بعض راجہ اور زمینداروں نے غداری کا ایک ایسا جال بچھایا کہ آزاد کئے گئے علاقے پھر سے ایک بار انگریز ایجنٹ کی ماتحتی میں آجائیں اس اچانک خطرے کے پیش نظر شیخ بھکاری نے رامگڑھ سے چوٹو پالو اور وہاں سے پٹھوریہ تک کے تمام راستے کاٹ ڈالے درختوں سے کٹی ہوئی سڑکیں چھپ گئیں آدمیوں کا آنا جانا غیر ممکن ہو گیا۔ یہی وہ واحد طریقہ تھا جس سے انقلاب دشمن افواج کو رانچی ڈورنڈا اور پٹھوریہ کی طرف جانے سے روکا جا سکتا تھا۔ شیخ بھکاری کے ان کاموں نے نہ صرف انگریزوں کے لئے دشواریاں کھڑی کر دیں بلکہ مقامی غداروں کو بھی حیرت میں ڈال دیا اب انگریزوں اور غداروں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ عمل میں آیا اس سازش کا سب سے بڑا سرغنہ پٹھوریہ کا پرگنایت تھا جس کا گھر ایک طرح سے بھکاری اور وشوناتھ سہدیو کی خفیہ آماج گاہ بن چکا تھا ان دونوں انقلابیوں کو اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ پٹھوریہ کا پرگنایت آستین کا سانپ ہے۔ اس عدم واقفیت لاعلمی اور دشمن پر اعتماد کی وجہ سے انگریزوں نے مختلف راستوں سے ہزاری باغ پر حملہ کر کے اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ گورنر جنرل جغرافیائی اہمیت سے واقف تھا وہ سمجھتا تھا کہ چھوٹا ناگپور اگر ہاتھ سے نکل گیا تو بنگال سے ہندوستان کی ساری راہیں مسدود ہو جائیں گی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا سارا اقتدار جاتا رہے گا۔ انگریزوں کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے وشوناتھ سہدیو اور شیخ بھکاری نے 6 ستمبر کو ہزاری باغ پر ایک شدید حملہ کرنے کی اسکیم بنائی تاکہ گرینڈ ٹرنک روڈ سے ہندوستان کے تمام علاقوں کو جانے والے راستے کاٹ دئے جائیں۔ شیخ بھکاری ایک آزاد چھوٹا ناگپور کا خواب بھی دیکھ رہے تھے انہوں نے آمد و رفت کے سارے وسائل انگریزوں کی دسترس سے دور کرنے کے منصوبے بنائے۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ انگریز باہر سے کمک منگوائیں گے اور مقبوضہ علاقوں کو پھر حاصل

کرنے کی مہم تیز کردیں گے چنانچہ انہوں نے امراؤ سنگھ کی مدد سے ان راستوں کو گھیرنا شروع کیا
دوسری طرف بنگال کے گورنر کو اس بات کی فکر تھی کہ کسی طرح ڈورنڈا کو اپنے قبضے میں کرلیا جائے
لہٰذا انگریزوں نے سکھوں کے بھیشن سنگھ کو جو رام گڑھ میں حولدار کے عہدے پر تھا قید کرلیا اور
بڑی جنگ کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ مگر اس وقت رانچی، رام گڑھ اور چھوٹا ناگپور میں، شیخ بھکاری،
نادر علی، خاں امراؤ سنگھ، وشوناتھ سہدیو سب کی نگاہیں ڈورنڈا کے جوانوں پر لگی تھیں کیونکہ ڈورنڈا
اس وقت ان لوگوں کا ایک مضبوط مرکز بن چکا تھا شیخ بھکاری اس کوشش میں تھے کہ ہندوستان گیر
پیمانے پر انقلابیوں کا ایک مشترکہ محاذ بنایا جاسکے اور جتنی جلد ممکن ہو ہندوستان سے بیرونی افواج کا
خاتمہ کردیا جائے۔ شیخ بھکاری چاہتے تھے کہ چھوٹا ناگپور کے آزاد علاقوں کو اپنے ساتھیوں کے
حوالے کرکے مرکز کی طرف رخ کریں کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ جب تک پورے
ہندوستان پر ہندوستانیوں کا قبضہ نہیں ہوتا انگریز کسی وقت بھی مقبوضہ علاقوں پر قابض ہوسکتا ہے۔
اس لئے انہوں نے پریڈ گراؤنڈ میں وشوناتھ سہدیو کے ساتھ سارے معاملات طے کرنے کی
غرض سے جوانوں اور مشیر کاروں کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اس موقع پر راجہ کنور سنگھ کو بھی مدعو کیا
گیا تھا لیکن وہ نہیں آسکے۔ یہیں پر مقامی راجاؤں اور راجہ کنور سنگھ کے نامزد افراد کے درمیان غلط
فہمیاں پیدا ہوئیں اور وشوناتھ سہدیو کو اس تاریخی اجلاس سے واک آؤٹ کرنا پڑا۔ شیخ بھکاری
حادثے کی نزاکت سے واقف تھے انہیں احساس ہوگیا تھا کہ دشمن سازشوں کا ایک جال بچھانے
میں کامیاب ہوگیا ہے اور شاید تمام مقبوضہ علاقہ پھر سے حاصل کرلے۔ چنانچہ مرکز کی طرف آگے
بڑھنے کا حوصلہ پست ہونے لگا شیخ بھکاری نے اپنے ہی دوستوں کی گرائی ہوئی دیوار کو پھر سے
کھڑی کرنے کی کوشش میں وقت صرف کرنا شروع کیا ٹھیک اسی وقت انھیں پچھوریہ کے پرگنایت
کی سازشوں کا تفصیلی علم ہوا۔ یہ یک زبردست حادثہ تھا جس کی تاب لانا دونوں انقلابیوں کے
لئے مشکل تھا چنانچہ امراؤ سنگھ کے مشورے پر شیخ بھکاری نے ایک بار پھر سے گوریلا طریقۂ جنگ
کو اختیار کرنا ضروری سمجھا مگر شاید وقت ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا غداروں کی بن آئی تھی،
ملک کے دوسرے حصے سے بھی انقلابیوں کے پسپا ہونے کی خبریں ملنے لگی تھیں۔ مہارانی جھانسی
، حضرت محل کے زوال کی افواہیں بھی گرم تھیں۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی مدد سے یہ سب
کچھ اتنی عجلت اور ہوشیاری سے کیا کہ شیخ بھکاری اور ان کے دوستوں کو سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی

۔چنانچہ ایک زبردست لڑائی علاقوں کی سڑکوں پر ہوئی انگریز افواج نے رانچی کی سڑکوں کو خون کی ندی میں تبدیل کر دیا۔شاید ہی کوئی گھر بچا ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس تاریخی لڑائی میں کام نہ آیا۔بندوق اور توپ کے گولوں سے انسانی جسم دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں بکھر گئے تھے جائدادیں لوٹ لی گئیں، عورتوں کی عصمت ریزی ہوئی اور بچوں کو سنگینوں کی نوک پر رکھا گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ چنگیز خاں نے شاید بغداد اور نادر شاہ نے دہلی میں بھی اتنی بڑی خون ریزی نہیں کی تھی جتنی انگریزوں نے رانچی اور ڈورنڈا کے علاقے میں کی۔ہر طرف ایک ہاہا کار مچ گیا تھا لیکن ظلم کا سیلاب تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا رانچی سے ڈورنڈا کی طرف جانے سے پہلے محلے کے محلے نذرِ آتش کر دیے گئے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر آگ کی لپٹوں میں تھے لوک کہانیوں میں اس تاریخی معرکہ کی تفصیل میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ دس دنوں تک رانچی شہر کالے دھوؤں سے اس طرح بھر گیا تھا گویا یہ پورا علاقہ کوئلے کی کھان ہو اور وہاں آگ لگ گئی ہو رانچی کی گلیاں بقول شخصے دو دو فٹ تک خون میں ڈوبی ہوئی تھی کوئی مخلوق ثابت نہیں تھی مندروں اور مسجدوں کے دروازے توڑ ڈالے گئے تھے دور دور تک کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دیتا تھا۔سر شام منحوس آوازیں اور کتوں کے رونے کی صدائیں سنائی دیتیں تھیں غرض کہ قیامت آ گئی تھی۔

انقلابیوں نے اپنی شکست کے بعد ایک بار پھر سے جنگل کی راہ لی۔میں نے ابتداء میں لکھا ہے کہ شیخ بھکاری نے پتھوریہ کے پہاڑی سلسلوں میں بھی اپنا جائے مسکن بنا لیا تھا اور جنگلوں سے گزرتے ہوئے کنور سنگھ کے علاقے تک ایک عارضی راہ بنائی گئی تھی۔اس کی اطلاع پتھوریا کے پرگنایت کو تھی۔شیخ بھکاری نے سوچا کہ پرگنیت اس راز سے واقف نہیں ہے۔اس لئے اس خون ریز لڑائی کے بعد وہ چھپتے چھپاتے پتھوریا پہنچے۔جہاں وہ غار ابھی تک موجود ہے جو شیخ کی خفیہ پناہ گاہ تھی۔پتھوریا کے پہاڑی سلسلے سے وہ رام گڑھ جانے والے تھے اور وہاں سے وہ جگدیش پور جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن امراؤ سنگھ و شیخ بھکاری ایسا نہ کر سکے۔[illegible] نے مختلف اضلاع کے خزانوں کو لوٹ کر ڈورنڈا کے سپاہیوں اور اہم لوگوں [illegible] پانی کی طرح بہا دیا۔اس لالچ نے بہت سے لوگوں کو خاموش کر دیا اور بہت سے غدار وطن کو انقلابیوں کے خلاف اظہار بیان کے لئے تیار کیا۔انگریزوں نے [illegible] سکھ فوج کو طلب کیا۔یہ سکھ فوج شیخ بھکاری کے کارناموں سے غافل تھی۔انگریزوں نے سکھ فوج کو [illegible]

بٹالین سے ملنے کا موقع نہیں دیا اور ان کی مدد سے ڈورنڈا میں انقلابیوں کو زبردست شکست
دی۔ انگریزوں کی اس کامیابی کے لئے تاریخ نے کمشنر ڈالٹین کے سر پہ سہرا باندھا۔ ڈورنڈا کے
زوال کے بعد ہی یہ منادی بھی کی گئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بغاوت میں ملوث ہر شخص کو موت کی
سزا سنائی ہے۔ اب پورے علاقے پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا چنانچہ 22 اگست 1857 کو ڈالٹین ایک
فاتح کی حیثیت سے رانچی آیا۔ ہندوستانیوں کے حوصلے اتنے پست ہو گئے تھے کہ اس کی آمد پر کوئی
احتجاج نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ سبھوں کو سانپ سونگھ گیا۔ شیخ بھکاری اور ان کے دوستوں کی قبل
از وقت موت کی افواہیں پھیلادی گئیں تاکہ بچے کھچے انقلابیوں کے حوصلے ہمیشہ کے لئے پست ہو
جائیں۔ انگریز اپنی چال میں کامیاب ہو گئے اور باغیوں نے سپر ڈال دی۔ مگر شیخ بھکاری ان تمام
حادثات سے پرے جنگلوں اور پہاڑوں کی وادیوں میں انقلاب کا نیا نقشہ مرتب کر رہے تھے۔ وہ
وادی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں شیخ بھکاری دن کے وقت چھپ کر اسلحہ سازی کا عمل انجام
دیا کرتے تھے۔ رات کے وقت وہ وادی سے اس جگہ آجاتے تھے جہاں پٹھوریا کے لوگ خورد و نوش
کا سامان پہنچایا کرتے تھے۔ شیخ بھکاری پرگنایت سے بدلہ لینے کے منتظر تھے مگر قدرت کو یہ منظور نہ
تھا کہ انقلابی کامیابی سے ہمکنار ہوں اور شیخ بھکاری جیسے جیالے محبِ وطن ایک سیکولر، جمہوری اور
آزاد ہندوستان میں سانس لے سکیں۔

شہید صحافت علامہ محمد باقر

تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانی مولوی محمد باقر ہیں جو آبِ حیات کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار تھے۔ ہندوستانی تاریخ صحافت کی رو سے انھیں پہلا شہید قرار دیا جاتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اب تک ان پر باقاعدہ کام نہیں ہوا ہے اور نہ ہی ان کے حالات زندگی کا ہمیں پورے طور پر علم ہے، اسی پر بس نہیں بلکہ وہ واقعات بھی ابھی پردۂ خفا میں ہیں۔ جو ان سے منسوب کئے جاتے رہے ہیں۔ میں اپنی محدود معلومات کی حد تک ان حقائق کی روشنی میں چند نتائج اخذ کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ ڈیڑھ سو برس بعد ہی صحیح ہم سب پر حقیقت آشکار ہو سکے۔

علامہ محمد باقر کی پیدائش کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے لیکن قرین قیاس ہے کہ وہ 1780 میں پیدا ہوئے کیوں کہ جب انہوں نے دہلی اردو اخبار شائع کرنا شروع کیا تھا اس وقت ان کی عمر تقریباً 57 برس تھی لیکن مولانا سید مرتضیٰ حسین نے اپنی تصنیف "مطلع انوار" مطبع کراچی 1981ء صفحہ 551 پر ان کی پیدائش 1790ء درج کی ہے۔ جو اس ضمن میں مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔

ان کا سلسلۂ نسب کئی پشتوں کے بعد رسول اسلام حضرت محمد مصطفےٰ کے برگزیدہ صحابی سلمان فارسی سے جا ملتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ مولانا محمد شکوہ ایران کے مشہور شہر ہمدان (ایران) سے شاہ عالم کے دور میں یہاں فروکش ہوئے تھے۔ مولانا محمد شکوہ کے صاحبزادے محمد اشرف کا شمار اپنے عہد کے نامور علما میں ہوتا تھا۔ ان کا احترام شاہ عالم کے دربار میں بھی تھا اور بادشاہ نے انہیں وظیفہ سے سرفراز کیا تھا۔ انھیں کے فرزند محمد اکبر کے اکلوتے جانشین مولوی محمد باقر تھے جن کی سماجی حیثیت کا اندازہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد کے اس قول سے ہوتا ہے۔

"حضرت آزاد مرحوم کے والد ماجد علامہ محمد باقر شہید شیعوں کے مجتہد تھے"

وہ نہ صرف نجیب الطرفین اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ انہوں نے ایک باوقار

خانوادے میں آنکھ کھولی تھی اور ان کے والد مولوی محمد اکبر نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ مرکوز کی تھی۔ انہوں نے شروع شروع میں اپنے دادا ماجد کے سامنے ہی زانوے ادب تہہ کیا بعد میں میاں عبدالرزاق کے شاگرد ہوئے جو دہلی کے ایک نامور عالم تھے۔ آپ 1825 میں دہلی کالج میں داخل کرا دیے گئے۔ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر لارڈ ولیم بینٹنگ نے انھیں اعزاز سے بھی نوازا تھا۔ یہ ان کی قابلیت کا ثمرہ ہی تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اسی کالج میں (1826-1835) تک فارسی کے مدرس کے فرائض انجام دیے اور کافی شہرت حاصل کی۔ یہیں انہوں نے کالج کے پرنسپل ٹیلر کو فارسی پڑھائی اور ان سے ان کی دوستی پروان چڑھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکالنا چاہئے کہ مولوی باقر، ٹیلر کی مشنری سرگرمیوں میں ان کے معاون تھے بلکہ وہ تو اپنے اخبار میں ان کے خلاف لکھتے رہتے تھے جسے ٹیلر سم قاتل گردانتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس طرح کے مضامین نہ لکھیں۔ ان کے والد نے نہیں نہ صرف دینی علوم کی طرف راغب کیا تھا بلکہ علوم دنیوی سے بھی بہرہ ور کرایا تھا جس کے صلے میں چارلس مٹکاف نے انہیں تحصیلداری کے فرائض سونپے اور بعد کو انھیں کلکٹری بھی عطا ہوئی تھی جہاں انہوں نے سولہ برس تک اپنے فرائض منصبی ادا کیے بقول سید مرتضیٰ حسین ان کے اندر

''آزادی او طبیعت میں انگریزی سیاست سے نفرت تھی اس لئے ملازمت چھوڑ دی''

مولانا سید مرتضیٰ حسین مطلع انوار صفحہ 490 ایک خیال یہ بھی ان کے والد انگریزوں کی عملداری میں کام کرنے سے خوش نہیں تھے اور وہ چاہتے تھے کہ علامہ باقر دینی مشن پر کاربند رہیں اور قوم کی خدمت کریں۔ ان کے اس اقدام سے ان کے والد کی خواہش پوری ہوئی ہوگی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا بہرحال یہ وہی زمانہ ہے جب انہوں نے دہلی اردو اخبار شائع کرنا شروع کیا جس کی بدولت انہیں ہندوستانی صحافت کا بنیاد گزار مانا جاتا ہے۔ جب مولوی باقر نے اخبار نکالنے کا قصد کیا تو انہیں ایک پریس کی ضرورت محسوس ہوئی جو نہیں ان کے دیرینہ دوست مسٹر ٹیلر کے توسط سے ہاتھ آ گیا اس امر کی اطلاع ''ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی'' کی ورق گردانی سے ہوتا ہے۔ یہ پریس ڈاکٹر اشپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے زمانے میں خریدا گیا تھا تا کہ دہلی کالج کی نصابی کتابیں شائع کی جا سکیں لیکن یہ ضرورت جلد پوری ہو گئی جس کے بعد یہ پریس ان کے لئے بے مصرف ہو گیا تھا اور ٹیلر جو ان دنوں کالج کے پرنسپل تھے چاہتے تھے کہ اسے اونے پونے

فروخت کرکے اس سے نجات حاصل کی جائے۔ مولوی باقر کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھایا اور اسے خرید لیا جو ان کے دہلی اردو اخبار کی اشاعت کے لئے اہم ثابت ہوا لیکن ملازمت کی مجبوریوں کی بنا پر شروع میں ان کا نام عملہ ادارت میں شامل نہیں ہوتا تھا جبکہ دیگر اعزہ کا نام جلی حروف میں شائع کیا جاتا تھا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام 1848 سے بہ حیثیت مہتمم شائع ہونے لگا تھا ان کے والد انگریزوں کی نوکری سے خوش نہیں تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ مذہبی کاموں میں دلچسپی لیں لہٰذا اپنے والد کی ایما پر ملازمت ترک کرکے وہ علوم مذہبی کی ترویج واشاعت میں مصروف ہوگئے اور اکتوبر 1843 میں ''مظہر حق'' نامی رسالہ جاری کیا جس کا سالانہ چندہ دس روپئے تھا یہ رسالہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ ان کی شادی ایک ایرانی خاتون امانی خانم سے ہوئی تھی جن سے محمد حسین آزاد اور ایک صاحبزادی متولد ہوئیں۔ امانی خانم کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی ماسٹر حسینی کی بہن سے کی تھی۔ وہ عالم وفاضل ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اور انسان دوست شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہندو مسلمان عیسائی بھی مذہب و مسلک کے لوگ شامل تھے جن میں ماسٹر رام چندر، پر بھو دیال اور ٹیلر سر فہرست ہیں۔ وہ مادر وطن کی غلامی کو سوہان روح سمجھتے تھے اور ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے آرزومند تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ صحافت ہی ایسا پیشہ ہے جس کے ذریعہ اپنا مدعا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے میدان صحافت میں بھی اپنے مجتہد ہونے کا ثبوت دیا اور کوشش کی کہ اس میں ملکی وغیر ملکی بھی طرح کی خبریں شائع ہوں اور اسے ایک ادبی حیثیت بھی حاصل ہو اسی لئے اس میں مشاہیر کا کلام خصوصاً قلعے معلی سے متعلق شعرا کا کلام بڑے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے وہ عوامی فلاح و بہبود کی خبروں کے علاوہ سماجی بدعتوں، برائیوں اور سرکار کی ناکامیوں کو موضوع بحث بناتے اس کے لئے انہوں نے سرکاری حکام کی زیادتیوں، اقتصادی بدحالیوں، جرائم کے ارتکاب کی خبریں شائع کیں ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اخبار میں جنگ آزادی کی خبروں، بادشاہوں اور شہزادوں سے متعلق خبروں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی خبروں کو علیحدہ علیحدہ کالموں میں پیش کیا کرتے تھے اور ان کے لئے مستقل اصطلاحات بھی وضع کر رکھی تھیں مثلاً مغل تاجداروں کی خبریں ''حضور والا'' کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی خبروں کے لئے ''صاحب کلاں بہادر'' کا عنوان تراشا

گیا تھا۔اس کا ایقان بلکہ ایمان تھا کہ ایک مدیر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اخبار میں ایسے مواد شائع کرے جس سے عوام کے اخلاق اور کردار کو سنوارنے میں مدد ملے،ان کی زندگی بہتر بنائی جاسکے۔انہوں نے اپنے قلم سے ثابت کردکھایا کہ مجاہدین وطن صداقت،حریت اور وطن پرستی کی بہترین مثال ہوا کرتے ہیں جس سے آئندہ نسلیں سبق لیا کرتی ہیں۔انہوں نے اپنی صحافتی کارکردگیوں سے ہم میں جوش وجذبہ پیدا کیا،اتحاد کا پیغام دیا اور مستقبل کا خواب سنجونے کا ہنر سکھایا اور میدان صحافت میں ایک ایسا شاہراہ تعمیر کر گئے جس پر نہ صرف اردو صحافت نازاں ہے بلکہ پوری قوم کا سر بلند ہے کہ اسی جیالے نے سب سے پہلے انگریزوں کو اس ملک سے نکال باہر کرنے کیلئے صحافتی سطح پر انتہائی اقدام کیے۔

مولانا باقر کشمیری دروازہ کے علاقہ میں کھڑکی ابراہیم خاں میں رہتے تھے جہاں انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو کھجور والی مسجد کے نام سے مشہور تھی اس کے علاوہ انہوں نے 1260ھ میں ایک امام بارگاہ بھی تعمیر کرایا تھا۔جس کی تاریخ استاد ذوق نے "تعزیت گاہ امام دارین" سے نکالی تھی۔اپنی علم دوستی کے ساتھ ساتھ وہ ایک کاروباری ذہن بھی رکھتے تھے چنانچہ اپنے دوست ٹیلر کے مشورے سے ایرانی سوداگروں کی رہائش کے لئے ایک سرائے بھی تعمیر کرائی تھی جس سے نہ صرف بیرونی تجارت کو فروغ ہوا بلکہ اسکی آمدنی سے ان کا شمار شہر کے متمول افراد میں بھی ہونے لگا تھا۔ان کی زندگی میں ایک مذہبی مناقشہ کی بھی خصوصی اہمیت ہے جس کا آغاز 1849 کے آس پاس ہوا تھا۔اس میں نواب سید حامد علی کا ہاتھ بتایا جاتا ہے جنہوں نے اپنی انا کی تسکین کے لئے یہ فتنہ پردازی کی تھی جس کے تحت حضرت ذوق کے مقابلے میں غالب کو کھڑا کیا گیا تھا تو مولانا باقر کے مقابلے میں علامہ قاری جعفر علی کو۔ان دونوں میں پہلے تو یہ مذہبی معاملہ رہا بعد کو مباحثہ،مناظرہ بلکہ مجادلہ تک پہنچ گیا اور شیعہ حضرات دو گروہوں مولانا باقر کے ہمنوا (باقریہ) اور مولوی جعفر علی کے مداح (جعفریہ) میں منقسم ہو گئے۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولوی محمد باقر پر کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا گیا لیکن [illegible] باوجود ان [illegible] استقلال میں کمی نہ آئی اور وہ اپنی منزل کی جانب گامزن رہے۔ان [illegible] نا جذبہ موجود تھا جس کی سب سے اچھی مثال پریس قائم [illegible] دہلی [illegible] اخبار جاری کرنا تھا، کیونکہ انگریزوں کے دور حکومت میں اخبار شائع کرنا بڑا دشوار [illegible] ۱۸۳۶ میں جب پریس [illegible]

پاداش میں اپنے عہدے سے ہٹنا پڑا لیکن اس کے اس عمل سے دیسی اخبارات کا نکلنا ذرا آسان ہو گیا اور اسی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مولوی محمد باقر نے اس سمت میں قدم اٹھایا اور مطبع جعفریہ اور مطبع اثنا عشری قائم کیا جو بعد کو "اردو اخبار پریس" ہو گیا جہاں سے "دہلی اردو اخبار" ہر ہفتہ یکشنبہ کو شائع ہوتا۔ دہلی اردو اخبار کب جاری ہوا اس سلسلہ میں کافی اختلاف رائے ہے کیوں کہ مارگریٹا بارنس نے اپنی تصنیف Indian Press میں اس اخبار کی اشاعت 1838 تحریر کی ہے جبکہ مولوی اختر شہنشاہی کے خیال میں اس اخبار کی رسم اجرا یکم مارچ 1858 میں ہوئی۔ بہ قول محمد عتیق صدیقی یہ اخبار 1837 میں جاری ہوا جبکہ اس اخبار کے بانی علامہ باقر کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی شاہکار تصنیف آب حیات مطبع لاہور 1950 میں صفحہ 26 پر یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

"1836 میں اردو کا پہلا اخبار دہلی میں جاری ہوا۔ یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا"

مولانا محمد حسین آزاد کے اس بیان کی تصدیق دیگر کئی محققین نے بھی کی ہے جن میں Islamic Culture-pub1950 کے مصنف نجم ال اور "صحافت پاکستان و ہند میں" مطبوعہ لاہور 1936 کے مصنف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی تصنیف کے صفحہ 103 پر آزاد کے بیان کی تائید کی ہے اس کے علاوہ "تاریخ اردو صحافت" مطبوعہ دہلی جلد دوئم حصہ اول کے مصنف امداد صابری نے بھی اپنی تصنیف کے صفحہ 28 پر آزاد کے بیان کی تصدیق کی ہے۔ مندرجہ بالا مباحث سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ دہلی اردو اخبار کب شائع ہونا شروع ہوا۔

بہرحال یہاں صرف شہید صحافت علامہ محمد باقر اور دہلی اردو اخبار کے حوالے سے بات کی جائے گی تاکہ اس عظیم مجاہد کے کارناموں پر روشنی ڈالی جا سکے ساتھ ہی یہ باور کرایا جا سکے کہ مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار کو ہی اردو کا پہلا سیاسی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس نے اپنی خبروں اور رپورٹوں وغیرہ سے 1857 کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار نبھایا اور اسی جنگ کی نذر ہو گیا۔ گو کہ "جام جہاں نما" کو اس کے ضمیمے کی رو سے اردو کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا ہے لیکن اس اخبار نے جنگ آزادی میں کسی قسم کا کردار نہیں نبھایا تھا اور نہ ہی اس میں اس قسم کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ جب ہندوستانی صحافت کی تاریخ کا مطالعہ [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت [illegible] "دہلی اردو [illegible]" [illegible] [illegible]

شہید صحافت، مولوی محمد باقر میدان صحافت کے انہیں جاں باز اور حق پرست سپاہیوں میں سے ایک تھے بلکہ وہ اس قبیل کے سردار و پیشوا تھے جنہوں نے اپنے اخبار ”دہلی اردو اخبار“ میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حکام کی مکروہ کارکردگی پر مردانہ وار حملہ کیا کیوں کہ مولوی صاحب برائی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی غلامی اور ان کے ذریعہ تھوپی گئی سامراجی عنت کو ختم کرنے کے لیے ان کا اخبار بہت اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں جب تک پہلی جنگ آزادی بقول انگریز مورخین (1857 کا غدر) جاری رہی اس وقت تک دہلی اردو اخبار نے اپنے صفحات جنگ آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے وقف کردیے۔ مولانا نے اپنے اخبار میں غدر کی خبریں بڑے ہی اہتمام سے شائع کیں، جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں شائع کیں، پر جوش ولولہ انگیز باغیانہ مضامین اور نصیحتوں کو روزانہ شائع کیا یہاں تک کہ علمائے کرام کے انقلابی فتووں کو بھی اخبار کی زینت بنایا۔ انہوں نے اس اخبار میں روحانی بزرگوں کے خواب بھی نمایاں طور پر شائع کیے جس میں انگریزی حکومت کے خاتمے کی بشارت کا ذکر ہوتا یعنی مجاہدین آزادی کی رگوں میں روانی خون تیز کرنے کے تمام لوازم کو اخبار میں جگہ دینا ہی دہلی اردو اخبار کا اولین مقصد تھا۔ مولانا نے اس بات کا خاص اہتمام کیا تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے مجاہدین آزادی کے دہلی آنے اور یہاں ان کے جنگی کارناموں، انگریزوں سے مجادلوں و مقابلوں اور ان پر فتح وظفر حاصل کرنے کی رپورٹیں اور ان کی تفصیل خصوصی طور پر شائع کی جائیں اور یہ بھی بتایا جائے کہ ہندوستان کے کن کن مقامات پر انگریزی فوجوں کا مجاہدین آزادی نے قلع قمع کردیا ہے۔ شاید یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر 12 جولائی 1857 کو دہلی اردو اخبار کا نام بدل کر ”اخبار الظفر“ کردیا گیا حالانکہ تبدیلی نام کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ اسے بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام سے مناسبت دی تھی۔

حق تو یہ ہے کہ مولانا محمد باقر ایسے صحافی ہیں جنھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے نہ صرف ہندوستانیوں کے جذبات کو بیدار کرنے کا کام کیا بلکہ اردو کے دیگر اخبارات کو راہ عمل بھی دکھائی تاکہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف آزادی کے حصول میں کوشاں ہوں۔ اس کی بہترین مثال ”دہلی اردو اخبار“ کی وہ اپیل بھی ہے جس میں مولوی محمد باقر نے عوام سے جان کی بازی لگانے اور مجاہدانہ عمل بجالانے کا اعادہ کیا تھا اور کہا تھا کہ:

''ہندو، مسلمان متحد ہو کر جان کی بازی لگا دو اور مجاہدانہ شان سے انگریزوں کا خاتمہ کر دو۔''

ان کی اس اپیل کا کس قدر اثر ہوا یہ بات سب پر عیاں ہے۔ دیکھیں اس اخبار کا آخری شمارہ یعنی 13 ستمبر 1857 سے یہ سطریں جس میں وہ نہ صرف ایک صحافی کا رول ادا کر رہے ہیں بلکہ مجتہدانہ عمل انجام دے رہے ہیں۔ وہ عوام کو باخبر کرنے اور ان سے دعا کرنے کی گزارش کرر ہے ہیں کہ ان کی دعاؤں سے بادشاہ فتح یاب ہوں:

''کافر آگے بڑھ رہے ہیں لوگ دعا کر رہے ہیں کہ بادشاہ کو فتح ہو''

دہلی اردو اخبار 13 ستمبر 1857

مندرجہ بالا بیانات سے علامہ باقر کے سیاسی شعور اور جذبہ حریت کا اندازہ ہوتا ہے کیوں کہ اس قسم کی اپیلوں، مضامین، خبروں، رپورٹوں، نظموں وعظوں اور فتوؤں وغیرہ سے انگریز افسران نہ صرف ان سے برہم ہو گئے تھے بلکہ ان پر اپنے اخبار کے ذریعہ بغاوت بھڑکانے کا الزام بھی لگانے لگے تھے۔ پھر بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی منزل کی جانب گامزن رہے۔ انہیں مجاہدانہ کاوشوں کی پاداش میں ان پر جھوٹے الزام لگائے گئے اور 15 ستمبر 1857 کو انہیں گرفتار کر لیا گیا جس میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے جدوجہد آزادی کے دوران اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا اور انگریز افسر ٹیلر کو قتل کرانے میں کلیدی رول ادا کیا جبکہ اس عظیم سانحہ کے وقت بھی انہوں نے کوشش کی کہ انسانیت پر آنچ نہ آنے پائے اور یہی وجہ تھی کہ جب ٹیلر انکے گھر موت سے امان مانگنے آیا تو اسکے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا اور کوشش کی کہ اسکی جان بچ جائے، جب موت اسکا پیچھا کرتی ہوئی ان کے گھر تک آن پہونچی تو بھی اسے بھیس بدل کر باہر جانے کو کہا ورنہ وہ شخص جو اس کارزار میں اس قدر اہم کام انجام دے رہا تھا شکار کب اپنے ہاتھ سے جانے دیتا۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد اوائل جولائی میں جب انگریزوں کا پہ بھاری ہو رہا تھا اور وہ پھر سے دہلی پر قابض ہونے لگے تھے ملک میں مخبری کا بازار گرم تھا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے ایک اشتہار شائع کیا جس کا روئے سخن دہلی اور نواح دہلی کے مسلمان تھے انہوں نے اس اشتہار میں یہ پیغام دینے کی سعی کی تھی کہ وہ مسلمانوں کو غدر کا ذمہ دار نہیں مانتے بلکہ اس فتنہ کا ذمہ ہندوؤں کے سر ہے اور یہ انہیں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس اشتہار میں کارتوسوں سے متعلق وضاحت کی گئی تھی کہ اس میں سور کی

چربی نہیں ملائی گئی ہے بلکہ گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے چہ جائیکہ۔ بظاہر یہ اشتہار مسلمانوں کو اپنی طرف ملانے کی غرض سے تھا لیکن اس میں بھی مسلمانوں کے نظریہ جہاد، دین اسلام شریعت، اور دیگر امور کے متعلق حجتیں کی گئیں تھیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اشتہار مفسدانہ انداز لئے ہوئے تھا دیکھیں اس اشتہار کا متن جس کا جواب علامہ نے اپنے اخبار میں دیا تھا۔

"آگاہ ہو کہ رعایا حسب ودیعت خدا ہے اور حاکم لوگ ان پر بہ منزلہ شبان کے ہیں۔ جس دن سے دہلی میں ہمارے سرکش نوکروں نے از راہ نمک حرامی گستاخیاں کر کر حکام مع ان کے زن اور فرزندوں کے از راہ ستم بے دریغ تہ تیغ کیا اور شہر کو ملجا اپنا بنایا اور رعیت پر ظلم روا رکھا اور ان کا مال بہ معیت اوباشان شہر دستبرد کیا۔ بادشاہ کو بھی قید کیا چنانچہ بادشاہ سے برابر ان ستم شعاروں کی شکایت سنی گئی۔ اب ہم کو ان کے تنبیہ دینی فرض ہے جو یہاں پر اخیام (خیمہ) ذو احتشام ہمارے قائم ہوئے دریافت ہوا کہ بعضے جاہل نا عاقبت اندیش کہ ہمراہ اس فوج سرکش کی غارت گری میں شریک احوال تھے۔ بنام جہاد کے آمادہ فساد ہوئے اور چند بار بہ معیت اون کے آکر جدال وقتال میں شریک ہو کر اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالا۔ پس ہم کو ان لوگوں کو بلکہ گروہ مسلمین کو اطلاع اس امر کی (دینا) پر ضرور ہے اول تو مسلمانان بایمانوں کو بموجب ان کی شرع کے واجب تھا کہ تحقیق امر بالنزاع کے شواہد عادل کرتے یا بادشاہ صاحب اپنے سامنے اس کی کیفیت۔ اگر ہماری نسبت میں کچھ زیادتی ثابت ہوتی اس وقت حکم ہمارے قتل کا اور قتال کا بنام جہاد کرتے۔ اب ہم علماء دین سے مسئلہ ارکان جہاد و شرائط اوس کے دریافت کرتے ہیں اور بہ حلف انجیل شریف کہ کہتے ہیں کہ یہاں سے کلکتہ تک کسی حاکم کی رائے یہ نہیں ہوئی کہ سپاہ مسلمین کو کارتوس ساختہ چربی خوک اور آرد مشمولہ استخوان ہائے خوک واسطے بگاڑنے ان کے دین کے دیویں۔۔۔ اور جو کوئی جاہل از روئے جہل مرکب نے یہ کہے کہ بگاڑنا دین کا منظور تھا، اس حالت میں یہ سوال ہے کہ آیا لحم خوک کھانے سے جیسے گناہ کبیرہ ہوتا ہے یا مجرد خورش کے خارج از اسلام ہو جاتا ہے اور جو کوئی حاکم جہاد علم رکاب مناہی کرے اس وقت پر اگر تاب مقابلہ کی رکھتا ہو تب تو ارتکاب اس امر سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ اون کے قتل معہ زن و بچہ کرے اور اب یہ بھی بگوش دل سننا چاہئے کہ سپاہ

مسلمین کو سپاہ ہنود نے کہ ناقص العقل ہیں اغوا کیا۔ نفس الامر میں کارتوس مشمولہ چربی گاؤ وغیرہ جانوران حلال بخیال اسکی سرکار کو بہم روس و ایران پیش تھی اور اس ضلع میں برف باری ہوتی تھی جب اس ارادہ اوس کے تقسیم کا کیا تب قوم ہنود نے یہ ڈھکوسلہ باندھا کہ ہم کو کارتوس چربی گاؤ دیا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو چربی خوک کی۔ فرقہ سپاہ جو ناعاقبت اندیش ہوتی ہے، سرکشی پیش کی اور بلوہ کیا اور رعیت کو بھی بہکایا پس اہل شہر تم آگاہ ہو کہ اول تو مقصود سزادہی سپاہ ہنود کی ہے اور جو ان کی معیت و حمایت کریں گے اون کے تئیں بھی سزا دی جائے گی۔ تم کو چاہئے کہ بموجب حکم شرعی کے ہمارے شریک حال ہو کر اہل ہنود کو قتل کرو۔ ورنہ یہ کہ ہم پر بلا تحقیق اور بلا امام کے آمادہ بہ پیکار ہو نقط۔ یہاں تمام ہوا مضمون اشتہار کا۔"

اس اشتہار کے ذریعہ کی جانے والی ان کی یہ حکمت عملی پوری طرح ناکام رہی اور ہندو اور مسلمان سبھی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کا جواب علمائے شہر کی جانب سے شائع کیا گیا جو مولوی باقر کے چھاپہ خانہ سے شائع ہوا۔ دیکھیں جوابی اشتہار کے الفاظ

"رسالہ ہادی العباد، فی جواز الجہاد، الیٰ یوم اشناد، متضمن جوب با جواب"

و

ردّ اشتہار مکاران جعل ساز، عدوّ مبین دین خاتم النبیین، نوکرید خامہ جناب استاذی محمد ابن محمد در 1273ھ مطبع دہلی اردو اخبار ملقب با خطاب اخبار ظفر من اہتمام سید عبداللہ

استفتا۔ کیا فرماتے ہیں اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں شہر والوں پر جہاد لازم ہے یا نہیں اور جو لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان پر جہاد فرض ہے یا نہیں اس کا جوب ملاحظہ فرمائیں۔

"درحالت مرقومہ فرض عین ہے اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اب شہر والوں طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے اور یہ بسبب کثرت اجماع افواج کے اور مہیا ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کہاں شک رہا؟ اور اطرف حوالی کے

لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خیر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔" یہ جوابی اشتہار انگریزوں کی بہت بڑی مخالفت تھی اور اس بنا پر بھی ان کی گرفتاری عمل میں آئی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

اب وہ جوابات بھی ملاحظہ فرمائیں جو دہلی اردو اخبار میں شائع ہوئے تھے جس کی وجہ سے بھی مولوی باقر کی گرفتاری ہوئی۔ مولوی باقر نے اس اشتہار کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ اگر کمپنی خود کو رعایا کا محافظ اور امانت دار جانتی ہے تو سب سے پہلے وہ امانت دار کی امانت یعنی ہمارا ملک واپس کر دے اور جن لوگوں کا دھرم ایمان برباد کیا ہے اسے بحال ہونے دے، جن کی جاگیریں ضبط کیں ہیں ان کی جاگیریں واپس کر دے، بادشاہ سلامت پر روا رکھی جانے والی اذیتوں کا خاتمہ کرے اس کے علاوہ دین اسلام سے متعلق جو باتیں اشتہار میں کہی گئیں اس کا جواب مولوی باقر نے کچھ اس طرح دیا۔

"تم نے ہمارے واجبات شرعی کی کسی تعمیل کی طاقت ہم میں کب چھوڑی تھی کہ آج شرع شریف کا نام زبان پر لاتے ہوئے (تمہیں) شرم نہ آئی۔"

آگے انہوں نے لکھا کہ:

"سب سے زیادہ ظلم یہ ہے کہ مکان لعل بنگلہ جس میں سلاطین عظام و اہل خاندان شاہی مدفون تھے (یعنی) مردوں کی قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور کچھ پاس و آداب و اسلام و شفقت حضور والا کا بھی نہ کیا۔"

گائے اور سور کی چربی سے متعلق اشتہار کا جواب انہوں نے یوں دیا:

"اس سے صاف جھلکتا ہے کہ ان کارتوسوں میں چربی خوک وغیرہ لگی تھی۔۔۔ لحم خوک کھانے کے بارے میں یہ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کون سا گناہ کیسا کبیرہ (ہے) (اور) کون سا کبیرہ فوراً کفر کو پہنچ جاتا ہے۔"

اشتہار کے حوالے سے ہندو مسلم اتحاد کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

"خود (اہل کمپنی) لکھتے ہیں کہ چربی گاؤ کی تھی، کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا۔۔۔ سپاہ اسلام عین عاقبت اندیشی سے سمجھ گئے کہ آج یہ ظلم

ہندو پر ہے (تو) کل ہم پر ہے۔"

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ محمد باقر میں سیاسی شعور اور جذبہ حریت بدرجہ اتم موجود تھا اور وہ ایک سچے محب وطن تھے کہ یہی ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے۔ ان کی شہادت سے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں اور اس بارے میں محققین میں کافی اختلاف ہے کہ انھیں توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا، گولی ماردی گئی یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا لیکن مولوی ذکاء اللہ، آغا محمد باقر اور جہاں بانو نقوی کے علاوہ ان سبھی حضرات نے جنہوں نے ان کی شہادت کے متعلق تحقیق کی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ مولوی محمد باقر کو پرنسپل ٹیلر کے قتل کے الزام میں موت کی سزا دی گئی جو جنگ آزادی کی ناکام لڑائی کے وقت ہلاک کر دے گئے۔ یہاں میں علامہ باقر کی شہادت سے متعلق مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ بیان پیش کرنا چاہوں گا جس میں انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شہادت کن حالات میں واقع ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے:

> "........ بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور اپنے بڈھے خانسامہ کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں مولوی محمد حسین آزاد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر کی ان سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ایک رات کو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑہ میں رکھا لیکن دوسرے دن ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہوئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کر دیا۔ مگر ان کا بڑا افسوس ناک حشر ہوا غریب بہرام خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس رج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بیچارے نے وہیں دم توڑ دیا۔ بعد میں مولوی باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی پر چڑھائے گئے اور ان کا کوئی عذر نہ چلا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی اور ان پر بھی قوی شبہ تھا مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سرزمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے، جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے.........."

مولوی عبدالحق: مرحوم دلی کالج۔ صفحہ 61

یہ تو مولوی عبدالحق کا بیان تھا۔ تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اپنے والد کی شہادت کی تفصیل بتائی ہے جسے پروفیسر عبد القادر سروری نے اپنی تصنیف "Famous Urdu Poets and Writers" میں یوں نقل کیا ہے۔:
لکھتے ہیں کہ جب ٹیلر کو مولوی باقر نے ہندوستانی کپڑے میں ملبوس کرا کے مکان کے پچھلے حصے سے باہر نکال دیا اس کے کچھ دیر قبل ٹیلر نے ایک کاغذ کا بنڈل انکے حوالے کیا اور کہا کہ:

"........دلی پر انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہو جائے تو پہلا انگریز جو تمہیں نظر آئے یہ بنڈل اس کے حوالے کر دینا۔ مولوی صاحب کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس بنڈل کی پشت پر ٹیر نے لاطینی زبان میں کچھ لکھ بھی دیا ہے۔ جب دلی پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو مولوی صاحب نے وہ بنڈل یک انگریز کرنل کے سامنے پیش کر دیا ان کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہی ان کی موت کا حکم نامہ ہے۔ ٹیلر نے لکھا تھا۔

"مولوی محمد باقر نے شروع میں ان کو اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر ہمت ہار دی اور ان کی جان بچانے کی کوشش نہ کی۔ کرنل نے بنڈل الٹ پلٹ کر دیکھا اور مولوی صاحب کو فوراً گولی ماردی گئی اور ان کی جائیداد بھی بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔"

فیمس اردو پوئیٹس اینڈ رائیٹرس۔ صفحہ 140

مندرجہ بالا دونوں بیانات خصوصاً محمد حسین آزاد کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی محمد باقر نے ازروئے دوستی و انسانیت مسٹر ٹیلر کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ورنہ انہیں اپنے گھر او امام باڑہ میں پناہ نہ دیتے، انہیں ہندوستانی لباس پہنا کر گھر کے پچھلے دروازہ سے باہر نہ نکالتے بلکہ انہیں قصاص پر آمادہ لوگوں کے حوالے کر دیتے۔ اس کا احساس مسٹر ٹیر کو بھی تھا کیونکہ اس نے بھی لاطینی زبان میں جو تحریر لکھی تھی اس میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مولوی باقر نے انہیں پناہ دی لیکن بعد کو کسی غلط فہمی کی بنا پر اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ انہیں بچانے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ دوم یہ کہ اگر مولوی باقر کے دل میں اس قسم کا خیال آیا ہوتا تو وہ اس بنڈل کو انگریزوں کے حوالے کرنے ہی نہ جاتے جسے ٹیلر نے انہیں جاتے وقت دیا تھا۔ یہ ساری باتیں اس امر کی بین دلیل ہیں کہ مولوی باقر کو کسی سے ذاتی دشمنی نہ تھی، وہ انسانیت کے دشمن نہیں تھے بلکہ انہوں نے ہندوستانی عوام کے حق کی خاطر آواز بلند کی تھی۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مولوی محمد باقر کو ان کی حب الوطنی اور جنگ آزادی میں ان کے رول خصوصاً ان کے اخبار "دہلی اردو اخبار" کی وجہ سے اس انجام کو پہنچنا پڑا اور وہ انگریزوں کی سامراجی ذہنیت اور سازش کے شکار ہو گئے۔ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ جنگ آزادی کے اس متوالے اور قلم کے اس عظیم سپاہی نے آخر وقت تک ایک سچے محب وطن اور ایماندار صحافی ہونے کا مکمل ثبوت پیش کیا اور اپنی گرفتاری سے قبل تک مختلف مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے اخبار شائع کرتے رہے کیونکہ ان کی نظر میں صحافت ایک نہایت ہی مقدس پیشہ تھا جس کے ذریعہ نہ صرف حب الوطنی کو فروغ دیا جا سکتا ہے، تحریکیں پروان چڑھائی جا سکتی ہیں بلکہ قوموں کی تقدیریں بھی بدلی جا سکتی ہیں۔ اپنے اس پیمانہ صحافت پر کاربند رہتے ہوئے انہوں نے جنگ آزادی کو کامیاب بنانے کی حتیٰ المقدور سعی کی اور دامے درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے پیش پیش بھی رہے، خواہ اس کا انجام جو کچھ بھی ہوا۔

سامراجی ذہنیت کے نقیب انگریزوں نے 16 ستمبر 1857 کو انہیں شہید کر دیا۔ یہاں ایک واقعہ اور درج کرتا چلوں کہ کیپٹن ہڈسن کے حکم سے جب انہیں دہلی گیٹ کے باہر خونی دروازے کے سامنے شہید کیا جانا تھا اس سے قبل وہ عبادت الٰہی میں مشغول تھے تبھی ان کی نظر اپنے لخت جگر محمد حسین آزاد پر پڑی جو اپنے والد کے وفادار دوست کرنل سکندر سنگھ کی مدد سے ان کا آخری دیدار کرنے جائے شہادت پر آئے تھے۔ آزاد سائیس کا بھیس بدلے ہوئے تھے جب مولانا باقر نے نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ بلند کیا تو ان کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی جو عالم مفلسی میں گھوڑے کی باگ سنبھالے ہوئے تھے دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، باپ بیٹے نے زبان بے زبانی سے ایک دوسرے سے کچھ کہا آنسوؤں کے قطروں نے حال دل بیان کیا مولانا نے دعا کے انداز میں خدا حافظ کہا، ادھر شہادت کا وقت آ گیا فرنگی کپتان نے گھوڑا دبایا اور 77 سالہ بجد قوم اپنی مجاہدانہ آن بان کے ساتھ درجہ شہادت پر فائز ہو گئے اور فرنگیوں کو یہ پیغام دے گئے کہ:

تمہیں ہے سر کی ضرورت ہمیں شہادت کی
تم اپنا کام سنبھالو ہم اپنا کام کریں

حواشی و ماخذ

(1) سید مرتضی حسین: مطلع انوار، کراچی 1981

(2) مولانا محمد حسین آزاد: آب حیات مطبع لاہور 1950

(3) دہلی اردو اخبار، 13 ستمبر 1857ء

(4) Islamic Culture-Sajan Lal, 1950

(5) 1857 کے اخبارات اور دستاویز، محمد عتیق صدیقی

(6) مولوی عبدالحق، مرحوم دلی کالج ص 61

(7) Famous Urdu Poets and Writers Prof. Abdul Qadir Sawari ص 140

(8) امداد صابری - روح صحافت، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی 1968ھ

(9) محمد حسین آزاد حیات اور کارنامے، ڈاکٹر اسلم فرخی

(10) اردو ادب اور 1857، ڈاکٹر محمد سبطین

(11) انقلاب 1857، پی سی جوشی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی 1998

(12) ڈاکٹر عبدالاسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مطبوعہ لاہور 1936

محمد حسن اور گورکھپور کی بغاوت

1857 ء میں محمد حسن گورکھپور میں ہوئی بغاوت کے اہم رکن تھے باوجود اس کے کہ اس علاقے میں باغیوں کو تباہ کرنے کے لیے انگریزوں نے نیپالی گورکھا فوجوں سے مدد لی تھی لیکن محمد حسن اپنے اہم مقصد پر قائم رہے انھوں نے بہت سے زمینداروں اور راجاؤں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے اُکسایا اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے عام سپاہی اور کسان بھی ان سے اپنی اس مہم میں شامل کیے۔ اس مضمون میں ان کے بارے میں میں نے احمد علی شاہ کی کتاب کشف البغاوت گورکھپور کے حوالے سے لکھا ہے۔ احمد علی شاہ گورکھپور کے مشہور صوفی تھے اور ان کا امام باڑہ آج تک بہت مشہور ہے ان کی یہ کتاب 1860 ء میں پہلی بار آگرہ سے مکتبہ حیدریہ کے ذریعے شائع کی گئی۔ انھوں نے بغاوت کے حالات دن تاریخ کے ساتھ 1857 سے لکھنے شروع کیے تھے اس کتاب میں بطور انگریزوں کے دشمن کے محمد حسن کا ذکر حاوی ہے کشف البغاوت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسن ایک بہادر شخص تھے جنھوں نے اپنی جان کی پروا کے بغیر انگریزی سرکار کی مخالفت کی نیپالی فوجوں کی موجودگی کے باوجود انھوں نے علاقائی راجاؤں کی خلعت پوشی کروائی اور بہت سے عہدوں پر اپنے باغی ساتھیوں کو فائز کروایا۔

18ویں صدی کے آغاز میں گورکھپور اودھ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ 1722 میں جب سعادت حسن خاں نے اودھ کی باگ ڈور سنبھالی تو گورکھپور بھی ان کے پاس آ گیا۔ سعادت خاں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہاں کے علاقائی راجاؤں کی طاقت کو کم کر کے ایک بہتر حکومت قائم کریں لیکن ایسا کرنا بہت مشکل تھا۔ ان کے بعد صفدر جنگ بھی انھی کوششوں میں مصروف رہے۔ اور اس کے بعد شجاع الدولہ۔ آصف الدولہ کے وقت میں 1778 میں کرنل ہینے (Hannay) کو یہاں سے ٹیکس رزگان وصول کرنے کا کام دیا گیا اس نے لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے بہت سارے پرانے

افسران کو ہٹا دیا اور دفتروں کو بند کر دیا۔ رعیت کی خوشحالی سے اس کو کوئی مطلب نہ تھا لوگ پریشان تھے اور بنجارے اور بٹولان حالات کا خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ 1801 میں گورکھپور اور اس کے آس پاس کے علاقے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیے گئے تھے یہ انتظام اودھ سرکار اور کمپنی کے مابین لگان کے معاملے کو سلجھانے کے لیے کیا گیا تھا۔ انگریز لگاتار اس علاقے میں قاعدے قانون قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے 1815ء میں انھوں نے نیپال کے بادشاہ کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا 1829ء میں گورکھپور، غازی پور اور اعظم گڑھ کو ملا کر گورکھپور نام کا ایک علاقہ بنایا گیا 1835ء میں یہ علاقہ ختم کر دیا گیا تھا لیکن 1853ء میں اسے دوبارہ شروع کیا گیا تھا انگریزی سرکار کے آنے سے بڑے زمینداروں کو کافی پریشانی ہوئی ان کی زمین اکثر ضبط کر لی گئیں اور انکی سرکار نے جنگلوں پر انکے حقوق ماننے سے انکار کر دیا۔ 1857ء میں ڈبلو پیٹرسن (W Patterson) یہاں کے کلکٹر تھے جبکہ ڈبلو وائن یارڈ (W Wynyard) جج تھے اور ایف برڈ (F Bird) جوائنٹ مجسٹریٹ گورکھپور تھے اس بغاوت کے آثار سب سے پہلے 25 مئی کو عیاں ہوئے جب یہاں کے فوجیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑھل گنج کے علاقے سے پولس کو بھگا دیا اور نرہر پور کے سرداروں نے تقریباً (50) پچاس قیدیوں کو آزاد کر دیا۔

محمد حسن نوابی سرکار میں ناظم کے عہدے پر فائز تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد انہیں اس عہدے سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اب انہوں نے گورکھپور کے علاقے میں بغاوت کی باگ ڈور سنبھالی 1857 کی 18 اگست کو انہوں نے گورکھا دستے پر حملہ کیا کیونکہ نیپال کی فوجیں انگریزوں کا ساتھ دے رہی تھیں یہ دستہ گھاگرا ندی کے قریب تھا حالانکہ اس لڑائی میں محمد حسن اور ان کے ساتھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے لیکن پھر بھی ان کی اس ہمت کا اثر یہ ہوا ستاسی بانسی، بڑھیاپار اور چلوپار کے راجہ بھی کھلے عام انگریزوں کے خلاف ہوگئے محمد حسن نے جیل پر بھی حملہ کیا اور بہت سے قیدیوں کو آزاد کر دیا یہ لوگ بھی باغیوں کے ساتھ ہو لیے ان کی اس حکمت عملی سے انگریزی سرکار گورکھپور میں اور کمزور پڑ گئی تبھی انگریزی افسران مع اہل و عیال یہاں سے بھاگ گئے صرف برڈ (Bird) نے رکنے کی ہمت کی۔ انگریز مورخین کا کہنا ہے کہ ان قیدیوں میں شرف خان نام کا ایک شخص تھا جس کی برڈ سے ذاتی دشمنی تھی۔ قید سے آزاد ہونے کے بعد شرف خان اور محمد حسن [illegible] سے [illegible] تحریک [illegible] آزاد [illegible] اب انگریزوں کا راج گورکھپور

میں ختم ہو چکا ہے اگر وہ اپنی خیر چاہتا ہے تو شہر چھوڑ کر چلا جائے اس ملاقات کا برڈ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے بھی گورکھپور چھوڑ دیا۔ محمد حسن نے اُسے پکڑ کر لانے والے کو انعام دینے کا اعلان کیا تھا اس سے اس کا سفر اور بھی مشکل ہو گیا جنگلوں سے گزرتا ہوا برڈ کسی طرح چھپرا پہنچا۔ مشرف خان کو محمد حسن نے نائب ناظم کے عہدے پر فائز کیا۔ سارے بڑے زمیندار محمد حسن کے پاس حاضر ہوئے اور اس نے انہیں اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کرنے کی اجازت دے دی جن لوگوں کی زمین جبراً ضبط کی گئی تھیں وہ انہیں واپس کر دی گئیں پٹواریوں سے سبھی کاغذات منگوا لیے گئے اور انگریزوں کی حکومت کو پوری طرح سے نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

احمد علی شاہ نے اپنی کتاب کشف البغاوت گورکھپور میں محمد حسن کو دجّال کے نام سے پکارا ہے۔ احمد علی غدر کے وقت میں انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے انہوں نے انگریز افسران کا سامان اپنے امام باڑے میں رکھوا لیا تھا جب محمد حسن کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے اپنے آدمیوں کو امام باڑے میں بھیجا اور احمد علی سے درخواست کی کہ وہ انگریزوں کا اسباب اس کے حوالے کر دیں لیکن احمد علی نہ مانے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد حسن نے زبردستی امام باڑے سے اسباب اٹھوا لیا۔ احمد علی کو اس بات کا بہت تعجب تھا کہ شیعہ مسلمان ہونے کے باوجود اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محمد حسن نے اس چیز کا پورا پورا خیال رکھا کہ آصف الدولہ کی دی ہوئی سونے چاندی کے ورق کی تعزیہ جو یہاں موجود تھی محفوظ رہی۔ اس قصے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان جو باغی تھے وہ دراصل انگریز حکومت کی معاشی اور سماجی پالیسی کے خلاف لڑ رہے تھے مذہبی مسائل ان کے لیے اہم نہیں تھے اگر ہر مسلمان باغی سردار صرف جہاد کے لیے لڑ رہا ہوتا تو وہ شاید مسلمان صوفی یا مولانا کو کوئی تکلیف یا دکھ نہ پہنچاتا لیکن اس بغاوت میں احمد علی اور محمد حسن ایک ساتھ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں محمد حسن نے یہ سب سامان و اسباب اپنے یا اپنی ذاتی ملکیت بڑھانے کے لیے نہیں رکھا تھا بلکہ انگریزوں کو سزا دینے کے لیے لیا تھا۔ کشف البغاوت میں محمد حسن اور مشرف خان کی بہت برائی کی گئی ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دراصل یہ لوگ کس قدر انگریزوں کے خلاف سرگرم تھے کیونکہ احمد علی انگریزوں کے بڑے خیر خواہ [illegible] تھے ان کا کہنا ہے کہ بہت سے عام لوگ بھی لوٹے گئے لیکن [illegible] محمد حسن کا [illegible] کوئی واسطہ تھا یا نہیں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے جب انگریزوں نے دوبارہ گورکھپور پر فتح

حاصل کرنی شروع کی تب جنوری 1858ء میں اُنہیں گوبرناتھ اور پرونو کے علاقے سے محمد حسن کا ایک کاغذی اعلان ملا جس میں لکھا تھا کہ ہندوستانیوں کی قسمت کا تارہ چمک اُٹھا ہے اور انھوں نے سب ہندوستانیوں کو دعوت دی کہ وہ آکر اس کے ساتھ ملیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں اس کی مدد کریں۔ انگریزوں کو یہ اعلان دیکھ کر بہت غصہ آیا اور محمد حسن کے چار برق اندازوں کو فوراً پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ رام کوٹا کا زمین دار جو کہ محمد حسن کا دوست اور ساتھی تھا انگریزوں کا اگلا نشانہ بنا اس کے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ جب انگریز اور گورکھا فوج بہرائچ کے علاقے میں پہنچیں تب باغیوں سے اس کا سامنا ہوا۔ گورکھا فوج کے لیے یہ جنگ آسان نہ تھی کافی لڑائی کے بعد باغی تتر بتر ہو گئے اور انگریز دگھور کھا فوج گورکھپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگی۔ گورکھپور کی سرحد سے باہر ایک بار پھر باغیوں اور انگریزوں کا مقابلہ ہوا اس میں بہت سے باغی مارے گئے اور کافی ندی میں ڈوب کر مر گئے 11 جنوری 1858ء کو انگریزوں نے دوبارہ گورکھپور پر قبضہ کر لیا۔ محمد حسن ٹانڈا چلے گئے جو فیض آباد کے پاس تھا وہ یہاں سے دوبارہ باغیوں کا رابطہ منقطع کرنے کی کوشش کرتے رہے اُدھر ان کے نائب ناظم مشرف خان میرداا اور مجھولی کے علاقے میں انگریزوں کا سامنا کر رہے تھے۔

نرائن دیال قانون گو اور سنگرام لال بھی محمد حسن کے خیر خواہ تھے ان کے گھر بھی انگریزوں نے لوٹ لیے اور ان کے مال و اسباب کو جلا دیا گیا محمد حسن کے ساتھیوں کی مکمل ہار 20 فروری 1858ء کو ہوئی۔ مسٹر برڈ نے دوبارہ گورکھپور کی باگ ڈور سنبھال لی بڑھیا پار، چلو پار، ستاسی اور شاہ پور کی شہنشاہیت ختم کر دی گئی مشرف خان کو انگریزوں نے گرفتار کیا اور پھانسی پر چڑھا دیا گیا، افسوس کہ محمد حسن کی زندگی کا صحیح پتہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ انگریزوں سے مقابلہ آرائی اور ہار کے باوجود محمد حسن کے قومی جذبے کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ اس وقت ہندوستانیوں کے پاس فوجی وسائل و ذرائع انگریزوں کے مقابلے بہت کم تھے لیکن اس وقت بھی ہندوستانیوں کا قومی جذبہ انگریزوں کے فوجی وسائل و ذرائع کے آگے جھکا نہیں بلکہ وہ ہر لمحہ مقابلہ آرائی کے لیے صف آرا ہوتے رہے۔

بہار میں انقلاب ستاون کا قائد کنور سنگھ

تاریخ ہند نے مختلف اوقات میں کروٹیں لی ہیں اور ہر دور میں یہاں کے عوام نے اپنی ہمت، مردانگی، جوش، جذبہ اور عزم محکم کا پکا ثبوت دیا ہے۔ انگریز جب یہاں تجارت کے لئے آئے تو انہیں تاریخ ہندوستان کا بخوبی علم تھا کہ یہاں کی ماؤں نے بے شمار سورما سپوت پیدا کئے ہیں جو ان کیلئے ہر محاذ پر مزاحمت کا سبب بنیں گے۔ لیکن وہ بھی اپنی سامراجی ذہنیت سے مجبور تھے اور ہر سو کوشاں تھے کہ اس ملک کو اپنے زیر نگیں کرلیا جائے۔ انگریزوں کی نیت کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو سورت اور بمبی کے گورنر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر کو لکھا تھا۔ وہ قسطراز ہے کہ۔

"وقت کا تقاضہ ہے کہ تجارتی معاملات کی درستگی کے لئے آپ کے ہاتھوں میں تلوار بھی ہو"

یہ بیان تجارتی معاملات کے سلسلہ میں صحیح ہو کہ نہ ہو حکومت ہند پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں حد درجہ صحیح ہے کیونکہ انہوں نے اسی سوچ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی میں فوجیوں کی بھرتی کی تھی 1757 کی پلاسی کی جنگ اور اس سے قبل کی دیگر جنگیں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف عوامی احتجاج اور غم و غصہ کا دور 1757 سے لے کر 1857 کے درمیان کئی بار مختلف سطحوں پر دیکھنے میں آیا لیکن اسے آزادی کے لئے کی گئی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

ایسا اس لئے کہ یہ ساری کاروائیاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ تیار کردہ فوجی دستہ میں ہوا کرتی تھیں مثلاً 1760 کی لودھ کی بغاوت جو بنگال آرمی میں ہوئی یا پھر Quilon Mutiny of 1812, Telli Chery Mutiny of 1780' Rangpore Mutiny of 1825 وغیرہ اسی طرح بیرک پور کی بغاوت جو 1824 میں ہوئی یہ ساری بغاوتیں اس بڑی بغاوت کا پیش خیمہ تھیں اس سے مفر ممکن نہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی واردا تیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بغاوت کی شکل میں ہوتی رہتیں جس پر انگریز کسی طرح قابو پا لیتے تھے، اسے دبانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں عوامی شرکت نہیں کی تھی یا یوں کہا جائے کہ اس کے در پردہ جنگ آزادی یا آزادی حاصل کرنے کی خواہش جیسے عوامل کارفرما نہیں ہوتے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات تنخواہوں، ترقی اور مراعات کو لے کر ہوا کرتے جس میں نابرابری اور احساس کمتری جیسے عوامل اہمیت کے حامل تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت کام کرنے والے سپاہیوں کو ان کی حیثیت کے مطابق نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ ہی عہدہ دیا جاتا تھا ایسے میں اضطراب اور بے چینی کا اظہار بغاوت کے ذریعے ہی کیا جا سکتا تھا۔ جب اس طرح کا غم و غصہ پیدا ہو جاتا تو سپاہیوں کی خیر خواہی کے نام پر بطور مراعات چند اعلانات کیے جاتے کہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے گا یا ان کو مختلف سہولتیں دی جائیں گی لیکن اکثر و بیشتر یہ اعلان ہی ہوتے ان پر عمل نہیں کیا جاتا، وعدہ وفا نہیں کیا جاتا جس سے سپاہیوں میں ایک قسم کی بیگانگی اور احساس محرومی پیدا ہوئی اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ تنخواہیں تک وقت پر نہیں دی جاتیں۔ اس صورت میں کمپنی کے خلاف فوجی

(1) یہاں ان مجاہدین آزادی کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جنہوں نے چربی لگے ہوئے کارتوس کے استعمال سے گریز کیا جنہیں انگریز افسروں کے ذریعہ سزا سنائی گئی تھی۔ ان سبھی نے بغاوت پھوٹ پڑنے کے بعد آخری وقت تک انگریزوں سے جنگ کی اور آخر کار اس معرکے میں کام آئے اور ہمیں پیغام دے گئے کہ سامراجیت کو اس ملک سے ختم [illegible] ہندوستانیوں کی ذمہ داری ہے اور اسی مشن پر کاربند رہتے ہوئے ہم نے 1947 [illegible] آزادی حاصل کی۔ (1) حولدار ماتادین (2) شیخ پیر علی (نائیک) (3) امیر قدرت علی (4) شیخ حسن الدین (نائیک) (5) شیخ رمضان محمد (نائیک) (6) شیتل سنگھ (7) جہانگیر خان (8) میر محسن علی (9) علی نور خان (10) میر حسین بخش (11) متھرا سنگھ (12) نارائن سنگھ (13) لال سنگھ (14) شیو دان سنگھ (15) شیخ حسین بخش (16) صاحب داد خان (17) بشن سنگھ (18) بدھو سنگھ (19) شیخ نندو (20) نواب خان (21) شیخ رمضان علی (22) علی محمد خان (23) لچھمن سنگھ (24) درگا سنگھ (25) نصر اللہ خان (26) محراب خان (27) درگا سنگھ (دوئم) (28) نبی بخش خان (29) جربان سنگھ (اول) (30) بھدو خان (31) جر خان سنگھ (دوئم) (32) عبداللہ خان (33) تحسین خان (اول) (34) زبردست خان

(باقی اگلے صفحہ پر)

بغاوت یا انقلاب کا پھیل جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس مرحلے پر فوجیوں کے ذریعہ گائے اور سور کی چربی لگے ہوئے کارتوس کا استعمال کروانے کی ضد نے آگ پر گھی کا کام کیا اور بغاوت بھڑک اٹھی جسے انگریز غدر یا Mutiny کہتے ہیں۔

اس جدوجہد آزادی کی شروعات یوں تو 9 مارچ کو اس وقت ہوئی جب بنگال کے بیرک پور میں واقع 34 ویں رجمنٹ کے سپاہی منگل پانڈے نے انگریز سارجنٹ میجر پر حملہ کردیا جس کی پاداش میں انہیں پھانسی کی سزادے دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس سے فوج اور عوام دونوں میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ 9 مئی کو اس سے بڑا واقعہ پیش آیا کہ کارتوس کا استعمال نہ کرنے پر پچاسی[1] سپاہیوں کا کوٹ مارشل کردیا گیا اور انہیں دس سال کی سزا سنائی گئی۔ اس طرح ہندستانیوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور راتوں رات بغاوت کا شعلہ جوالا پھوٹ پڑا۔ سب سے پہلے ان مقید سپاہیوں کو جیل سے چھڑا لیا گیا جن کے خلاف یہ حکم سنایا گیا تھا اور پھر انگریزوں کی سامراجیت کا جواب قتل و غارت گری کر کے دیا جانے لگا اور پھر جو فرنگی جہاں ملا اسے تہہ تیغ کردیا گیا۔ اس انقلاب کی لہر بہار میں بھی دوڑ گئی جہاں دانا پور کے سپاہی پہلے سے ہی اس کے منتظر تھے۔ جون ولیم کے اپنی تصنیف میں رقمطراز ہے کہ:

---

(35) مرتضیٰ خان (36) برجور خان (37) عظیم اللہ خان (اول) (38) عظیم اللہ خان (دوئم) (39) کالا خان (40) شیخ سعد اللہ (41) سالار بخش خان (42) شیخ رعیت علی (43) دوارکا سنگھ (44) کالکا سنگھ (45) رگھو بیر سنگھ (46) بلدیو سنگھ (47) درشن سنگھ (48) امداد حسین (49) پیر خان (اول) (50) موتی سنگھ (51) شیخ آرام علی (52) ہیرا سنگھ (53) سیوا سنگھ (54) مراد پیر خان (55) شیخ آرام علی (56) کاشی سنگھ (57) اشرف علی خان (58) قادر داد خان (59) قادر داد خان (60) بھگوان سنگھ (61) میر امداد علی (62) شیو بخش سنگھ (63) لچھمن سنگھ (64) شیخ بخش سنگھ (65) عثمان خان (66) درداے سنگھ (67) شمس العلی خان (68) شیخ غیاث خان (69) شیخ امید علی (70) عبد السحاب خان (71) رم سہائے سنگھ (72) پناہ علی خان (73) لچھمن دوبے (74) رم شرن سنگھ (75) شیخ خواجہ علی (76) شیو سنگھ (77) شیتل سنگھ (78) موہن سنگھ (79) ولایت علی خان (80) شیخ محمد علی خان (81) نندر سنگھ (82) فتح خان (83) میکو سنگھ (84) شیخ قاسم علی (85) رام چرن سنگھ

''نہ صرف گنگا پار کے ضلعوں میں بلکہ دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقوں میں
بھی دیہاتی عوام نے بغاوت کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں شاید ہی کوئی آدمی ہندو یا
مسلمان ایسا بچا ہو جو ہمارے خلاف کھڑا نہ ہو گیا تھا''
جون ولیم کے جلد دوئم ص 195

1857 کی جدوجہد آزادی سے متعلق چاہے جتنے خیالات پیش کئے جائیں اور اسے چاہے جو نام دیا جائے ان سب میں یہ خیال زیادہ تقویت بخش ہے کہ اس جنگ آزادی میں سامراجیوں سے نجات حاصل کرنا عوام کا مشن اور مقصد تھا اور شاید اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے عوام کی دبی ہوئی، گھٹی ہوئی روح میں آزادی کے لئے جو بے چینی یا اضطراب موجزن تھا اس انقلاب میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اگر بہار کی ہی بات کی جائے تو 1857 سے قبل اس پورے خطے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف نفرت پھیل چکی تھی۔ جس کی مثال سنتال پرگنہ ضلع کے تحت دیو گھر سب ڈویژن کے روہنی نامی قصبہ میں پھوٹ پڑنے والی بغاوت سے دی جاسکتی ہے۔ یہاں دیسی فوجی دستہ (پیدل) کے 32 ویں رجمنٹ کی، ایک کمپنی کا صدر دفتر تھا جس کی کمان Mc Donald کے ہاتھ میں تھی جو کہ پانچویں کیویلری کا حصہ تھا۔ اس ٹکڑی نے سب سے پہلے 12 جون 1857 کی شام کو بغاوت کا اعلان کیا تھا اور رجمنٹ کے تین افسران پر حملہ کر کے یک کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور دو کو شدید طور پر زخمی کیا تھا۔

لفٹننٹ نارمن، ڈاکٹر گرانٹ اور ان کے ساتھی پر حملہ کرنے کی پاداش میں 16 جون کو تین نوجوانوں کا کورٹ مارشل کر کے انہیں پھانسی دے دی گئی اس واقعہ کے منفی اثرات سے بچنے کے لئے اس رجمنٹ کو روہنی سے ہٹا کر بھاگلپور بھی لایا گیا لیکن انگریزوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی اور اس واقعہ نے بھی بغاوت میں آگ پر گھی جیسا کام کیا۔

بہار میں 1857 کی جنگ آزادی کا مرکز بہار کا ہری ہر چھتر کا میلہ بنا تھا۔ یہیں پر آزادی کے متوالوں نے یہ مشورہ کیا تھا کہ بہار میں جنگ آزادی کی کمان بابو کنور سنگھ کو سونپ دی جائے کیونکہ وہ نہ صرف تجربہ کار، ذی ہوش اور بزرگ تھے بلکہ انہیں میدان جنگ میں دشمنوں سے

نبرد آزما ہونے کا عملی تجربہ بھی تھا۔ انہیں یہ ذمہ داری بھی دی گئی تھی کہ وہ نیپال کے راجہ کو راضی کریں کہ وہ اس جنگ میں ہمارا ساتھ دیں اور انہیں اس سلسلے میں راجہ سے مثبت جواب بھی مل گیا تھا اس دوران سامراجی فرنگیوں سے جنگ کے لئے بہار کے عوام بھی تیار تھے اس مرحلے پر بہادر شاہ ظفر نے بھی سب کا حوصلہ بڑھایا تھا اور اعلان کیا تھا کہ جو لوگ بھی ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائیں گے وہ سب کچھ ان کے سپرد کر دیں گے۔ بہار میں اس مشن کی قیادت شاہ آباد کے حاکم بابو کنور سنگھ کے ہاتھوں میں تھی جو مغل سلطنت کی علامت مغلیہ پرچم کو لے کر اس جنگ میں کود پڑے تھے۔

جہاں یہ مغلیہ پرچم مجاہدین کا جوش، جذبہ اور حوصلہ بڑھا رہا تھا ان کے درمیان یک جہتی کا پیغام عام کر رہا تھا وہیں دوسری طرف روٹی اور کمل جیسی علامتوں نے بھی اپنا کام کیا تھا۔ اس کے ذریعہ مجاہدین میں پیغام رسانی کا کام انجام دیا جا رہا تھا۔ اس سب کا یہ اثر ہوا کہ بہار کے چپہ چپہ میں مجاہدین آزادی کا پیغام عام ہو گیا اور اس بات کا انتظار کیا جانے لگا کہ ایک بار حکم ملے تو بغاوت کا بگل بجا دیا جائے اور انگریزوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اسی درمیان 25 جولائی 1857 کو دانا پور کے سپاہیوں نے علی الاعلان بغاوت کر دیا اور وہ سامان جنگ کے ساتھ دریائے سون کے کنارے آن پہنچے۔ لیکن ان کے پاس دریا پار کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس موقع پر کنور سنگھ نے اپنے کاشتکاروں کے ذریعہ کشتیوں کا انتظام کروا کے انہیں دریا پار کرایا۔ 26 جولائی کو سپاہی دریا پار کر گئے اور انہوں نے کنور سنگھ کی قیادت میں 27 جولائی کو آرہ شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کو شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بھی سپاہی اس بوڑھے شیر کی قیادت میں مردانگی سے لڑے اور انگریزوں کو شکست فاش ہوئی۔ لیکن جب 3-1 اگست کے درمیان مزید انگریزی فوجی کمک آگئی تو کنور سنگھ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جگدیش پور جانے کا فیصلہ کیا۔ نیز یہ بھی کہ اب ان سامراجیوں سے آمنے سامنے کی جنگ کرنے کی بجائے گوریلا طریقہ جنگ اپنایا جائے۔ جگدیش پور میں بھی ان کا مقابلہ انگریزوں سے ہوا۔ وہاں سے کنور سنگھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے اس درمیان انہوں نے مرزا پور میں انگریزوں کو دھول چٹائی لیکن

انگریزان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اس لئے وہ الہ آباد کی طرف کوچ کر گئے ان کا مقصد اودھ جا کر ہی دم لینا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے دہلی کی طرف پیش قدمی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن ایسا ہو نہ سکا اور وہ اتر ولی اعظم گڈھ کے قریب پہنچے جہاں انہیں اور مجاہدین کا ساتھ مل گیا۔ اس بار انھوں نے انگریزوں کو کڑی ٹکر دی۔ انہیں ناکوں چنے چبوا دیے حتیٰ کہ اب انگریزوں میں سراسیمگی تھی کہ کہیں یہ بوڑھا شیر بنارس پر حملہ کر کے کلکتہ اور لکھنؤ کے درمیان حمل نقل پر قابض نہ ہو جائے اور ان کا رابطہ منقطع نہ کر دے۔ اس لئے انگریز فوج جلد از جلد الہ آباد سے ان کے مقابلے کے لئے بھیجی گئی۔ کنور سنگھ دسمبر 1857 سے جنوری 1858 تک لکھنؤ میں مقیم رہے۔ یہاں بھی وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ یہاں سے وہ فیض آباد اور ایودھیا پہنچے اس کے بعد انھوں نے اعظم گڈھ کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اتر ولی میں کرنل ملین کی انگریزی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔

اعظم گڈھ میں کنور سنگھ اور انگریزوں کے درمیان سخت لڑائی ہوئی اور وطن کے جیالوں نے اس بوڑھے شیر کی قیادت میں انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے لیکن آخر وقت قسمت نے یاوری نہ کی اور نہ ہی مجاہدین آزادی حوصلہ رکھ سکے۔ خود کو دشمنوں سے گھرا دیکھ کر اس درمیان کنور سنگھ دریا عبور کر کے اپنے وطن جگدیش پور میں داخل ہو گئے۔ جہاں ان کے بھائی امر سنگھ بہت پہلے سے کسانوں کے ہمراہ آمادۂ پیکار تھے۔ گنگا پار کرتے وقت انگریزی فوج نے ان پر گولیوں کی بارش کر دی ایک گولی ان کے کلائی میں لگی لیکن وہ اپنے مشن پر قائم رہے اور شدید غصہ، نفرت اور حقارت کے جذبے کے تحت اس شیر نے انگریزوں کی گولی سے زخمی اپنا بازو کاٹ کر سپرد گنگا کر دیا اور گنگا ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا اپنے سپوت کی آخری قربانی کو شرف قبولیت عطا کر"

اتنے بڑے حادثہ کے بعد بھی انہوں نے کپتان لی گرانڈ کو شکست دی لیکن یہ فتح ان کی آخری فتح ثابت ہوئی اور اس فتح کے تین روز بعد یعنی 26 اپریل 1858 کو کنور سنگھ نے وفات پائی تاہم جب تک

وہ زندہ رہے انہوں نے شیر کے مانند زندگی گزاری اور ہمیں یہ پیغام دے گئے کہ ہندستانی شیر انگریز بھیڑیوں کے شکار سے گھبراتے نہیں بلکہ ان سے اپنی شجاعت اور ہمت کی داد لیتے ہیں اور مرتے دم تک دشمنوں کے دل پر خوف کے سائے کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں، وہ تاحیات اپنے حامیوں کے لئے قوت بازو بنے رہتے ہیں۔ اس حقیقت کا اقرار گورنر بنگال نے بھی کیا تھا۔ بقول گورنر بنگال 26 اپریل کو کنور سنگھ کی موت ہوئی لیکن وہ مجاہدین (باغیوں) کے لئے طاقت کے مینار کی طرح تھے۔

> ''جب کنور سنگھ مرا تو اس کے ساتھیوں نے اس کے موت کی خبر کو کچھ عرصہ تک نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا کیونکہ اس کا نام ہمیشہ اس علاقہ کے باغیوں کے لئے طاقت کے ایک مینار کی طرح تھا''

Bengal Under Governer Page -88

۱۸۵۷ کی کہانی تصاویر کی زبانی

ری مغل تاجدار شہنشاہ ھند
ز مرزا راج الدین بہادر شاہ ظفر
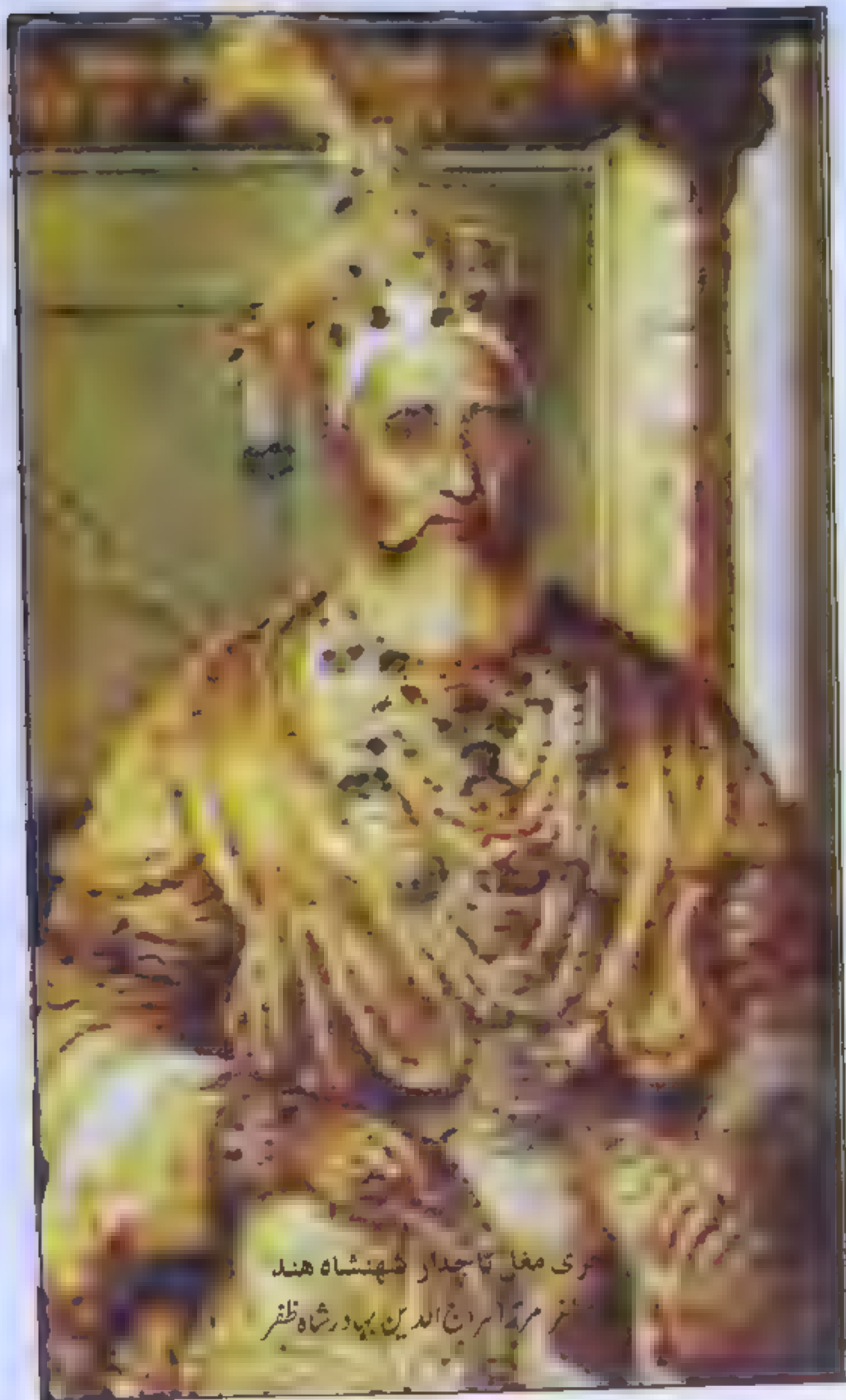
بہرام پور میں منگل پانڈے کے ساتھیوں سے اسلحہ
چھین کر انہیں کو نہتا کئے جانے کا ایک منظر۔

چھٹویں نیٹو انفینٹری کے افسروں کے قتل کئے جانے کا ایک منظر جس میں
باغی گھوڑ سواروں نے اہم کردار ادا کیا۔
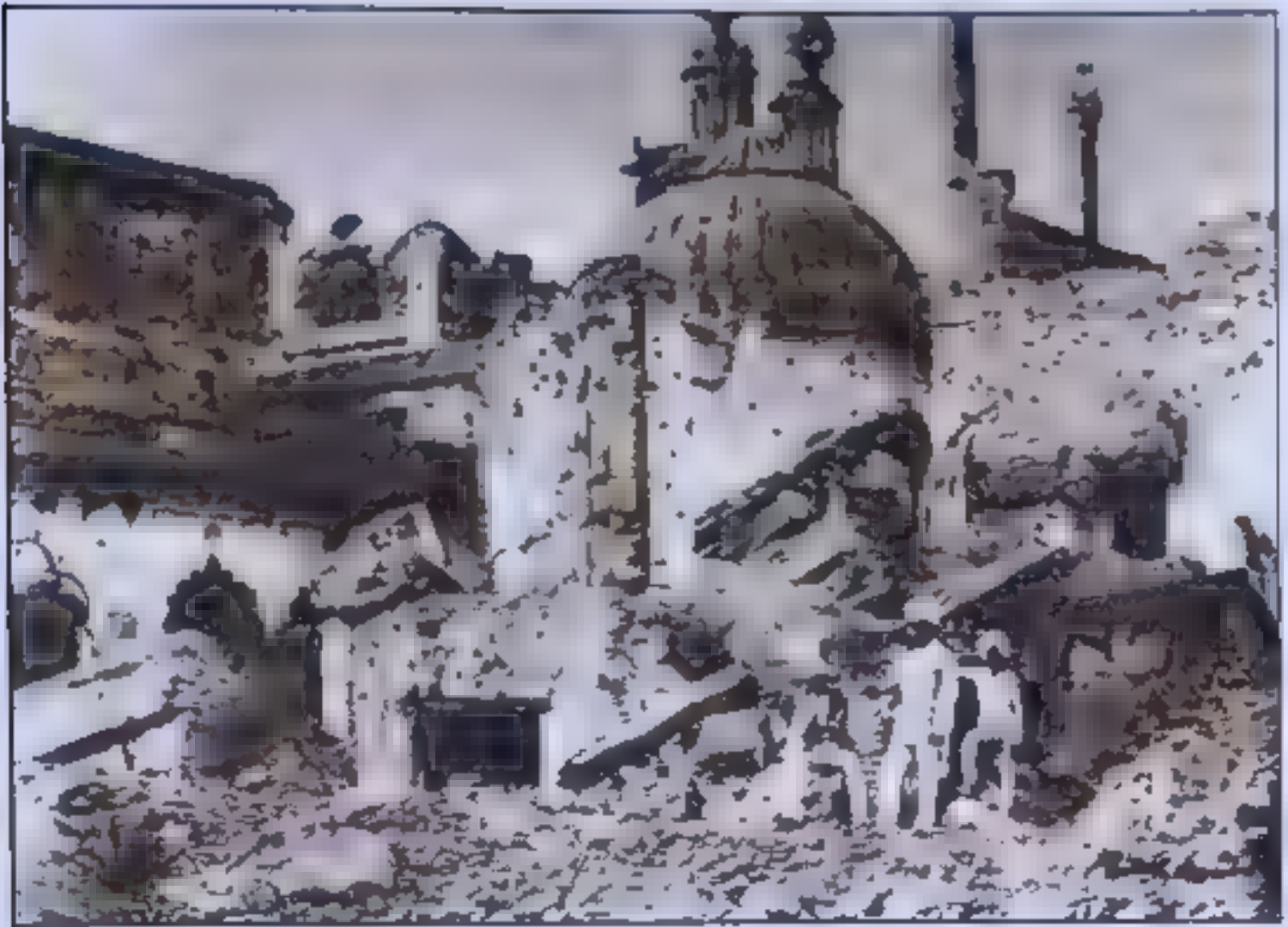
انگریزوں کے ذریعہ انقلاب کے دوران کی جانے والی
انہدامی کاروائی کی منھ بولتی تصویر۔

بغاوت کے دوران وہ ریزیڈنسی جس میں انگریز پناہ
گزیں تھے۔
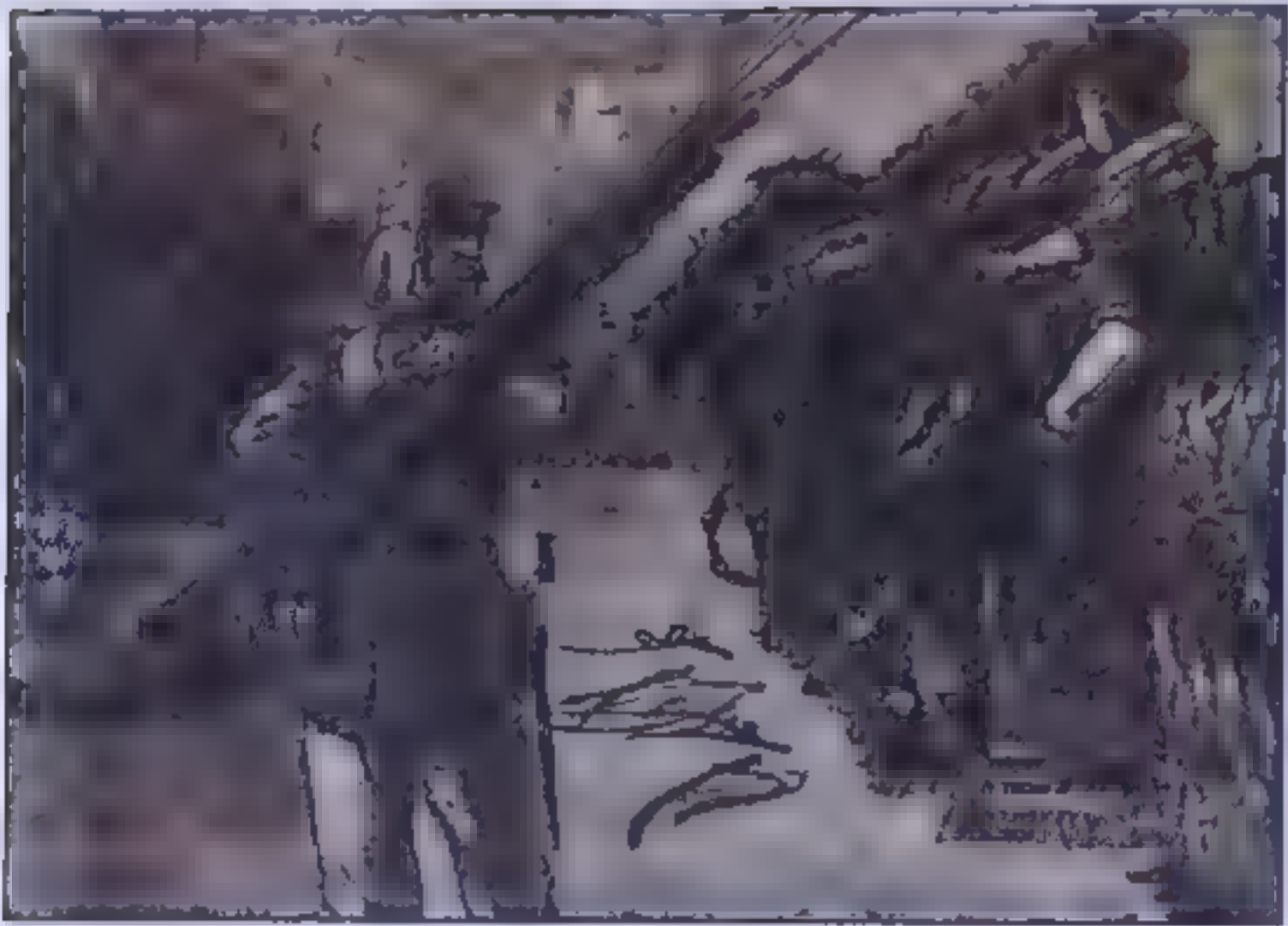
مجاہدین آزادی سے اسلحہ ضبط کرتا ہوا ایک انگریز افسر۔

بہار میں انقلاب ستاون کے قائد ویر کنور سنگھ اپنے سپاہیوں کے ساتھ۔

بغاوت کے دوران چورنگی (کلکتہ) پر انگریز فوجوں کے قبضہ کیے جانے کے بعد ہو کا عالم

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد عوام پر مظالم کے
پہاڑ ڈھاتے انگریز افسر

تانتیا ٹوپے۔

بہادر شاہ ظفر

منگل پانڈے

ویر کنور سنگھ۔

بیگم حضرت محل

زینت محل
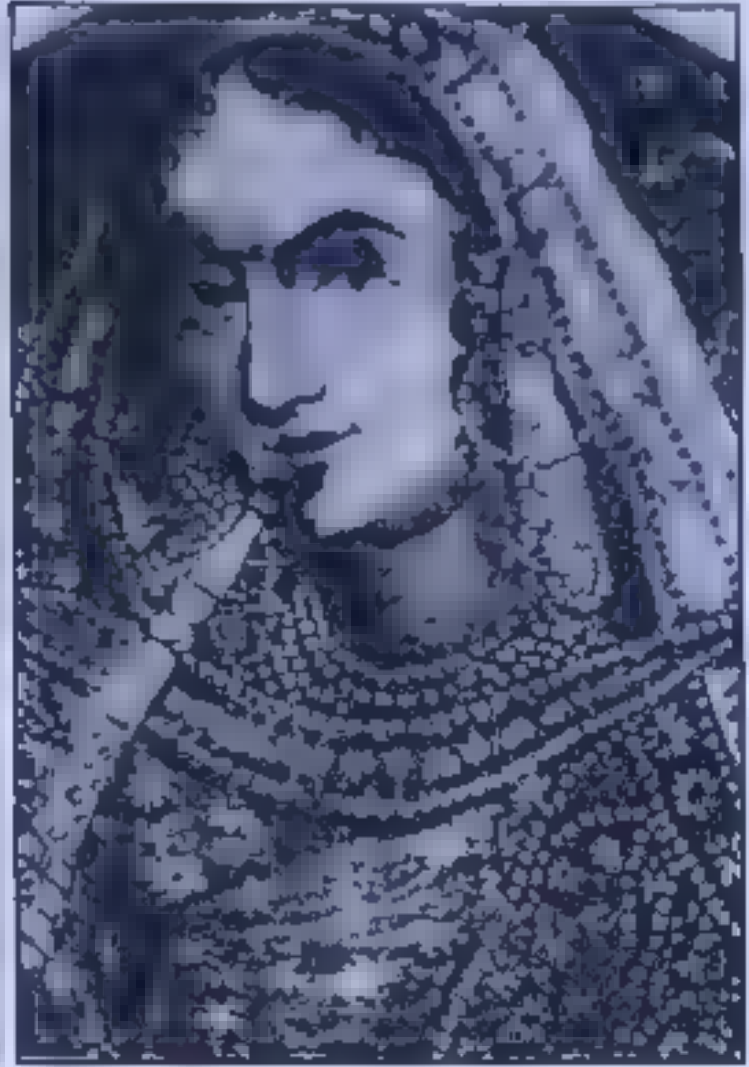
اودا بائی

جھانسی کی رانی لچھمی بائی

ایک چوکیدار دوسرے چوکیدار کو چپاتی دیکر
پیغام رسانی کا عمل انجام دیتے ہوئے۔

کنول کا پھول جو تحریروں کے علاوہ علامت کی
خاطر استعمال ہوتے تھے کے ذریعے ترسیل ہوتا تھا۔

۱۸۵۷ کی دہلی جدوجہد آزادی سے متعلق منصوبوں اور پیغاموں کو عام
کرنے میں ان چیزوں کا اہم کردار رہا ہے۔

میرٹھ کے پریڈ گراؤنڈ پر کرنل فینس کے قتل کا ایک منظر۔

دلی میں قتل و غارت گری کا ایک اور منظر

مجاہدین کے ذریعے اودھ میں کی جانے والی تیاری کا ایک منظر جو انقلاب ستاون
کا ایک اہم مرکز بنا۔

زینۃ المساجد کے سامنے رائل آرٹلری گروپ کی
ایک تصویر

سکندر باغ (لکھنؤ) میں واقع ایک عمارت جسے ۱۸۵۷ کی اولین جنگ آزادی میں خونی جدوجہد کی یادگار کے طور پر ہماری وراثت قرار دیا گیا ہے۔

انگریزوں کے ذریعے کی جانے والی قتل و غارت گری اور بے قصور عوام کو سولی چڑھائے جانے کا ایک منظر۔

اودھ میں غازیوں کے ذریعے ہائی لینڈر رجمنٹ کے ساتھ صف آرائی۔

سلیم گڑھ قلعے سے فرار ہوتے ہوئے سپاہی۔
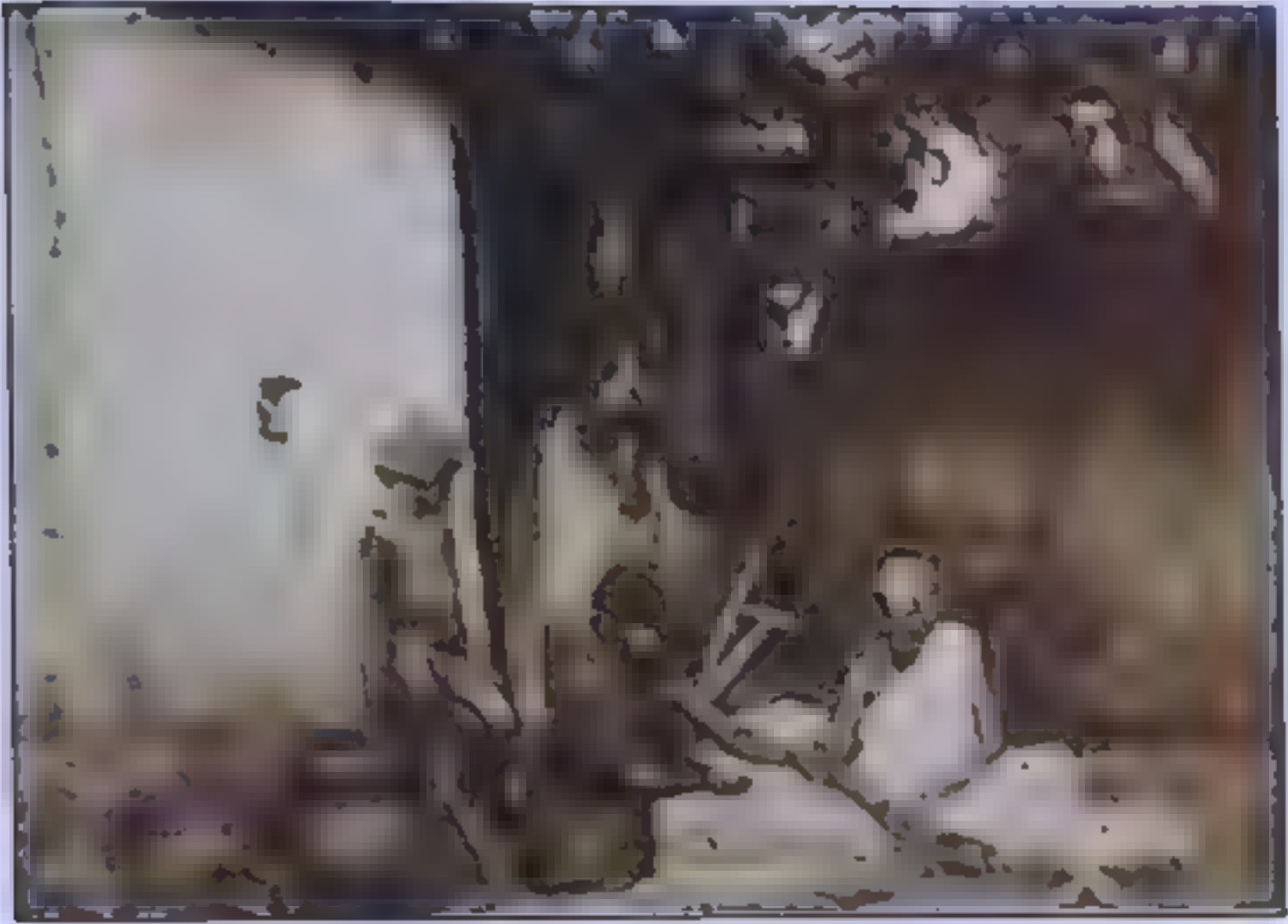
سامراجیوں کے ذریعے پھیلائی جانے والی بدحالی اور ابتری کا ثبوت ایک مفلوک الحال کنبہ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں آدی واسیوں کی بدحالی کی منھ بولتی تصویر۔
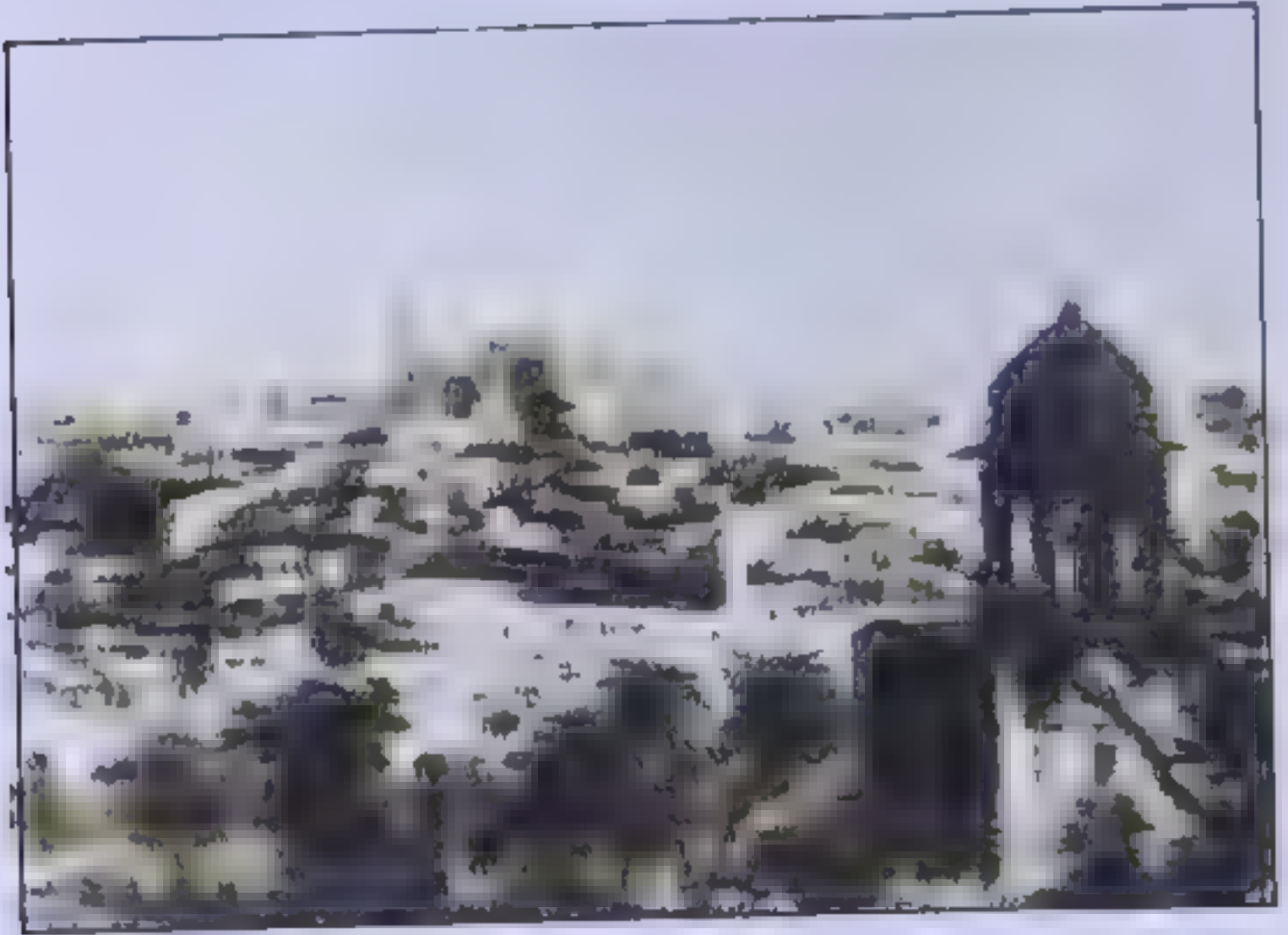
بغاوت کے بعد ۱۸۵۸ میں انگریزوں کے ذریعے دلی پر دوبارہ تسلط حاصل
کرنے کے پہلے دلی کا ایک منظر۔

پیشاور میں باغی سپاہیوں کو توپ کے ذریعے اڑائے جانے کا دردناک
دہشت ناک منظر۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری تصویر کی زبانی جس کے بعد انہیں رنگون
جلا وطن کر دیا گیا۔
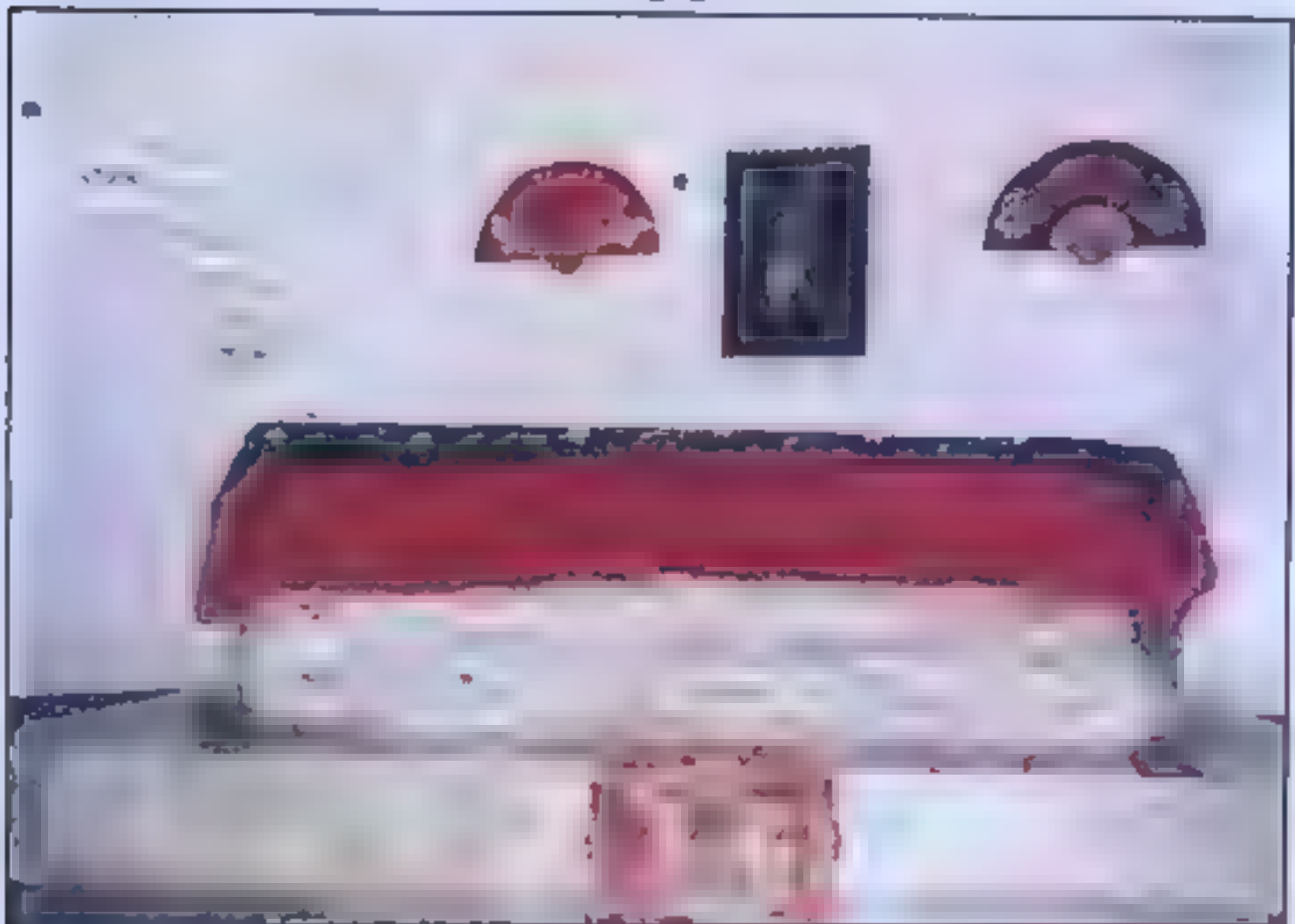
رنگون میں بہادر شاہ ظفر کی قبر۔

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

شعر و ادب اور دستاویز

نظم

حکومت جو اپنی تھی اب ہے پرائی
اجل کی طلب تھی اجل بھی نہ ائی
وہ تخت اور تختہ اسیری نہ شاہی
مقرر ہوئی ہے جہاں کی گدائی
وہ رتبہ جو پایا تھا ہم نے وطن میں
اسی کی بدولت ہوئی نہ لڑائی
عدو بن کے آئے جو تھے دوست اپنے
نہ تھی جس کی امید کی وہ برآئی
گھڑی دو گھڑی کے یہ جھگڑے ہیں سارے
ابھی ہوگی قید الم سے رہائی
زمانہ رکھے گا پر اپنی نظر میں
میری سرفروشی میری نا رسائی
اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا
پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی
لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی فلک کی ستائی

بیگم حضرت محل

نوحۂ غم

بہادر شاہ ظفر

کیا پوچھتے ہو کج روی، چرخ عنبری ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری
کرتا ہے خوار تر انھیں جن کو ہے برتری اس کے مزاج میں ہے یہی سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط اُستخواں ہما کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما
بالعکس ہے زمانے میں جتنے ہیں کاروبار شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار آئی نظر عجب روش باغ روزگار
جو نخل پُر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں سرکش ہے وہ درخت کہ جس میں ثمر نہیں
بادِ صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک ملتے ہیں دم بہ دم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک کرتی ہیں بلبلیں بھی فریادِ دردناک
شاداب حیف خوار ہوں گل پائمال ہوں گلشن ہوں خوار نخل مغیلاں نہال ہوں
نزدیک اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور دیکھو تو صاف فہم میں ان کی ہے کچھ قصور
ورنہ جو باصفا ہیں خردمندِ ذی شعور کیا دخل ان کو آوے کبھی نخوت و غرور
رکھتے غبار و کینہ سے وہ سینہ صاف ہے ہر نیک و بد سے صورت آئینہ صاف ہے
جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں ہووے گا سر پہ چرخ بھی جاویں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں پہ آسماں چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں
یہ گنبد فلک ہے عجب طرح کا قفس طاقت نہیں ہے نالے کی بھی جس میں یک نفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پَر ٹوٹ جائیں دس رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس
کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے
کیا کیا جہان میں ہوئے شاہانِ ذی کرم کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم دارا کہاں، کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم
کوئی نہ یاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

بیانِ غم

بہادر شاہ ظفر

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایائے ہند تباہ ہوئی کہیں کیا جواں پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گناہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے
نہ تھا شہر دلّی یہ تھا چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھول میں جو تلے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوقِ قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سب ہی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ وقت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ وہ دیار ہے
نہ وبال سر پہ ہے تن مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے

گیت

عظیم اللہ خاں

ہم ہیں اس ملک کے مالک ہندوستاں ہمارا
پاک وطن ہے قوم کا جنت سے بھی پیارا
اس کی روحانیت سے روشن ہے جگ سارا
کتنا قدیم، کتنا نعیم سب دنیا سے نیارا
کرتی ہے زرخیز گنگ وجمن کی دھارا
اوپر برفیلا پربت، پہریدار ہمارا
نیچے ساحل پر بجتا، ساگر کا نقارہ
اس کی کھانیں اگل رہی ہیں سونا، ہیرا، پارہ
اس کی شان وشوکت کا دنیا میں جے کارہ
آیا فرنگی دور سے ایسا منتر مارا
لوٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نے ہے تم کو اہل وطن للکارا
توڑو غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا
ہندو، مسلم، سکھ ہمارا بھائی بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

فتح افواج شرق

محمد حسین آزاد

کو ملکِ سلیمان کجا حکمِ سکندر
شاہان ، اولعزم و سلاطینِ جہاندار
کو سطوتِ حجاج کجا صولتِ چنگیز
کو خان ہلاکو و کجا نادرِ خونخوار
یہ شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل
کس جا ہے جہاں اور کہاں ہے وہ جہاندار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدہ دل کھول دے اے صاحبِ ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصارا
تھی صاحبِ اقبال جہاں بخت جہاندار
تھے صاحبِ جاہ و حشم لشکرِ جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کے نکلے
آفاق میں تیغِ غضب و حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخنِ تدبیر و خرد ہو گئے بیکار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار

یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوّر

نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجیے تو عیاں ہے
ہر شعبدے تازہ میں ہے صد بازوئی عیار

یاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہے بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار

کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے
حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بہ دیوار

حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش
مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یک بار

قطعہ

مرزا اسداللہ غالب

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں سے نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل جاں کا
گاہ جل کر کیا کیا شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ روکر کہا کیے باہم
ماجرا دیدۂ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

فغانِ دہلی

محمد صدرالدین آزردہ

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی
والی کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نا اہل سے کچھ خلط انھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقف و ہم راز نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتے کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشان دردر
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پہ
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
زیور الماس کا بھی جن سے نہ پہنا جاتا

گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھاتے نہ اوڑھایا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے، تو پھر گرتے ہیں
عیش وعشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
ٹکرے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد
کب تلک داغ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم
روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکرے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

رخصت اے اہل وطن

واجد علی شاہ اختر

شب اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں　　دن کو کس رنج و زدود میں گذر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاد رہو تم کو خدا کو سونپا　　قیصر باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا
ہم نے اپنے دل نازک کو جفا کو سونپا　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

شکوہ کس کو کروں یاں دوست نے مارا مجھ کو　　جز خدا کے نہیں اب کوئی سہارا مجھ کو
نظر آتا نہیں بن جائے گذرا مجھ کو　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

گردشِ چرخ نے یہ بات بھی سنوائی ہے　　اپنے مالک کو یہ نوکر کہے سودائی ہے
اب تو در پیش ہمیں بادیہ پیمائی ہے　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصتِ اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

کس سے فریاد کروں ہے یہی رقت کا مقام　　کیسا کیسا میرا اسباب ہوا ہے نیلام
میرے جانے سے ہر اک گھر میں پڑا ہے کہرام　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

رنج جو ہے اسے اب اے دل پر درد اُٹھا　　تعزیہ خانوں تلک کا میرا اسباب لٹا
فصل گرمی میں تاسف! میرا گھر تک چھٹا　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت　　آگے اب بس نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد میرے ملک کی یارب خلقت　　درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

ہنگامہ دار و گیر

ظہیر دہلوی

نہالِ گلشن اقبال پائمال ہوئے
گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گل کا نہ ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں
جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی
سنانِ تیرہ ہر اک سینے سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریادِ گیر و دار ہو
ہر ایک دشتِ بلا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
ہر ایک شہر کا پیر و جوان قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ ہر اک خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زباں خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں کے کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

انقلابِ دہلی

مرزا قربان علی بیگ سالک

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامت صغریٰ   کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا   بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد   ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد
سمجھ کے اپنا ٹھکانہ گئے جہاں ہم لوگ   ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ   پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ
زمین ہوگئی دشمن نہ پائی جائے ثبات   ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات
کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر   کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر   غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بجائے زمزمے ہر جا پہ شیون غم ہے   محل عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے
لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا ہے ہے   بیان مجھ سے ہو کیوں کر یہ ماجرا ہے ہے
نہ آئی جن کی کبھی دور تک صدا ہے ہے   نکل کے گھر سے چلی ہے پیادہ پا ہے ہے
کبھی نہ غصے میں بھی جامے سے جو باہر ہوں   غضب ہے یہ کہ وہ یوں بے ردا و چادر ہوں
وہ جن کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے   پیادہ کیوں چلیں ناقہ ہے اور نہ محمل ہے
اٹھائے یک قدم بھی اگر تو مشکل ہے   قدم کہیں کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے
سروں پہ بوجھ ہے گھڑی ہے لڑکھڑاتے ہیں   بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

نوحہ دہلی

محمد علی تشنہ

عجیب کوچہ ورشکِ جہاں تھا دہلی کا — بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا — خطاب خطہ ہندوستاں تھا دہلی کا
غضب ہے اس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا — زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا
وہ تختِ سلطنت و بارگاہِ سلطانی — کہ جس میں بیٹھتے تھے آ کے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی — بڑے ہی اوج پہ تھا دعویٰ سلیمانی
ہر ایک کاخ کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا — دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلیٰ کا
کسی زمانے میں ایسا تھا یاں کا تخت نشین — خراج دیتے تھے سب بادشاہ روئے زمیں
خطا و ملکِ ختن سب تھے اس کے زیرِ نگیں — تمام کانپتے تھے اس سے چین اور ماچین
دیارِ ہند تھا مشہور خلف نام اسکا — چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اس کا
زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ — تمام ہوگیا تاراج ملک و مال اور جاہ
کہ اس سے ہوگئے بد تر غریب شاہنشاہ — رعیت ان کی ہوئی ان سے بھی زیادہ تباہ
وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹہ — اب اس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹہ
رہی نہ حسن محبت کی اب خریداری — جو یوسف آئیں نہ ہو تو بھی گرم بازاری
اٹھائے کون حسینوں کی ناز برداری — لگائے دل کوئی اسکی ہے کس کو جاں بھاری
بقول تحخص عجب ملکِ حسن بستی ہے — کہ دل سی چیز یہاں کوڑیوں کو سستی ہے
کسی کا دل نہیں اس دور میں ٹھکانے سے — رہا نہ گانے سے شوق اور نہ بجانے سے
غرض نہ غیر سے مطلب نہ ہے یگانے سے — وفا و مہر تلک اٹھ گیا زمانے سے

کہاں سے لائیں وہ پہلی سی اب ادا معشوق   اسی سبب سے ہے مشہور بے وفا معشوق
کوئی فقیر جو کوڑی دوکان مانگے ہے   تو اس سے کہتے ہیں کیا تو ہر آن مانگے ہے
تری طرح سے یہاں سب جہان مانگے ہے   چل اپنی راہ لے کیا ہم سے دان مانگے ہے
جو مال بڑھتا ہی جاتا تھا گھٹ گیا بالکل   دوکان داروں کا طبقہ الٹ گیا بالکل
کوئی کہے ہے تپ غم کی بسکہ شدت ہے   تو یوں کہیں کہ ہمیں آپ ہی حرارت ہے
چڑھا ہوا ہے بخار آج کل یہ نوبت ہے   تم اپنا کام کرو جاؤ تم کو صحت ہے
مریض جاکے کرے کیا کہ طعن کرتے ہیں   طبیب اپنا مرض خود بیان کرتے ہیں
یہ شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سناتے ہیں   وہ بیٹھے رہتے آتے ہیں اور نہ جاتے ہیں
جو قدر دان نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں   تو دل ہی دل میں وہ خون جگر کو کھاتے ہیں
غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے   مذاق شعروسخن اٹھ گیا زمانے سے

دلّی و لکھنؤ

حکیم آغا جان عیش

ہو گئے ویران دہلی و دیار لکھنؤ
اب کہاں وہ لطف دہلی و بہار لکھنؤ

تھا وہ حسن بخت دہلی غیرت صد لالہ زار
رشک صد گلزار تھا ایک ایک خار لکھنؤ

سو فلک نے یوں کیا دہلی کو تو پامال جور
اور کیا وقف جفا ہر برگ و بار لکھنؤ

غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں
اور سوسن ہے چمن میں سوگوار لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیش
اور دل پھٹتا ہے سن کر حال زار لکھنؤ

مصائب قید

منیر شکوہ آبادی

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

جس قدر احباب خالص تھے وہاں
در گزر کرتے نہ تھے تدبیر سے

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کے تیر سے

باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم
سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے

کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں
دست و پا بدتر تھے آتش گیر سے

تھا بچھونا ٹاٹ کمبل اوڑھنا
گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

محنت و مزدوری و تکلیف و رنج
تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے

اس جہنم کے موکل سب کے سب
دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے

قاتلِ اشراف و اہلِ علم تھے
رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے

پھر الٰہ باد میں بھجوا دیا
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے

ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوک سنگینوں کی بدتر تیر سے

جو الٰہ باد میں گزرے ستم
ہے فزوں تقریر سے تحریر سے

پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے

بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک
کٹ گئی قید ستم تقدیر سے

داغ غم

منیر شکوہ آبادی

دل تو پژمردہ ہیں داغ غم گلستاں ہوں تو کیا　　آنکھیں روتی ہیں دہان زخم خنداں ہوں تو کیا
ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت　　اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا
پڑ گئے پتھر جواہر پیشوں پہ اے آسماں　　کوڑیوں کے مول اب لعل بدخشاں ہوں تو کیا
مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں سومعہ ویران ہے　　یاد حق میں ایک دو دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا
جاں بلب ہیں غم سے استادانِ فن و نظم ونثر　　مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہوں تو کیا
منعم و فیاض ہے محتاج نان خشک کو　　خاک رو بوں کو میسر خوان، الواں ہو تو کیا
پیشوا یان رہ دیں ڈالے ہیں عزلت گزیں　　گنج کی مانند ویرانوں میں پنہاں ہوں تو کیا
نوحہ گر ہیں مفتیان و قاضیان واہل عدل　　چند نا منصف پناہ اہل دوراں ہوں تو کیا
روئے کس کس مزے کو یاد کر کے اے فلک　　زخم دل پر سینکڑوں خالی نمکداں ہوں تو کیا
یہ غزل ہے حسب حال دہر، مثل قطع بند　　سات جیتیں صورت خواب پریشاں ہوں تو کیا

مرثیۂ دہلی

مرزا داغ دہلوی

فلک زمیں وملائک جناب تھی دلی   بہشت وخلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کا ہے کو تھا لا جواب تھی دلی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہے آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی   خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی
فلک نے قہر وغضب ناک کر ڈالا   تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یہاں وہاں کے جہاں کو ہلاک کر ڈالا   غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو مہتاب کی تھیں   کھنچی ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں
لہو کے چشمے ہیں چشم پُر آب کی صورت   شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت   کہاں یہ حشر میں تو یہ عتاب کی صورت
زباں تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی   رسن ہے، تیغ ہے گردن بے گناہوں کی
زمیں کے حال پہ اب آسماں روتا ہے   ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت وپیر وجوان روتا ہے   غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے
جو کہیے جوششِ طوفاں کہیں نہیں جاتی   یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی
برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے   غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے   قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی   یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی
بنا ہے خالِ سیاہ رنگ مہ جمالوں کا   دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا   عجیب حال دگر گوں ہے دلی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی   دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی
پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی   تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نو جوانوں کی   کہ حکم عام ہے بھرتی ہو قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف وقلم کا ہو جب کہ حال تباہ   کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ
غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں   کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں   جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آبِ وفا بھی تو زہر ہو جائے   جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہو جائے

مرثیۂ دہلی

میر مہدی مجروح

ذکر بربادیِ دہلی کا سنا کر ہمدم
نشترِ اک زخمِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
آبِ رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا
دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جس سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز
گیتی افروز اگر حضرتِ نیّر رہتے
اتنا تاریک نہ ہوتا یہ زمانہ ہرگز
اب تو یہ شہر ہے اک قالبِ بے جاں ہمدم
کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز
درِ میخانہ ہوا بند صدا ہو یہ بلند
یاں حریفانِ قدح خوار نہ آنا ہرگز
رہی یارانِ گزشتہ کی کہانی باقی
یہ تو بھولا ہے نہ بھولے گا فسانہ ہرگز

دہلی مرحوم

خواجہ الطاف حسین حالی

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب — درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہے یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دہلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کرکے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کی سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ — یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

۱۸۵۷ء کی ادبی و تاریخی اہمیت

1857ء میں جو کچھ ہوا اس کی طرف ادبی تنقید کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ سوال ہی بے معنی نظر آئے کیوں کہ 1857ء کی لڑائی سیاسی اور تاریخی واقعہ ہے ادبی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر تاریخ اور ادب کا کوئی رشتہ ہوتا ہے اور تاریخ ادب صرف مصنفین کے نام کی فہرست نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے عہد بہ عہد ذہنی اور عمرانی نشو نما کی داستان ہوتی ہے تو یقیناً 1857ء کے بارے میں ادب کے مورخ کو بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور اس کی طرف اپنا رویہ طے کرنا ہوگا۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ 1857ء کی لڑائی کو فوجی بغاوت کہا جائے یا جنگ آزادی قرار دیا جائے۔ غدر کا نام دیا جائے یا چند معزول بادشاہوں اور رجواڑوں کی آخری باری سمجھا جائے۔ ایک طرف مورخین کا وہ گروہ ہے جو اسے مذہبی جنگ قرار دیتا ہے، دوسری طرف وہ ہیں جو اسے محض اتفاقی شورش سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دعویٰ بھی بے دلیل نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ اس لڑائی کی ابتداء انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں کی نافرمانی سے ہوئی اور میرٹھ سے یہی دستے دہلی پہنچے انہیں برطانوی افسران سے شکایتیں تھیں۔ انہیں سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کے استعمال کرنے پر اعتراض تھا۔ انہیں انگریز سپاہیوں کی بالادستی کا شکوہ تھا اور اس بنا پر اسے فوجی بغاوت کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھولنے کی نہیں ہے کہ جلد ہی اس لڑائی کی نوعیت بدل گئی۔ اب یہ لڑائی صرف کارتوسوں پر نہیں تھی صرف ملازمت کی تکلیفوں اور غیر مساوی برتاؤ پر نہ تھی، یہ لڑائی اقتصادی یا فوجی سے آگے بڑھ کر سیاسی ہوگئی تھی اور ان غیر مطمئن اور نا آسودہ سپاہیوں کو ان تمام عناصر کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوگئی تھی جو انگریزی حکومت کے جبر و استبداد کے شکار ہو چکے تھے۔ ایک طرف انگریز اور ان کے ہندوستانی خیر خواہ تھے، دوسری طرف سارے انگریز دشمن عناصر جمع ہوگئے تھے۔ ان معنوں میں اسے جنگِ آزادی کہا جاسکتا ہے، گو اس بات کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ اس وقت نہ تو قومیت کا کوئی واضح تصور موجود تھا ورنہ سیاسی آزادی کا۔ اگر 1857ء کی لڑائی کا نتیجہ ہندوستانیوں کے حق میں برآمد ہوتا تو ہندوستان میں غیر ملکی سامراج کے بجائے شاید قومی آزادی نہ

آتی، پرانے انحطاط پذیر رجواڑوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پھر سے قائم ہو جاتیں۔

جو لوگ 1857ء کی لڑائی کو 'غدر' کا نام دیتے ہیں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ یہ لڑائی منظم نہیں تھی اور اس میں شریک ہونے والے اکثر وہ لوگ تھے جو صرف لوٹ مار کے لیے لڑائی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سیاسی مجاہدوں کی منظم اور ایثار پسند جماعت کم تھی اور شورہ پشت اور لٹیرے بہت سے شامل ہو گئے تھے جو کسی ڈسپلن کو نہ مانتے تھے اور کسی عسکری تنظیم سے وابستہ نہ تھے۔ 1857ء کی لڑائی میں بے ترتیبی اور بدنظمی کا ایک ایسا دور آیا تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ داغ کے 'شہر آشوب' میں، ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر'، مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان' میں نذیر احمد کی تصانیف میں اور غالب کے خطوط میں جن 'کالوں' اور 'پوربیوں' کا ذکر ہے وہ تمام کا تمام انگریزوں کے ڈر سے ہی نہیں لکھا گیا اس میں حقیقت کا بھی شائبہ ہے۔ لیکن کیا بے ترتیبی اور بدنظمی کے اسی دور سے 1857ء کی لڑائی کا سارا کردار متعین کرنا درست ہوگا؟ منظم سے منظم جنگِ آزادی میں بدنظمی اور بے ترتیبی کے ایسے دور آتے ہیں لیکن کیا اس بنا پر ایسی جنگوں کو غدر کہا جا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ رجواڑوں اور بادشاہوں نے اس لڑائی سے وابستہ ہو کر اپنی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس لڑائی میں صرف انہیں معزول شدہ حکمرانوں کی فوجیں نہیں لڑ رہی تھیں، اس میں تو وہ سب لوگ تھے جو انگریزوں سے ناآسودہ تھے اسی لیے پہلا نعرہ "دین دین" کا تھا جو کمپنی کی بے جا مذہبی مداخلت کے خلاف سارے ہندوستانیوں کو یکجا ہو کر لڑنے پر اکساتا تھا۔ اس وقت سیاسی بیداری ایسی عام نہ تھی کہ وہ جمہور کی ہر سطح تک پہنچ کر اس لڑائی کو ہمہ گیر، قومی اور عوامی لڑائی میں تبدیل کر سکتی۔ اس طرح 1857ء کی لڑائی کو کسی ایک لفظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک طویل عمل تھا جو مختلف منزلوں سے گزرا اور جس کی نوعیت مختلف اور متنوع تھی اور جس میں نہ جانے کتنے عناصر مل جل کر کام کر رہے تھے۔

1857ء کی یہ لڑائی حادثہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے اسباب و علل کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ یہاں اس کے سیاسی محرکات سے بحث نہیں، اس ذہنی تار و پود پر غور کرنا ہے۔ 1857ء کی لڑائی فکر اور خیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے اور چوں کہ ادب بھی خیال اور جذبے ہی کا نام ہے اس لیے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا ہے وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دلچسپی کا موضوع ہے۔

انگریزوں کے حکمراں ہونے سے قبل ہندوستان میں قومیت کا تصور اور احساس بڑا ہی دھندلا اور موہوم سا تھا اس لیے اس عہد سے پہلے کی تہذیب کو ہندوستانی تہذیب یا قومی تہذیب کا لقب دینا نامناسب ہوگا۔ سارا ملک مختلف علاقائی حکومتوں ہی میں بٹا ہوا نہیں تھا بلکہ بہت سے علاقائی تہذیبی منطقے بھی قائم تھے اور ان کے دھارے کبھی مل کر تو کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر بہہ رہے تھے۔ یہاں ہم صرف ان تہذیبی دھاروں کا ذکر کریں گے جنہوں نے براہ راست اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تصوف کی مختلف شکلوں نے دنیائے خیال پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور مادی آسودگی کی تلاش سے دامن چھڑا کر صوفی منش بزرگوں اور فنکاروں نے درباروں کی چمک دمک کے بجائے جمہور سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی یہ ارباب طریقت، شریعت والوں کی نظروں میں کھٹکے کبھی اہل شریعت کے دوش بدوش آگے بڑھے۔ مذہب کا یہی وسیع تصور 1857ء سے قبل ہمارے نظام فکر کا محور قرار پاتا ہے۔ تعلیم اور نصاب تعلیم میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی خواہ لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر جگہ مذہبی تصورات، ہیئت، فلسفہ، اخلاق، منطق، طب اور دوسرے تمام تر علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اور خصوصاً گلستاں، بوستاں، اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری وغیرہ کلاسیکی تصانیف کے اثرات نمایاں طور پر مذہب کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نئے سیاسی اور عمرانی حالات اس تعلیمی اور فکری سانچے میں پورے نہیں اتر رہے تھے۔ اس دور کے علماء اور بزرگوں کو اس بات کا احساس کسی نہ کسی شکل میں ہو چلا تھا کہ اس سماجی ڈھانچے میں کوئی انقلابی تبدیلی لانا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب وہابی تحریک اور فرائضی تحریک ہر ایک نے اس بات پر زور دیا کہ سماجی نظام میں تبدیلی ضروری ہے اور عمل کی جو قوتیں خوابیدہ ہوگئی ہیں ان کو پھر سے جگانا چاہیے۔ ان سب بزرگوں نے اس انحطاط اور بے حسی کا تجزیہ تصوراتی اور آدرش وادی سطح پر کیا۔ انہوں نے بدلے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے قدیم اصول کی طرف واپسی پر زور دیا، انہوں نے زوردار الفاظ میں قرآن اور اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول پر پھر سے عمل کرنے کی دعوت دی گویا اجتہاد کا دروازہ کھول کر انہوں نے ان اصول و ضوابط میں تھوڑے بہت رد و بدل اور ان کی تفسیر میں اختلاف رائے کی گنجائش پیدا کر دی۔ ان لوگوں کو محض دقیانوسی اور رجعت پسند کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ انہوں نے اقتصادی

مساوات، سماجی انصاف اور عمل کی آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنے دور کے عمرانی ڈھانچے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور اس پر پوری شدت سے وار کیا۔ انہوں نے تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر پیش کر کے نجات کا ایک راستہ ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی آواز گویا تبدیلی کے احساس کی پہلی آواز ہے۔

ان آوازوں سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ انگریز ہندوستان میں ایک بہتر صنعتی نظام لے کر داخل ہو رہے تھے اور ہندوستان کا عمرانی ڈھانچہ ٹوٹ رہا تھا۔ یہ عمرانی ڈھانچہ خود بخود مائل بہ انحطاط تھا اور اگر انگریز ہندوستان نہ آتے تو بھی اس ڈھانچے کا ٹوٹ جانا مسلّم تھا۔ سماجی نظام میں تبدیلی کا احساس انگریز اپنے دامن میں نہیں لائے۔ یہ احساس سو فیصدی برطانوی تاجروں کی دین نہیں تھا بلکہ ان کے براہ راست اثر انداز ہونے سے پہلے بھی تبدیلی کی ضرورت اور اس ضرورت کی اہمیت محسوس کی جانے لگی تھی۔

اس اندرونی احساس کے ساتھ ساتھ بہت سے خارجی عناصر بھی کام کر رہے تھے۔ سر دست ہم اگر سیاسی صورت حال کو نظر انداز کر دیں تو بھی خاص علمی اور ادبی سطح پر بہت کچھ تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ انگریزی 1835ء میں سرکاری زبان مان لی گئی تھی اور یہ فتح اس نے سنسکرت اور فارسی کو شکست دے کر حاصل کی تھی۔ اگر لارڈ میکالے کی رپورٹ میں مشرقی علوم اور ادبیات کو اس قدر برا بھلا نہ کہا گیا ہوتا تو شاید انگریزی کی فتح اس قدر ڈرامائی نہ ہوتی۔ علاوہ بریں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے بھی ادب کی رفتار کو بہت کچھ متاثر کیا، گو جان گلکرسٹ کی پالیسی آخر کار میکالے اور اس کے ہم نواؤں کی مغربی سانچے میں ڈھالنے کی پالیسی کے آگے ترک کر دی گئی لیکن فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر میں خاص طور پر ایک نیا آہنگ ضرور پیدا کر دیا۔ مغربی اثرات بڑے آہستہ رو اور مدھم تھے لیکن سادگی پر زور، آراستہ اور پیراستہ عبارت کی صنعت گری کے بجائے نفس مضمون کی طرف توجہ اور ایک نئے ادبی معیار کی ابتدا ہونے لگی تھی، گو اس دور کے لوگوں کے نزدیک نہ یہ ادبی تھا نہ معیاری۔

دہلی کالج اور اس کے ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ بک سوسائٹی مختلف موضوعات پر جو کتابیں انگریزی میں تیار کر رہی تھی، وہ یہاں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ پرسی ول اسپیر نے ٹھیک کہا ہے:

> ''انگریزی ادب نے جو اثرات بنگال میں چھوڑے تھے وہ بنیادی طور پر ادبی تھے۔ دہلی میں یہ اثر سائنٹفک تھا''

سی ایف انڈریوز نے دہلی کالج کے بارے میں جو تفصیلات ہم پہنچائی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں سب سے مقبول شعبہ سائنس ہی کا تھا۔ گو ادبیات کے نصاب میں گولڈ اسمتھ کی نظم 'مسافر' اور 'اُجڑا ہوا گاؤں' ملٹن کی نظم 'فردوس گم شدہ'، پوپ کی نظم 'انسان پر مضمون' اور نثر میں رچرڈس کے انتخابات، بیکن کا 'علم کی ترقی' اور برک کے مضامین اور تقاریر شامل تھیں لیکن سائنس اپنی دلچسپی، مقبولیت اور ندرت کی حیثیت سے بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ سی ایف انڈریوز لکھتے ہیں:

> ''قدیم دہلی کالج کی تعلیم کا غالباً سب سے مقبول شعبہ وہ تھا جو سائنس سے متعلق تھا۔ اس میں طلبہ کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور جلد ہی یہ شہر کے گھر گھر میں پھیل گئی جہاں نئے تجربے زیادہ سے زیادہ مرتبہ والدین کے سامنے دہرائے جاتے تھے''۔ (بہ حوالہ 'ذکاء اللہ آف دہلی')

منطق اور فلسفہ کے بارے میں بھی دہلی کالج کے طلبہ کا رویہ قابل توجہ ہے کیوں کہ یہ طلبہ کوئی معمولی طالب علم نہیں تھے، ان میں اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیتیں شامل تھیں جنہوں نے ادب کا رخ بدلا۔ سی ایف انڈریوز فلسفہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قدیم فلسفے کے نظریات جو کہ ارسطو کی تعلیمات کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے، جدید سائنس کے زیادہ معقول اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اترنے والے نظریات کے مقابلے میں ماند پڑنے لگے۔ دہلی کالج کے شعبۂ انگریزی اور مشرقی شعبے کے اعلیٰ درجوں کے طالب علم قدیم اعتقادات کا مضحکہ اڑاتے تھے مثلاً زمین کو کائنات کا غیر متحرک محور تسلیم کرنے کی ہنسی اڑائی جاتی تھی''۔ (ایضاً)

ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ صرف ایک کالج کی داستان ہے۔ اس کالج کے طفیل نئی نسل میں مغربی اور سائنٹفک تصورات ہماری سوسائٹی میں راہ پانے لگے تھے مگر اس کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے چپے چپے میں نہ جانے کتنے ایسے مدارس تھے جو قدیم مشرقی تعلیم کی بنیاد مذہب ہی تھا اور ان کی تعلیم میں گو سائنس کے نئے تصورات شامل نہیں تھے لیکن ایک وسعت اور ہمہ گیری

ضروری تھی جو بیک وقت منطق، اخلاق، ہیئت، فلسفہ، الٰہیات، طب اور دوسرے متعلقہ موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے علوم و فنون اور قدیم نظام تعلیم اپنی صلاحیتیں ختم نہیں کر چکے تھے۔ اس برسے ہوئے بادل میں بھی نہ جانے کتنی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ دہلی کے اسی دور کو حالی نے ایک عظیم لشان دور قرار دیا ہے اور دہلی کو بغداد اور قرطبہ کے ہم رتبہ ٹھہرایا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب علم حدیث اور علم دین ہی میں نہیں شعر و ادب میں بھی احیاء کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب کی آبیاری زیادہ تر یہی قدیم نظام تعلیم کر رہا تھا۔ اس دور کا غیر اہم سے غیر اہم شاعر بھی اس نظام تعلیم کی برکت سے اس دور کے مجموعی علم کا ہلکا سا تصور ضرور رکھتا تھا۔ ذوق کو اپنے عہد میں کبھی عالم یا منتہی نہیں سمجھا گیا لیکن ان کے 'سر بستر خواب راحت' والے قصیدے سے اندازہ لگایا جائے تو طب، ہیئت، منطق، نجوم اور دوسرے علوم متداولہ سے انہیں کم سے کم ابتدائی واقفیت ضرور تھی، دوسرے قصیدوں میں بھی یہی وسعت پائی جاتی ہے۔ مومن کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ طب اور نجوم دونوں میں کامل تھے۔ غالب کی تہہ در تہہ شاعری کا راز کسی نہ کسی حد تک اس میں پوشیدہ ہے ورنہ یہ شعر:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

'ہیولیٰ' کے واضح تصورات کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔

1857 کی لڑائی سے وقت کا پس منظر ہفت رنگ قوس قزح کی مانند نظر آتا ہے جس میں مختلف قسم کے رنگ غلبہ پانے کے لیے کشمکش کر رہے تھے۔ ایک طرف قدیم طرز معاشرت، طرز تعلیم اور نظام حکومت تھا جو عزیز ہوتے ہوئے بھی تمام تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا، امن چین قائم نہ تھا۔ سیاسی استحکام نہ ہونے کی بنا پر اقتصادی سانچہ ڈانوا ڈول ہو رہا تھا اور ساری معاشرت میں ایک عجیب بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی جو سیاسی استحکام، امن چین اور صنعتی ترقی کے سامان لا رہی تھی وہ اپنے جلو میں لوٹ کھسوٹ، مذہب میں مداخلت اور سیاسی غلامی کی لعنتیں لے کر آ رہی تھی، گویا اس جنگ کے لڑنے والے ہیرو اور ویلن اچھے اور برے دونوں عناصر سے مل جل کر بنے تھے اور ایسا جنگ جو اور صاحب نظر جنگجو کوئی نہ تھا جو اس وقت کے

تاریخی حالات سے ذرا بلند ہو کر اس کشمکش کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں میں امتیاز کر سکتا۔ نئے دور کا استقبال کرتا اور سیاسی غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔

سیاسی اور انتظامی دونوں معاملات میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جو فوج 1857ء کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف لڑی وہ عام ہندوستانی ریاستوں کی فوج سے مختلف تھی۔ 1857ء میں جب دہلی پر دوبارہ ہندوستانی قبضہ ہو گیا تب بھی انتظامی امور بالکل اسی ڈھنگ پر چلتے رہے جو کمپنی نے قائم کیا تھا۔ گو مذہب اور شریعت کے احترام کے طور پر صدر الصدور کا تقرر کر دیا گیا تھا لیکن عملی طور پر عدالتیں ہی سارے معاملات کا تصفیہ کر رہی تھیں اور کوتوال حسب سابق شہر کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور کلکٹروں کی طرح افسران اضلاع میں رقم وصول کر رہے تھے۔ یہ قیاس کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے فتح یاب ہونے کی صورت میں ہی سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ قائم ہوتا، وہ کس حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ترقی یافتہ نظام اور طور طریقے کو اپناتا اور کس حد تک قدیم مغل یا ریاستی ڈھانچے سے مختلف ہوتا۔

اس سلسلے میں ایک انتظامی ندرت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ شروع جولائی میں جب محمد بخت خاں دہلی پہنچے تو انہیں صاحب عالم بہادر کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا عہدہ تھا جس میں فوجی اور غیر فوجی دونوں طاقتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ صاحب عالم بہادر دراصل ایک ایسی عدالتی جماعت کے نگراں تھے جس کے ذمے فوج اور شہری آبادی دونوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا شامل تھا۔ اس عدالتی جماعت میں چھ فوجی نمائندے اور چار شہر کے اکابر شامل تھے۔ جماعت خود اپنا صدر منتخب کرتی تھی اور اس کے فیصلے صاحب عالم بہادر اور بادشاہ کی منظوری کے بعد عمل میں لائے جاتے تھے"۔

(بحوالہ پرسی ول اسپیر The Twilight of Mughals, Page,206)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خیال سے لے کر عمل ہر جگہ 1857ء تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں مغرب کی اثر پذیری اور قدیم طرز زندگی کی تبدیلی نمایاں طور پر محسوس کی جانے لگی تھی۔ 1857ء میں آخری بار ہندوستان کے انگریز دشمن عناصر نے مل کر مقابلہ کیا۔ یہ عناصر مختلف اور متنوع تھے اور انگریز دشمنی کا مشترکہ رشتہ انہیں ایک دوسرے سے قریب لے آیا تھا۔ یہ اشتراک اس قدر گہرا اور قریبی تھا کہ اس نے وقتی طور پر ہی سہی سارے فروعی

اختلافات کو مٹا ڈالا تھا۔ ہندو مسلم تنازعہ نے بعد کو ہندوستان کی سیاست میں بڑی ہل چل مچائی لیکن اس وقت اس تنازعہ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بہادر شاہ کے دور میں مغل دربار میں ہندو اور مسلمان تہوار ایک ہی جوش خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ دیوالی، ہولی اور عید کی رنگ رلیاں عام تھیں۔ محرم میں ہندوؤں کی شرکت اور بسنت میں مسلمانوں کی شرکت معمولی بات تھی۔ پھول والوں کی سیر اور پنکھا اٹھانے میں ہندوستانی حکومت شریک تھی عیدالاضحیٰ کے موقعے پر گائے، بھیڑ اور بکری کی قربانی کی ممانعت خود بہادر شاہ نے اپنے فرمان کے ذریعے سے کی۔ بیل اور بھینسے کی قربانی ممنوع تھی۔ ایک طرف بخت خاں اور مرزا مغل ہندوستانی فوجوں کی رہبری کر رہے تھے تو دوسری طرف کرنل گوری شنکر دہلی میں اور نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور تانتیا توپے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔

ہندوستان نے یہ لڑائی ہار دی اور اس پر سیاسی غلامی مسلط ہو گئی۔ یہ گویا غلامی کے خلاف آخری مضبوط مورچہ تھا۔ س شکست نے اس عمل کو پورا کر دیا جو 1757ء میں پلاسی کی لڑائی سے شروع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شکست کے بعد انگریزوں کا جذبۂ انتقام بیدار ہوا اور فاتح فوج نے وہ مظالم کیے کہ ہلاکو اور چنگیز کے مظالم گرد ہو کر رہ گئے۔ اس دور میں اور اس کے کافی عرصے بعد تک، دیانت داری سے 1857ء کی لڑائی کے بارے میں خیالات کا اظہار کرنا ناممکن ہو گیا اس لیے اس دور کی اکثر یادداشتیں اور تذکرے اس بات کو ملحوظ رکھ کر پڑھنی چاہئیں کہ یہ سب بیانات مصلحت کو پیش نظر رکھ کر دیے گئے ہیں۔ اگر کہیں ان بیانات میں 'کالوں' کی لوٹ مار کا تذکرہ ملے یا ہندوستانی 'لٹیروں' کے خلاف نفرت کا جذبہ نظر آئے تو اس کی وجہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لڑائی کے اس دور کے متعلق ہو جب شورش پسندوں اور لٹیروں نے بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کی تصانیف نیم صداقتوں سے بھری پڑی ہیں اور اگر اس دور کی حقیقت کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ صرف ان ہی نیم صداقتوں کے راستوں سے ملے گا۔

ادبی مورخین ہوں یا تذکرہ نویس، سب کی تصانیف میں 1857ء کی لڑائی کو آخری جدوجہد ضرور ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس جدوجہد نے جہاں ہندوستانیوں کے اس غم و غصے کا بڑی حد تک اظہار کر دیا جو غلامی کے خلاف امڈ رہا تھا وہاں اس جدوجہد کے خاتمے نے یہ بات واضح کر دی کہ اب برطانوی راج کو جلد ختم کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ نئے حالات کو آنے سے کوئی

نہیں روک سکتا اور ماضی خواہ کتنا ہی عزیز اور عظیم کیوں نہ ہو اسے سینے سے لگا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ 'یادگارِ غالب' کے دیباچے میں حالی نے دہلی کے اس شاندار دور کا ماتم کیا ہے جو ختم ہو گیا اور اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ مولانا محمد حسین آزاد 'آبِ حیات' کے لکھنے کا مقصد ہی یہ قرار دیتے ہیں کہ بزرگوں کی یادیں محفوظ کر لی جائیں کیوں کہ زمانہ ورق الٹ چکا ہے، مذاق بدل گیا ہے اور کچھ دنوں بعد کوئی ایسا بھی نہ رہے گا جو قدیم سرمائے کو سینے سے لگائے اور اردو شاعری کے ذخیرے کو پھر سے کھنگالے اور جسے بزرگوں کے حالات و واقعات سے دلچسپی ہو۔ یہی جذبہ تھا جس نے شبلی سے مختلف سوانح عمریاں لکھوئیں اور انھیں اسلام کے شاندار ماضی کی طرف متوجہ کیا۔

اس طرح ادبی تاریخ کیلئے 1857ء بہ یک وقت نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ اختتام بھی۔ اس منزل پر گویا نئے اثرات زمانے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور چند مذہبی رہنماؤں اور پختہ خیال قدامت پسندوں کے سوا زیادہ تر لوگ 1857ء کی شکست کو حتمی سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس عمرانی تبدیلی کو چار و ناچار قبول کرتے ہیں۔ 1857ء صرف اسی لئے اہم نہیں ہے کہ اس نے ادب اور معاشرت کی پرانی بساط تہ کر دی بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس لمحے سے ہمارے ادیبوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اس شکست کو سنگین اور ناگزیر حقیقت مانا اور اپنے کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

حالی کی تصانیف میں یہ تصور سب سے نمایاں ہے۔ جیسا کہ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے حالی کے ہاں 'پیروی مغرب' کوئی مفاہمت ہی نہیں ہے بلکہ آگے بڑھنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ کبھی کبھی آزادی کے خواب بھی دیکھتے ہیں، کبھی کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر تعلیم، صنعت و حرفت اور سائنس کو اپنا کر ان سے آگے نکل جائیں گے اور ہندوستان غلامی میں حاصل کیے ہوئے ہتھیاروں سے آزادی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ شبلی کا تو سارا تصور قومی اور انقلابی دوستی کا رہا ہے۔ انھوں نے مغربیت کے آگے مکمل طور پر ہتھیار نہیں ڈالے اور مشرقی علوم کی قدر و منزلت اور مشرق کی عظیم روایات سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ سیرت نگاری سے شبلی کا مقصد آزاد کی طرح صرف مقدس یادگاروں کو جمع کر لینا نہیں تھا بلکہ ان عظیم شخصیتوں کو مثالی کرداروں کی حیثیت سے پیش کرنا بھی تھا اور اس طرح گویا حال کی تاریکی میں ماضی کی شمعوں سے مستقبل کے لیے راستہ دکھانے کا کام لینا تھا۔

نذیر احمد چوں کہ داستان طراز اور ناول نگار تھے لہٰذا اس ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی کشکش ان کے یہاں نکھر کر سامنے آئی ہے۔ "توبۃ النصوح" کا کلیم ایک ایسا کردار ہے جس میں وہ تمام ہنر ہیں جو کبھی بڑی خوبیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مغربیت اور نئی روشنی کا اس میں کچھ اثر ہے تو یہی کہ وہ روزہ نماز کا قائل نہیں اور مذہبی رسوم و فرائض کو ڈھکوسلہ سمجھتا ہے۔ نذیر احمد کی کردار نگاری کا یہ بڑا کرشمہ ہے کہ وہ اس دور میں عہد جدید کے نمائندہ نوجوان کا تصور کر سکے۔ آج کے نوجوان میں کلیم کا سا شاعرانہ کمال نہ سہی لیکن اس کی روح کی بے چینی ضرور موجود ہے۔ اس کی کم اعتقادی موجود ہے اور وہ رندی اور سرمستی موجود ہے جو اسے نہ تو پرانی دنیا سے پوری طرح سمجھوتہ کرنے دیتی ہے اور نہ نئے نظام کا ایک پُرزہ بن کر جینے پر رضامند ہونے دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ نمایاں طور پر 'بنات النعش'، 'مراۃ العروس'، 'ایامیٰ' اور 'ابن الوقت' میں نذیر احمد معاشرت کے اسی بحران کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس بحران کا راستہ وہ سلیقہ مندی میں ڈھونڈ نکالتے ہیں، ور 'ابن الوقت' کے کردار مولوی حجۃ الاسلام کی طرح انگریزوں کی خیر خواہانہ ملازمت اور مذہب کے ظاہری شعائر کی پابندی دونوں میں توازن قائم کرتے ہیں۔ 1857 کی لڑائی 'ابن الوقت' کے سارے نشیب و فراز کے پس منظر کی حیثیت سے موجود ہے اور یہاں بھی وہی ناگزیر سمجھوتے کی کیفیت نمایاں ہے۔ یہی اثرات اس دور کے بہت سے دوسرے ادیبوں کے ہاں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

1857 کی لڑائی نے سرسید احمد خاں کے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو تاراج ہوتے دیکھا، بجنور کو مٹتے دیکھا، مرادآباد میں انگریزوں کے ظلم و تعدی کا ننگا ناچ دیکھا، اس کے باوجود سرسید ہندوستانی مجاہدوں کا ساتھ نہ دے سکے، سرسید نے 'اسباب بغاوت ہند' لکھ کر دنیا کو یہ ضرور جتا دیا کہ اس لڑائی کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں کے سر نہیں تھی کہ اس کے پیچھے ناانصافیوں کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ اس سلسلے کا سرسید کوئی معقول اور انقلابی حل نہ پیش کر سکے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم میں ملک کی نجات دیکھی اور تاریخ کے نئے سانچے میں ڈھل جانے ہی کا مشورہ دیا۔

اس کے علاوہ 1857ء کی لڑائی اور شکست نے اردو ادب کو اور بھی کئی حیثیتوں سے براہ راست متاثر کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستان کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دوسرے

کے قریب آ رہے تھے۔ ایک طرف لکھنؤ میں شاگردانِ آتش، میر کا نام لینے لگے تھے اور سوز و گداز اور داخلیت کو شاعری کے بنیادی جوہر سمجھنے لگے تھے، دوسری طرف دہلی میں مومن، ذوق، غالب سے لے کر نوعمر داغ تک لکھنؤ کے زیر اثر زبان کے چٹخارے، محاورہ بندی، واسوخت کے انداز اور صنعت گری اور خیال بندی کی طرف توجہ کر رہے تھے۔

مومن کے اشعار کی پیچ در پیچ ساخت اور واسوخت کا گہرا رنگ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ذوق کی محاورہ بندی، ضرب الامثال کی طرف رغبت اور زبان سے دلچسپی بھی اسی پرتو کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔ یہ اثر شاہ نصیر سے ان تک پہنچا اور ان سے بہادر شاہ ظفر اور مرزا داغ تک آیا۔ خود غالب کے کلام میں صنعت گری اور دشوار پسندی کا جو رجحان آیا اس میں بیدل ہی کا اثر نہیں تھا، لکھنؤ کے اثرات کا بھی ہاتھ تھا۔ غالب جیسا خوددار اور انفرادیت پسند شاعر ناسخ کے مصرعے پر مصرع لگاتا ہے اور اسی زمین میں اسی انداز کی غزل کہتا ہے۔ کیا یہ شعر لکھنؤ کے دبستان کی یاد نہیں دلاتے؟

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یہ شاعری خواہ وہ لکھنؤ ہو یا دہلی دربار کے محور پر گھوم رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی آوازیں صرف دربار کے گنبد میں قید نہ تھیں اور شہر کے کوچہ و بازار، محلے اور بستیاں اس رنگ میں رنگ گئی تھیں پھر بھی تہذیب اور معاشرت کا آدرش دربار ہی تھا اور علم و فضل، شرافت اور نجابت کا معیار دربار ہی کی فضا میں ڈھلتا تھا۔ 1857 نے اس محور کو حتمی طور پر شکستہ کر دیا۔ بہادر شاہ کی آواز اپنی شکست کی آواز ہی نہ تھی ایک دور کے شکست کی آواز تھی۔

دربار اور ادب کے رشتے کا اختتامیہ دراصل ایک نئی ادبی فضا کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔ گو اس

کے بعد بھی عارضی طور پر رام پور، اور حیدرآباد کی ریاستوں نے شاعروں کی دست گیری کی لیکن اب شاعری کی عنان درباروں کے ہاتھ میں نہ تھی اب ادبی کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگئی تھی جو نوکر پیشہ تھا اور اس نئے نظام میں کسی نے کسی طرح اپنے لیے موزوں جگہ پانے کے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی سوتے سے شاعری میں نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں اور مغربی ادبیات کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ حالی، شبلی، سرسیّد، آزاد، اور نذیر احمد، ذکاءاللہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو دربار سے منسلک نہ تھے اور نہ درباراری کے طور طریقوں کو سینے سے لگائے رکھنے پر آمادہ تھے۔ نظام معاشرت کی یہ تبدیلی آہستہ آہستہ اور بھی نمایاں ہونے لگی۔ تعلیم اور صنعت وحرفت پر زور دیا جانے لگا اور جاگیر دار گھرانوں میں بھی نوکری اور نئی تعلیم کے چرچے ہونے لگے۔ داستانوں میں میر داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اُتار کر متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں دے دیا گیا۔ اس نئی ادبی فضا نے کون سے رُخ اختیار کیے۔ یہ جدید اردو ادب کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس نشا کا نقطۂ آغاز 1857ء ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم کی تبدیلی کا ذکر ضمناً آچکا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نئے نظام تعلیم نے انگریزی اور مغربی سائنس پر زور دے کر نئی نسل میں ایک جذباتی تضاد کے دروازے کھول دیے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی ادبیات کا مطالعہ اس کے تہذیبی اور روایتی پس منظر کو سمجھے بغیر کر رہے تھے اور اس طرح اس سے بہت سطحی واقفیت رکھتے تھے، دوسری طرف انگریزی ادبیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ معاشرت اور رہن سہن کا مغربی تصور بھی نئی نسل کی جذباتی تشکیل میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔ اس طرح مغربی تصور اور مشرقی حقیقت میں وہ کشمکش شروع ہوئی جس کا نشان موجودہ نسل میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اس جذباتی خلا کی ابتدا تھی جس کے نیم دائرے سے سو سال بعد تک کے ہندوستانی نوجوان باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

1857 کی لڑائی کو جو لوگ جنگِ آزادی ماننے سے انکار کرتے ہیں وہ 'دین-دین' کے نعروں کو بھی ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور اسے بنیادی طور پر مذہبی بتاتے ہیں جو سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں سے شروع ہوئی اور 'دین-دین' کے نعروں کے درمیان لڑی گئی۔ اس اعتراض کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ 1857ء سے قبل اور اس کے بعد مذہب کی اہمیت میں انقلابی فرق ہوا۔ 1857 سے قبل مذہب محض ایک شخص کی خود اعتقادی کا نام نہ تھا۔ اسے نجی حیثیت حاصل تھی

بلکہ مذہب ساری معاشرت، نظام تعلیم اور ترجیحی اقدار کا محور ہو گیا تھا۔

اخلاق کا تصور مذہب کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ منطق اور فلسفہ، ہیئت اور سیاست ہر ایک شعبے پر مذہبی تصورات حاوی تھے۔ ان مذہبی تصورات کو فرقہ واریت نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ان میں اپنے دین کی حمایت کا حوصلہ تو تھا لیکن دوسرے مذہبوں کی مخالفت اور دوسرے فرقوں کو کچل ڈالنے کا جذبہ نہ تھا۔ 1857ء کے بعد کے دور میں یہ مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے تمام علوم و فنون ایک جداگانہ حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ سائنس اور مغربی تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر جہاں زیادہ سائنٹفک حقائق نے ہمارے نظام تعلیم میں جگہ پائی وہاں وہ قدیم علوم ماند پڑ گئے جنھوں نے صدیوں تک اردو شعر و ادب کی آبیاری کی تھی۔ اب مذہب سماجی نظام کا مرکزِ ثقل نہ رہا۔ 1857ء کے بعد لوگوں کے لیے شاید تعجب کی بات ہو کہ 1857 کی سیاسی لڑائی میں 'دین-دین' کے نعرے بلند کیے گئے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے یہ حیرت کی بات نہیں ہے، جنھوں نے مذہب کو سماجی اقدار کے محور کے روپ میں دیکھا ہے۔

1857 کی جدوجہد اور اس کی ناکامی کی ایک اور دین بھی ہے اس نے پہلی بار گورے اور کالے کا تصور اس شکل میں پیدا کیا کہ اس سے قومی احساس بیدار ہوا اور ایک ملی یگانگت کا شعور پیدا ہوا۔ لڑائی کے دوران میں صرف ایک تقسیم روا تھی اور یہ گورے اور کالے کی تقسیم تھی۔ مذہب، نسل، صوبہ اور فرقہ کی ساری تقسیمیں اُٹھ گئی تھیں اور قومیت کا دھندلا سا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ اس لڑائی کی ناکامیابی کے بعد بھی انگریزوں کے تشدد اور ظلم کے سلسلے میں یہی تقسیم ملحوظ رکھی گئی۔ آہستہ آہستہ قومیت کا احساس بیدار ہونے لگا۔ اس شکست سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ سیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ شکست دراصل ایک انحطاط پذیر نظام کی شکست ہے اور جب تک یہ نظام بہتر اور زیادہ طاقت ور نہیں ہوتا اس وقت تک برطانوی حکومت کو حکیم احسن اللہ، مرزا الٰہی بخش اور رجب علی جیسے لاتعداد غدار مل سکتے ہیں۔

تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے 1857 کی لڑائی تبدیلی کی ضرورت کے احساس کا نقطۂ عروج تھی اور یہ احساس شاہ ولی اللہ اور وہابی تحریک کے وقت سے مختلف شکلوں میں رونما ہو رہا تھا۔ اس لڑائی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بدل دیا بلکہ اس کی ذہنی تاریخ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا اور نظام تعلیم، معاشرت، اخلاق، غرض زندگی کی قدروں میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

احتشام حسین نے غالب کی ندرتِ فکر کا ماخذ تلاش کرنے کی کوشش میں ان کے سفرِ کلکتہ کو بڑی اہمیت دی ہے کیوں کہ کلکتہ اس وقت برطانوی سیاست اور معاشرت کا مرکز بن چکا تھا اور یہیں آکر غالب کو ایک نئے طرزِ زندگی کا احساس ہوا۔ 1857 کی جدوجہد اور اس کی ناکامی نے سارے ہندوستان میں کلکتے کی سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کو عام کر دیا۔ جدوجہد کی ناکامی نے قدیم ناگزیر انحطاط اور مغربی اثرات کے ناگزیر استحکام کو قبول کرنے پر مجبور کیا اور اس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ ایک نئی ذہنی اور ادبی فضا وجود میں آ گئی۔

1857 ء لڑائی کے بارے میں ایک متوازن نظریہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تاریخی واقعات کے سلسلے سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے اور اسے پہلے کی داخلی اور خارجی تحریکات کا نقطۂ عروج قرار دیا جائے۔ علاوہ بریں اس میں شامل ہونے والے مختلف اور متنوع عناصر کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس کے آگے لے جانے والے پہلوؤں کو فراموش نہ کیا جائے اور اس کے تاریک گوشوں کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اسی طرح 1857 کی لڑائی کا صحیح کردار متعین کیا جا سکے گا اور تاریخِ ادب میں اس کی نوعیت واضح ہو سکے گی۔

ادب کے مورخ کے لئے 1857 کی جدوجہد جدید اور قدیم اردو ادب کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔ یہ حدِ فاصل قطعی اور حتمی نہیں ہے لیکن 1835ء اور 1871ء دونوں میں تاریخوں کے مقابلے میں 1857ء کو زیادہ سائنٹفک حد بندی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ 1835ء میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا لیکن اس اہم فیصلے سے اردو ادب کی فضا اس وقت تک نہیں بدلی تھی۔ 1874ء میں مولانا محمد حسین آزاد کا وہ مشہور مشاعرہ ہوا جس میں طرحی غزلوں کی جگہ دیے ہوئے عنوان پر نظمیں پڑھی گئیں اور اس مشاعرے نے اردو شاعری میں نظم نگاری کی بنیاد ڈالی لیکن یہ دراصل شعور کی اس تبدیلی کا نتیجہ تھا جو 1857ء کی ناکام جدوجہد اور اس سے پیدا شدہ لازمی ہم آہنگی کے احساس سے پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح 1857ء کی جدوجہد ہماری سیاسی بیداری کی تاریخ ہی میں نہیں، ہماری فکری اور ادبی تاریخ میں بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت ادبی حیثیت سے

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ 1857ء کا انقلاب جس کو انگریز مورخین محض غدر کے نام سے پکارتے ہیں، ہندستانیوں کی سیاسی، سماجی اور ادبی ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو انگریز حکومت کے خلاف دبے دبے اُبھرا اور دیکھتے دیکھتے ایک آگ برسا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ کی لپیٹ میں خود انقلابی آگئے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس آگ کا رد عمل جن کے خلاف بغاوت کی گئی تھی، اُن پر کچھ نہ ہوا ہو۔ رد عمل ہوا اور ایک ایسا رد عمل جس نے بیج تو 1857ء میں بویا لیکن پھل اس کو 1947ء میں ملے۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی ''1857ء کا تاریخی روزنامچہ'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''1857ء ہندستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں اک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے'' (ص3)

خلیق احمد نظامی کے قول کے مطابق غدر قدامت اور جدیدیت کے درمیان ایک کڑی ہے۔ ہم اس وقت غدر کے ماضی سے درگزر کر کے اس کے مستقبل کی طرف رُخ کرتے ہیں جہاں ناکامی تو تھی لیکن اس ناکامی کہ تہہ میں ایک دبی ہوئی بغاوت نے دوبارہ کیسے کیسے روپ اختیار کیے اور ایک بیدار ہندستان کس انداز سے ہچکولے لیتا ہوا رفتہ رفتہ اپنے پورے تجربات کے ساتھ ایک بار پھر دریائے بغاوت میں کود پڑا۔ 1857ء کی بغاوت جو ہندستان کی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے، ایک تاریخی دور کا خاتمہ کرتی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز بھی۔ بقول پی۔ سی۔ جوشی:

''جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے بغاوت ناکام ہوئی لیکن ہندستان کو وہ تجربہ حاصل ہوا جس سے وہ نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے اور 1857ء کے اسباق بے بہا ثابت

ہوئے۔ فریقوں نے 1857ء کے تجربے سے سبق حاصل کیے اور بعد میں ان سے استفادہ کیا۔ انگریز فاتح تھے اور انھوں نے جلد اقدامات کیے۔ ہم مفتوح تھے ہم نے زیادہ وقت لیا"۔[۱]

بغاوت تیزی سے اٹھی اور تھوڑے ہی عرصے میں دب گئی لیکن اس کے اثرات بہت دنوں تک قائم رہے۔ فاتح اور مفتوح دونوں کو مکمل ہوش آ چکا تھا۔ فاتح کو یہ احساس ہوا کہ کس کو اپنے ساتھ لے کر اور کس کونے سے کر حکومت کو مضبوط کیا جا سکتا ہے مفتوح کے خیالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی۔ بعض ہمت ہار گئے اور اپنے فائدے و نقصان کے تحت اپنے آپ کو انگریزی حکومت کے سپرد کر دیا۔ لیکن اس بغاوت سے بہت سے لوگوں کو بڑے تلخ تجربات بھی ہوئے انھیں ہوش آ چکا تھا اب وہ اور منظم طور پر اپنے شکست خوردہ احساسات کو جگانے کی کوشش کر رہے تھے جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ فاتحین کے خلاف بغاوت کا جذبہ جاگ اٹھے۔ انگریزی حکومت نے جس کے اقتدار کو اب سو سال پورے ہو رہے تھے، اس نے ہندستانیوں اور یہاں کی بٹی ہوئی ریاستوں اور ان کی کمزوریوں کو شدت سے پہچان لیا تھا۔ یہاں بسنے والی قوم اور فرقے جو اپنا الگ ایک مزاج اور اپنی الگ ایک تہذیب رکھتے تھے، ان کی خوبیوں اور خرابیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ بغاوت کے بعد اس نے اپنے آئین میں بڑی تبدیلیاں کیں اس نے تمام اہل ریاست کے قانون میں نرمی پیدا کی اور ان کو اپنے بس میں کرنا شروع کر دیا۔ ایک انگریز مورخ، ای رابرٹس کا خیال ہے:

"چونکہ والیانِ ریاست نے بغاوت کے سیلاب کو روک کر نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لیے ریاستوں کو فصیل کے طور پر قائم رکھنا۔ اسی وقت سے برطانوی سلطنت کا اصول رہا ہے"۔[۳]

اور حقیقت تو یہ ہے کہ اعلیٰ طبقے اور ریاست والے بنیادی طور پر اس عظیم الشان غدر کے سخت خلاف تھے اور دراصل ان کی مخالفت ہی بغاوت کی ناکامی کی ایک اہم وجہ تھی کیونکہ باغیوں نے لوٹ مار میں اہل ریاست اور تاجر کو بھی نہیں بخشا تھا اور بقول ٹی۔ آر۔ ہومز:

"وہ تمام لوگ جنھیں نقصان اٹھانا پڑا، سپاہیوں کو کوستے تھے"۔[۴]

سر سید نے بھی ایک جگہ کہا ہے:

"باغی اکثر وہ تھے جو قلاش اور محکوم تھے۔ حکمراں طبقے سے ان کا تعلق نہیں تھا"۔[۵]

ان اقوال کے ذریعہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ بغاوت کی ناکامی سے زیادہ بغاوت کی کامیابی سے خائف تھے۔ انگریزی حکومت نے ان کے ساتھ اپنے رویہ میں مزید تبدیلی کی اور ان سب کی دل جوئی کی جانے لگی ان کی تمام جائدادیں بحال ہو گئیں۔ بعض کو تو پہلے سے زیادہ حقوق بخش دیے گئے اور ان کو پورے طور پر قابو میں کر لیا گیا۔ بنگال، پنجاب، یوپی وغیرہ تقریباً سب جگہ یہی کیفیت نظر آنے لگی۔ زمیندار زیادہ انگریزوں کے وفادار ہو گئے۔ تجار، دکان دار سب اپنی خوش حالی، اپنی عزت اور سکون کا دار و مدار، امن حکومت پر سمجھتے تھے اور اسی بنا پر وہ بغاوت کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں ان کو اس بغاوت سے ملی ہوئی پریشانی سے چھٹکارا انگریز ہی دے سکتے تھے لہٰذا وہ ہر قیمت پر انگریزی حکومت کے حامی ہو گئے۔ بغاوت کے خاتمے کے بعد جب ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی ملکہ بنیں تو انھوں نے دور اندیشی اور باریک بینی کے ساتھ یہ اعلان کیا:

> ''ہم ہندستان کے والیانِ ریاست کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان تمام معاہدوں اور اقرار ناموں کو قبول کرتے ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ ان کے پابند ہوں گے جو ان کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیے یا اس کے حکم سے کیے گئے۔ ہم ان کی طرف سے بھی اس طرح عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم دیسی حکمرانوں کے حقوق، وقار اور عزت کا اسی طرح پاس رکھیں گے جیسے یہ ہمارے اپنے ہیں''

یہ ایک چال تھی جس کا تمام اہل ریاست نے استقبال کیا اور تمام ہندوستانی زمیندار اور ساہوکار اس سلسلے میں متحد ہو گئے اور انگریزوں کی ہر پالیسی کے آگے سر خم کرتے چلے گئے ور خود حکومت بھی سوچتی رہی۔ بقول گبسن:

> ''جن کے سبب سے ہندستانیوں کے اعلیٰ طبقے ہم سے منھ موڑ لیں تو ہمارے لیے مستقل طور پر حکومت کرنا مشکل ہو جائے گا''[۱۲]

لہٰذا ملکہ کے اعلان نامہ میں یہ بھی شامل تھا:

> ''جو زمینیں ہندستانیوں کو اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہیں ان کے ساتھ ان کی وابستگی کے جذبے سے ہم آگاہ ہیں۔ اس کا پاس رکھتے ہیں اور ہم زمینوں سے متعلق ان کے تمام حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس طرح کے

قانون وضع کرتے ہیں اور نافذ کرتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم و
رواج کا مناسب احترام کیا جائے گا" ے

ان تمام حالات کے اثرات دور تک پہنچے اور پورے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بد یہی پالیسی ہوئی کہ عوام کے مقابلے میں جاگیرداروں، زمینداروں اور رجعت پسندوں کی ہمدردی حاصل کی جائے بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ جب بھی عوام میں مخالفت کی لہر اٹھتی تو دونوں وقتی طور پر متحد ہو جاتے تھے حالانکہ یہ اتحاد محض رسمی ہوتا۔ بعد میں پھر دونوں ایک دوسرے کو شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگتے۔ یہ والیان ریاست بے انتہا بزدل ہوتے تھے ان کی ریاستوں میں بدنظمی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہوتا تھا جس میں انگریزی حکومت کا بھی ہاتھ ہوتا۔ بقول رجنی پام دت:

"اب ان دیسی رجواڑوں کے جاگیرداروں کے ظلم و ستم کی نہ صرف
برطانوی حکومت پشت پناہی کرنے لگی تھی بلکہ اس میں برطانوی حکومت کے اس
طرز عمل سے زیادہ اضافہ ہو گیا" ۸

اس میں شک نہیں کہ غدر کے بعد انگریزی حکومت میں بڑا فرق آ گیا۔ تمام سماجی اصلاحوں کے کام ٹھپ ہو گئے۔ پوری طاقت، رجعت پسندی اور روایات کو برقرار رکھنے پر صرف کی جانے لگی۔ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی جانے لگی۔ نچلے طبقے کے عوام کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن غدر نے متوسط اور نچلے طبقے کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستان کے ترقی پسند عناصر جاگنے لگے اور برطانوی حکومت کے خلاف جد و جہد شروع ہوئی۔ حد سے زیادہ بڑھتا ہوا برطانوی حکومت کا جال اور ان کی لوٹ کھسوٹ کا سب سے زیادہ اثر کسانوں پر پڑا۔ بقول دت:

"برطانوی سرمایہ داروں کے ہندوستان میں جال بچھانے اور ان کی لوٹ
کھسوٹ کا نتیجہ یہ تھا کہ کسانوں کا افلاس اور تباہ حالی انیسویں صدی کے نصف آخر میں
بڑھ کر نہایت خطرناک شکل اختیار کر رہی تھی، اس وجہ سے عام بے چینی پھیل رہی تھی" ۹

برطانوی حکومت رجعت پسندوں کو اپنے حق میں لانے میں مصلحت رکھتی تھی حقیقت یہ تھی کہ اس کو اعلیٰ طبقے سے ذرا دل چسپی نہ تھی، وہ تو بقول پنڈت جواہر لال نہرو:

"دیسی ریاستوں کو برقرار رکھنا ہندوستان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے

ارادے سے تھا''۔۱۰

لیکن انگریزی حکومت کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ بجائے رخنہ ڈالنے کے وہ عوام کے دلمیں نفرت کا بیج بو رہے ہیں اور انھیں جگا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ طبقہ خوابِ خرگوش میں تھا لیکن عوام کو ہوش آ چکا تھا۔ اس کی آواز اٹھی جو تنہا انگریزی حکومت کے بھی خلاف تھی۔

ملکہ نے اپنے تمام نئے قوانین میں صرف اس بات کا لحاظ رکھا کہ اعلیٰ طبقے کے مراعات کا خیال رکھا جائے گا ور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ایسا طبقہ انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اصل تعداد تو عوام کی، مزدوروں کی، کسانوں کی تھی اور یہ طبقہ ہی نمائندہ حیثیت کا مالک تھا ان کو ترک کر کے تو کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اسی طبقے کو ایک سرے سے بھلا دیا گیا۔ بقول پی۔ سی۔ جوشی:

''گزشتہ راصلوات آئندہ را احتیاط کی آڑ میں اودھ کی دو تہائی تعلقہ داروں کو غداری کے انعام کے طور پر پہلے سے زیادہ موافق شرائط پر اپنی زمینیں واپس مل گئیں۔ اس کے برعکس ہم نے دیکھا کہ باقی کسان کے ساتھ کس بے دردی کا سلوک رکھا گیا۔ زمینداروں پر خاص لطف وعنایت اور کسانوں کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا 1857ء کے بعد حکومت کی مسلمہ پالیسی بن گئی''۔۱۱

یہ ایک زبردست بھول تھی جس سے انگریزی حکومت غافل تھی اور اسی غفلت کا نتیجہ جلد ہی ایک قومی تحریک کی شکل میں سامنے آ گیا۔ مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ سنبھل چکا تھا۔ اسے انگریزی حکومت کی حقیقت کا پتہ چل چکا تھا۔ اسی دوران پڑنے والے قحط اور دیگر وجوہات نے اور آنکھیں کھول دیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طبقے کا زمینداروں پر سے اعتماد اٹھ گیا اور ان سے اتحاد کا رشتہ توڑ دیا گیا۔ یہ طبقہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہونے لگا جو اب برطانوی حکومت کے خلاف اپنا محاذ تیار کر رہی تھی اپنے آپ کو مضبوط کر رہی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک کو مضبوط کرنے میں خود برطانوی حکومت کا بڑا ہاتھ تھا۔ حکومت صاف طور پر ہر معاملے میں فرق کرتی۔ اچھی نوکریوں سے متوسط طبقے کو محروم رکھنا۔ ہندو مسلم اختلافات، گورے کالے کا بھید، نسلی امتیازات کے جراثیم عوام کے درمیان حکومت وقت نے پھیلانے کی کوشش کی۔ بقول پی۔ سی۔ جوشی:

"شدید نسلی امتیاز تمام ملازمتوں میں سرایت کیے ہوئے تھا اور نسل پرستی انیسویں صدی میں سرزمین مشرق میں برطانوی حکومت کی امتیازی خصوصیت تھی.....اگرچہ ہندوستانی کھلے مقابلے کے امتحان کے ذریعہ انڈین سول سروس میں بھرتی ہو سکتے تھے۔ لیکن خاص درجوں سے اوپر کے عہدوں پر فائز ہونے کا حق حاصل نہ تھا۔ اپنے زمانے کے ممتاز ترین ہندستانی حاکم آر۔سی۔دت کو استعفا پیش کرنا پڑا کیونکہ نسلی امتیاز کی بنا پر انھیں کمشنر کے عہدے پر مامور نہ کیا گیا۔"[۱۲]

یہ زہر ہندستانی سماج میں پھیلتا گیا۔ برطانوی حکومت کے رحم میں ظلم تھا، اس کی نرمی میں ایک نفرت جھلکتی تھی۔ ان ساری چیزوں نے ہندوستانی عوام کے دلوں پر بڑا کام کیا۔ ایک روشن طبقہ دھیرے دھیرے ابھرتا رہا کلکتہ اسکا مرکز تھا۔ یہیں کے نوجوان پہلی بار کھل کر سامنے آئے اور تحریک کو مضبوط کرتے رہے۔ یہ تحریک کیا تھی، کیسے چلی اور کس طرح سے کامیابی کے منازل طے کرتی اپنی منزل تک جا پہنچی۔ یہ بحث طولانی ہے، یہاں پر اس کا موقع نہیں لیکن یہ حقیقت تھی کہ برطانوی حکومت تمام تر خودغرضی و چالاکی پر مبنی تھی اور اس طرح کی حکومت کا پنپنا ناممکن تھا۔ اس خودغرضی اور چالاکی نے ہندوستانی عوام کے بیدار ہونے میں بڑا کام کیا جس طبقے کو انگریز ہنسی میں اڑاتے رہے وہی ان کے لیے دردسر بن گیا۔ وہی روشن خیال طبقہ آگے بڑھا اور قومی تحریک میں اس نے نمایاں رول ادا کیا بقول کارل مارکس:

"یہ نیا طبقہ وجود میں آ رہا ہے جو حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل ہے اور یورپی سائنس سے بخوبی آشنا ہے۔"[۱۳]

غرض کہ غدر کے بعد انگریزوں کی پالیسی چالاکی اور رذیل ترین مقاصد پر مبنی تھی اور یہی انقلاب کا باعث بنی۔ کیونکہ ہندوستانیوں کو احساس ہو چکا تھا۔ بقول مارکس:

"سماج میں بوئے ہوئے بیجوں کا پھل ہندوستانی اس وقت تک نہ پائیں گے جب تک وہ خود اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جوا اُتار پھینکیں۔"[۱۴]

ادبی حیثیت سے: 1857ء کا ہنگامہ ایک حادثے کے طور پر سرعت سے اُٹھا اور دب گیا لیکن اپنے آپ میں ایک ایسا تاریخی موڑ چھوڑ گیا کہ ہندستان کی کوئی تاریخ اس حادثے کے ذکر

کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حادثہ محض اتفاقی نہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ فکر وسیاست کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس حادثہ کا تعلق براہ راست سماجی وسیاسی تھا لیکن لیکن اس کی اہمیت زندگی کے ہر گوشے پر اثر انداز ہوئی۔ زبان وادب بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔

زبان وادب کا رشتہ سیاست وسماج سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر عہد کا ادب اپنے وقت کے سماجی اُتار چڑھاؤ سے ہر حالت میں کسی نہ کسی شکل میں منسلک رہتا ہے۔ پھر یہ عظیم ہنگامہ ذہن وخیال کی لپیٹ میں کیوں نہ آتا بقول محمد حسن:

> "1856ء کی لڑائی فکر وخیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے، اور چونکہ ادب بھی خیال اور جذبہ کا ہی نام ہے اس لیے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا تھا وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دلچسپی کا موضوع ہے۔"[۱۵]

اس قول کے مطابق اس حادثے کا اثر ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ اب یہ تلاش کرنے کے لیے اس کے اثرات اردو ادب میں کس حد تک اور کس انداز سے رونما ہوئے۔ اس وقت کے اَدب کی طرف مُڑنا پڑے گا۔ اس ہنگامے کے وقت پورا ہندستان اس میں شامل نہ تھا۔ کچھ ہی خطے اہم تھے جو اس عظیم کھیل میں اپنا پورا رول ادا کر رہے تھے اور یہ خطہ شمالی ہند سے تعلق رکھتا ہے۔

غدر سے پہلے اُردو ادب کا اور اُردو والوں کا ایک دوسرا ہی ماحول تھا شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر اُمراء و روساء ہوا کرتے تھے سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی، اس لیے اس وقت کے ادب میں بھی ہمیں یہی عناصر ملتے ہیں۔ پھر جب سے انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم وجبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں ایک انقلاب آگیا۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

> "بغاوت رونما ہوئی۔ مبہم غیر معین، غیر منظم لیکن شدید قومی جذبے کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ چھوٹے بڑے بہت سے اودھ کو جو فن وتہذیب کا بڑا مرکز تھا، 1857ء میں انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دہلی میں مغل حکومت صرف نام کی رہ گئی تھی۔ ایک نئی سلطنت وجود میں آگئی جس کی جڑیں سرزمین ہند

میں نہ تھیں اور جو ہندستانی تمدن سے بیگانہ تھی۔"۱۶

یہ تضاد، یہ انتشار پورے ہندوستانی سماج میں پھیلتا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کا شکنجہ کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھنے لگے۔ دہلی اجڑ چکی تھی لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ ایسی حالت میں ادب کیسے بچ سکتا تھا، وہ بھی بھیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کی بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی، افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں اور جو بعض مقامات میں، انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن جب بغاوت اٹھی تو یہ بھی اس میں پے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے نمایاں اثرات ان کے خطوط اور ان کے شاعری میں نظر آتے ہیں مثلاً

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

یا اردوئے معلیٰ و عودِ ہندی (خطوط کے مجموعے) میں اس وقت کے حالات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے محمد حسین آزادؔ کے والد محمد باقر کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا مشہور شاعر امام بخش صہبائی کو ان کے دو بیٹوں سمیت گولی سے اڑا دیا گیا۔ مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس عہد کے مشہور و معروف عالم مولانا فضل حق کو جلاوطن کر کے انڈمان بھیج دیا گیا، جہاں ان کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ منیر شکوہ آبادی کی نظموں میں اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے ان کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا ان سب کی تخلیقات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک شعر میں اس عہد کی تصویر نظر آئے گی۔ افسردگی کا یہ مزاج اس وقت کی پوری شاعری میں سما گیا تھا۔ غزل نے ایک الگ روپ اختیار کیا۔ اشارے و کنائے کی زبانیں تیز ہو چلیں۔ امیر مینائی کے ایک شعر کے مطابق۔

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ حکومت جو شاعر بھی تھے ان کی لے میں کس قدر آہ و درد ہے ظالموں نے ان کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ ان کی ایک غزل سے آنسو ٹپکتے ہیں۔

یا مرا افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاجِ گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دُنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

واجد علی شاہ اختر جو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے لیے مشہور تھے۔ اور ایک خاص مزاج، نفاست اور لطافت کے مالک تھے اپنی تباہ حالی کا بیان اپنی مثنوی حزنِ اختر میں بڑے درد کے ساتھ کرتے ہیں ان کی بعض غزلیں بھی سوز و گداز سے لبریز ہیں۔ شیفتہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے ان کے یہ دو شعر کس قدر درد اور تڑپ کا اظہار کرتے ہیں۔

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں
کیا زہر اُگل رہے ہیں بلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

اُردو شاعری کے یہ چند موتی جو اس آگ کی لپٹ سے بچ سکے اس دور کی خستہ حالی، پریشانی اور مصیبتوں کے مظہر ہیں، ورنہ زیادہ تر سرمایہ تو برباد ہو گیا اور محفوظ نہ رہ سکا، پھر بھی جو تصانیف ہمیں مل جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

خطوطِ غالب: مرزا غالب۔ داستانِ غدر: مصنف ظہیر دہلوی۔ تاریخ سرکشی بجنور، سرسید احمد خاں۔ رسالہ اسبابِ بغاوت ہند: سرسید احمد خاں۔ تاریخ ہند: ذکاء اللہ۔ روزنامچۂ غدر: مترجمہ نذیر احمد۔ واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، غالب اور شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو

دورانِ بغاوت میں لکھی گئیں اہم ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی انقلاب ہوا اور سرد پڑ گیا لیکن بغاوت کے بعد اس کی جو اہمیت تسلیم کی گئی اور اس کی باریکیوں، نزاکتوں اور دور سے نظر آنے والے فائدوں کو پڑھا اور سمجھا گیا۔ 1857ء میں اس کی اصل شکل نہ سمجھی جا سکی تھی۔ وہ تو بس ہندوستان کی بدنصیبی، لا پروائی، اپنی کمزوری اور انگریزوں کی طاقت کی علامت سمجھی گئی۔ بقول احتشام حسین:

''بیشتر حالتوں میں اسے قہرِ الٰہی، فریبِ تقدیر، آسمان کی چشمِ بد، انقلاب زمانہ اور اعمالِ بد کی سزا کا تصور کہا گیا'' ۷۱

ابتداء میں بغاوت کا صحیح تصور ذہن میں نہ تھا لیکن جب بغاوت سرد پڑی تب ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا، دل و دماغ میں بیداری آئی، اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم و زیادتی میں کسی طرح کی کمی نہ آئی تو ساری بیداریاں متحد ہو گئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا۔ ذہن جاگا فکر نے کروٹیں لیں، خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج انقلاب کے بعد رفتہ رفتہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ادب میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہنگامے سے ذرا پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بے بسی تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے، بغاوت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ اس ضمن میں ظ۔ انصاری کا خیال بالکل درست ہے:

''1857ء کے ہنگامے سے، اس کے پہلے اور اس کے بعد کے احساس پس ماندگی اور شکست کمل کے جو منفی اثرات اُردو ادب میں نظر آتے ہیں وہ تصویر کا ایک دردناک رُخ ہے لیکن دوسرا رُخ اس قدر تابناک بھی ہے، اس سے تاریخی واقعہ کی جدلیات (Dialectics) کا سُراغ ملتا ہے، جب ہم شعراء اور ادیبوں کی تباہ حالی، عام لوگوں کے احساس، بے بسی، ادبی مرکزوں کی سراسیمگی، کلیات، دیوانوں اور تصنیفوں کی تلفی، بیباک اہلِ قلم کی زباں بندی، قتل، پھانسی اور کالے پانی کی سزاؤں کے ساتھ۔ ادب کے سرپرستوں کی پریشانی زندگی کے اُن گھپ اندھیروں میں نئے تصورات، عقلیت پسندی، نئی آگہی اور نئے قومی ذہن کی بیداری کو اونچا ہوتے دیکھتے ہیں یہ لو آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہے اور اس کی روشنی اس خونی

افق سے پھیلی ہے، جس میں ہمارے بڑے بڑے روشن ستارے ڈوب گئے۔"[18]

یہ تھے اس موت کی آڑ میں جھانکتی زندگی کے آثار، کفن کی سفیدی میں پوشیدہ نظر آنے والی روشنی، ظلم کی آواز میں گونجتی مخالفت کی لہر، نیا شعور، نیا ذہن، نیا سماج اُبھر رہا تھا۔ اس کانپتے ہوئے دور میں جب انگریز حکومت اُکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، ہندوستانی عوام، ہندوستانی سماج، نئے جذبات نئے احساسات کے ساتھ ایک نئی اٹھکھیلیاں دکھا رہا تھا، افسردگی تازگی کا روپ دھارنے لگی، احساسِ پسپائی کی شدت میں کسی حد تک کمی آچکی تھی، ماضی مستقبل کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ان سب کا براہ راست اثر ادب پر پڑا۔ 1857ء کے بعد اُردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش، ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریر کا آغاز ہونے لگا۔ بقول احتشام حسین:

> "اس کے بعد ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے ادب کے راہی قرار دیا جاسکتا ہے، جنھوں نے ادب کو قوم کے ارتقاء میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے خیال میں ایک ادیب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں: سر سیدؔ احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، ڈاکٹر نذیر احمد مولانا شبلیؔ، مولانا ذکاءاللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقارؔ الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہو اور اس کے لیے فائدے مند بھی ہو۔"[19]

انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد ادب میں یہ فرق تھا اور یہ فرق انقلاب ہی نے پیدا کیا تھا اسی بنا پر 1857ء کی جدوجہد تنہا ہماری سیاسی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ ہمارے ذہن، تمدّن اور ادبی ارتقاء میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

1857ء کے بعد کا ماحول ڈگمگا رہا تھا، ادب میں ایک عجیب سی بے چینی نظر آرہی تھی، قدامت اور جدیدیت ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہی تھیں اور ابھرتے ہوئے دونوں عناصر مل جل کر ایک نیا خمیر بنا رہے تھے دربار سے رشتہ ٹوٹ کر سماج سے جڑنے لگا تھا۔ اپنے ذہن اور اپنے بازوؤں پر اعتماد کیا جانے لگا۔ شکست کے بعد اس حقیقت سے انکار کی گنجائش قطعی نہ رہ گئی تھی کہ

نئے خیالات اور نئے حالات کو آنے سے اب کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ماضی کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن تنہا اس کو گلے لگا کر جینا اب مشکل ہے۔ یہ احساس رفتہ رفتہ سماج میں اثر کرنے لگا اسی لیے ادبی تحریروں میں فرق آیا...ادیبوں نے سوچا کے حال تو تباہ ہو گیا، اب مستقبل ہاتھ سے نہ جانے پائے اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے روشن ماضی ہی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اسی خیال کے تحت ہم کو انقلاب کی اہمیت تسلیم کرنے میں شاید جھجک نہ ہو کہ اسی وجہ ادب میں ایک خوش گوار انقلاب آیا، اور حادثہ ہی ادب کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ کرتا ہے تو دوسرے سنبھلے ہوئے دور کا آغاز بھی۔ فراق گورکھپوری کا یہ خیال کہ:

"ہندوستان کا 1857ء کا غدر (انقلاب) دو دھاری تلوار تھا، جس نے دونوں طرف سے وار کیا اور جو تخریبی کے ساتھ ساتھ تعمیری اور تخلیقی بھی تھا۔" ۲۰

دربار سے شاعر کا رشتہ ٹوٹا تو اردو شاعری کا دامن نئے ہندستان سے آراستہ ہونے لگا۔ اب شاعری کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ آ گئی۔ نئے نظام کے زیر سایہ پلنے لگی۔ نئے بکھرے ہوئے شاداب جھرنوں کے سوتے شاعری میں پھوٹنے لگے۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ یہ سب الگ الگ مزاج، ایک الگ ذہن اور ایک نئی فکر کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے۔ ان سب میں سے کسی کا تعلق دربار سے دور دراز تک نہ تھا اور نہ ہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دربار کے طور طریقے سے واقف نہ تھا۔ ان لوگوں نے آگے چل کر کیا کیا گل افشانیاں کیں اس کا تذکرہ آگے تفصیل سے آئے گا۔ یہاں پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ غدر سے قبل جو داستانوں کا رواج تھا وہ ایک دم سے سلیس اور معنی خیز نثر میں تبدیل ہو گیا۔ بقول محمد حسن:

"داستانوں میں ہر داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اُتار کر .... متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں دے دیا گیا۔ اس نئی ادبی فضا نے کون سے رُخ اختیار کیے، یہ جدید اردو اور ادب کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس فضا کا نقطۂ آغاز 1857ء ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔" ۲۱

مثنوی کا دور ختم ہوا کیوں کہ ان کے مزاج کی فضا اب باقی نہ رہی۔ دربار اُجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا۔ پہلے ایک ایک شعر پر نواب اشرفیاں برسا دیتے تھے، اب خود نواب ہی مال و زر کو ترستے تھے۔ نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں، داستانیں ہٹنے لگیں۔ فرد کے بجائے اب

پوری جماعت سے تعلق ہونے لگا، ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا۔ نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا، مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اُردو ادب کے چند علمبردار سامنے آئے جنھوں نے پورے سرمائے پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی کوششوں سے اس فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیئے۔ سرسید کی بدولت فلسفیانہ، اخلاق و مذہبی خیالات آئے۔ حالیؔ نے مقدمہ اور مسدس لکھ کر ایک زبردست اضافہ کیا، نذیر احمدؔ نے اُردو ناول کا تعارف کرایا۔ شبلیؔ نے تاریخ کے ذریعہ ایک نئی اور زندہ نثر سے ادب کو روشناس کرایا۔

غرض کہ ادب میں نئے خیالات کی بھرمار ہوگئی جس کے اثرات دور دراز تک پھیلنے لگے اور آج تک اُردو کا پورا سرمایہ ان ہی خیالات کے اردگرد ناچ رہا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ جدوجہد محض سیاسی بیداری کی ہی حامل نہیں بلکہ ہماری ذہنی، فکری اور ادبی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ سرسید، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمدؔ، ذکاءاللہ اور محسنؔ الملک ان سب نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جنھوں نے آگے چل کر اُردو ادب میں ایسی واضح تبدیلیاں کیں کہ اُردو ادب ان کے احسانوں سے کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔

حواشی و مآخذ

1۔ انقلاب 1857ء۔ پی۔سی۔ جوشی۔ ص 208 اُردو ترجمہ

2۔ ہندوستانیوں کی پہلی شکست 1757ء میں جنگ پلاسی میں ہوئی۔

3۔ پی۔ای۔ رابرٹس ص 388 اُردو ترجمہ۔

4۔ A History of The Indian Revolution By T. R. Homes

5۔ اسباب بغاوت ہند ص 5

6۔ Mutiny In Oudh-P.98 M.R. Gibson- P. 98

7۔ The Making of British Ind a-P.382-83

8۔ نیا ہندستان (4-5) ص 459

9۔ نیا ہندوستان (4-5) ص 462

10۔ تلاش ہند ص 284

11۔ انقلاب 1857ء مُرتب پی۔سی۔ جوشی ص 10-209

12۔ ایضاً ” ص 221

13 اور 14۔ Articles On India - P 66 بحوالہ پی۔سی۔ جوشی

15۔ 1857ء کی ادبی اہمیت ”شعرنو“ از محمد حسن ص 32

16۔ اردو ادب اور 1857ء از پروفیسر احتشام حسین ص 246 انقلاب 1857ء مُرتب پی۔سی۔جوشی

17۔ اردو ادب اور 1857ء از احتشام حسین ص 246 انقلاب 1857ء مرتب: پی شی۔ جوشی

18۔ اردو ادب 1857ء کے دور میں۔ زبان وبیان از ظ۔ انصاری ص 245

19۔ ادب اور انقلاب 1857ء مرتب پی۔سی جوشی (پروفیسر احتشام حسین)

20۔ مرزا رسوا: حیات اور ناول نگاری از آدم شیخ ص 35

21۔ 1857ء کی ادبی اہمیت (شعرنو۔ محمد حسن۔ ص 46)

شاہزادہ مرزا محمد فیروز شاہ کا اعلانیہ[1]

(بحوالہ انگریزی متن چارلس بال، دی ہسٹری آف میوٹنی، جلد دوم، صفحات 32-630 رضوی، فریڈم اسٹرگل . . . جلد اول صفحات 55-453)

یہ سب لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے لوگ، ہندو اور مسلمان دونوں کافر اور دھوکہ باز انگریزوں کے ظلم اور زیادتیوں سے تباہ ہو رہے ہیں، اس لئے ہندوستان کے تمام امیر لوگوں کا یہ لازمی فرض ہے خاص طور پر اُن کا جن کا کسی بھی طرح مسلمان شاہی خاندانوں سے کوئی تعلق ہے اور جن کو لوگوں کا مرشد اور مالک سمجھا جاتا ہے کہ وہ عام لوگوں کی بھلائی کے لئے اپنی جان اور مال کی بازی لگائیں۔ اس عام مقصد کو پورا کرنے کے لئے دہلی کے شاہی خاندان کے کئی شاہزادوں نے خود ہندوستان، ایران، توران اور افغانستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا ہے اور بہت دنوں سے اقدام اٹھاتے رہے ہیں کہ اب اپنے محبوب مقصد کو حاصل کریں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مذکورہ بالا شہزادوں میں سے ایک نے افغانستان کی فوج کی سربراہی کرتے ہوئے ہندوستان میں قدم رکھا ہے اور میں جو ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ غازی، ہندوستان کا پوتا ہوں۔ دورہ پورا کر کے یہاں کافروں کے خاتمے کے لئے آیا ہوں جو ملک کی مشرقی حصہ میں رہ رہے ہیں تاکہ لوگوں کو آزاد کر کے بے چارے غریب لوگوں کی حفاظت کر سکوں جو اس وقت ان کی آہنی حکومت میں کراہ رہے ہیں اور مجاہدین کی مدد سے یا ان جنگ آزماؤں کی مدد سے جو مذہب کے لئے علم محمدی بلند کر کے اور راسخ العقیدہ ہندوؤں کو راضی کر کے جو ہمارے بزرگوں کی رعایا تھے اور پہلے بھی اور آج بھی انگریزوں کے تباہ کرنے میں بہادری کی جھنڈا بلند کر کے ہمارے ساتھ ہیں۔

کئی ہندو اور مسلمان حکمرانوں نے اپنا گھر بار عرصہ ہوا چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنے مذہب کا تحفظ کر سکیں، اور ہندوستان سے ان انگریزوں کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنی بہترین کوششیں کرتے رہیں اب میرے پاس آگئے ہیں اور انہوں نے موجودہ دور میں جاری ہندوستانی جہاد میں حصہ لیا ہے۔ اس کی بہت

زیادہ امید ہے کہ مجھے مغرب سے بھی مدد مل جائے عوام کی اطلاع کے لئے موجودہ اشتہار، جس میں کئی دفعات ہیں، جاری کیا جاتا ہے اور سب پر یہ لازمی فرض ہے کہ اس پر غور کریں اور اس پر قائم رہیں جماعتیں جو اس عام مقصد میں حصہ لینا چاہتی ہیں لیکن ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ اپنی کفالت کر سکیں، ان کو میری طرف سے روزانہ گذارہ کے لئے رقم ملے گی۔ اور یہ سب کو معلوم ہو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تمام قدیم کتابوں، کراماتی تحریروں، جیوتشوں کے حساب میں، نیز پنڈت اور رمل سب اس بات پر اچھی طرح متفق ہیں کہ انگریزوں کو جلد ہی ہندوستان کے کسی کونہ میں یا اور کہیں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اس لئے سبھی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے قائم رہنے کی امید چھوڑ دیں اور عام بھلائی کو بڑھاوا دینے کی کوشش کریں، شاہی حکومت کی عنایت کے مستحق بن جائیں اور اس طرح وہ اپنے مقصد کو حاصل کریں، ورنہ اگر یہ سنہرا موقع نکل گیا تو ان کو اپنی حماقت پر افسوس ہوگا اسی بات کو دو خوبصورت شعروں میں شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی کسی مناسب موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو کیونکہ موقع کے میدان میں تمہارا سامنا قسمت کی گیند سے ہوتا ہے، اگر تم ہاتھ آنے والے اس موقع کا فائدہ نہیں اٹھاتے ہو تو تم کو غم کے مارے اپنی انگلیاں کاٹنی پڑیں گی۔

کسی شخص کو بھی انگریزی حکومت کے بہی خواہوں کے غلط بیان سے، موجودہ تکلیف کے پیش نظر جو انقلابات کے ساتھ لازمی ہیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اسی طرح کی تکالیف اور مصیبت بادشاہی حکومت کے مکمل قیام کے بعد بھی جاری رہیں گی، اور وہ لوگ جن کے ساتھ کسی فوجی یا لٹیرے نے بدسلوکی کی ہو، آ کر اپنی شکایت میرے سامنے پیش کرے میرے ذریعہ دادرسی ہوگی۔ موجودہ حالات میں ان کی جو بھی جائداد ضائع ہوگی، جب بادشاہی حکومت اچھی طرح قائم ہو جائے گی اس کو عوام کے خزانہ سے پورا کیا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت نے زمینداری بندوبست کے ذریعہ حد سے زیادہ جمع لگا دی ہے۔ اور بہت سے زمینداروں کو رسوا اور برباد کر دیا ہے اور ان کی زمینداریاں مال گذاری کے بقایا کی علت میں نیلام کرا دی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک معمولی رعیت، ملازمہ یا ملازم کے مقدمہ دائر کر دینے پر، عزت دار زمینداروں کو عدالت طلب کیا جاتا ہے، گرفتار کر کے، جیل میں ڈال کر انہیں بے عزت کیا جاتا ہے۔ زمینداری کے مقدمات کے سلسلہ میں بہت زیادہ قیمت کے اسٹیمپ اور دیوانی عدالت کے دوسرے غیر ضروری اخراجات، جو ہر طرح کی چالبازانہ داؤں پیچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر ایک مقدمہ کو برسوں تک لٹکائے رکھنے کا عمل ہے تاکہ مدعیان اور غریب ہو جائیں۔ علاوہ اس کے زمینداروں کی

جیب پر اسکولوں، اسپتالوں اور سڑک وغیرہ کے لئے چندہ کے نام پر سالانہ بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح کی چھین جھپٹ کے لئے بادشاہی حکومت میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ برخلاف اس کے جمع ہلکی ہوگی، زمینداروں کی عزت اور وقار محفوظ ہوگا اور ہر زمیندار کو اپنی زمینداری کے اندر حکومت کا مکمل اختیار ہوگا۔ زمینداری کے قضیے شرع اور شاستروں کے مطابق بغیر خرچ کے جلد طے کئے جائیں گے۔ وہ زمینداران جو موجودہ جنگ میں اپنے آدمیوں اور مال سے مدد کریں گے ہمیشہ کے لئے نصف مال گذاری کی ادئگی سے معاف کردئے جائیں گے۔ وہ زمینداران جو صرف روپیوں سے مدد کریں گے ان کی مال گذاری ہمیشہ کے لئے معاف ہوگی اور وہ زمیندار جس کو انگریزی حکومت نے ناحق طور پر ان کی زمین سے محروم کردیا ہے اور وہ ذاتی طور پر اس جنگ میں شرکت کرتے ہیں تو ان کی زمینداری کو بحال کردیا جائیگا اور 1/4 حصہ مال گذاری کی ادائگی سے مستثنی کردیا جائے گا۔

تاجروں کے بارے میں یہ صاف ہے کہ کافر اور دھوکہ باز برٹش حکومت نے تمام قیمتی سامان تجارت پر اجارہ داری قائم کررکھی ہے جیسے نیل، کپڑے اور دوسری برآمدی مصنوعات، صرف معمولی سامان تجارت کو لوگوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں بھی ان کے اپنے منافع کا حصہ برقرار ہے، جو وہ کسٹم اور اسٹیمپ فیس مقدمات مال وغیرہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اس طرح عام لوگوں کے پاس صرف نام کی ہی تجارت ہے اس کے علاوہ تاجروں کے منافع پر ڈاک محصول، چنگی محصول، اسکولوں کے لیے چندہ وغیرہ کے نام سے عاید کیا جاتا ہے۔ باوجود ان تمام مراعات کے، تاجر ایک معمولی فرد یا ایک نکمے آدمی کی شکایت پر سزا اور بے عزتی کا شکار ہوتے ہیں۔ جب بادشاہی حکومت قائم ہوجائے گی یہ تمام دھوکہ دھڑی کی کاروائی ختم کردی جائے گی اور ہر قسم کی تجارت بغیر استثنی کے زمین اور سمندر کے راستوں ہندوستانی تاجروں کے لئے کھلی ہوگی جن کو سرکاری دُخانی جہاز (بھاپ کے جہاز) اور بھاپ سے چلنے والی گاڑیوں کی سہولت اپنے سامان لے جانے کے لئے حاصل ہوگی۔ وہ تاجرین جن کے پاس سرمایہ نہیں ہوگا ان کو سرکاری خزانہ سے مدد دی جائے گی۔ اس لئے ہر ایک تاجر کا یہ فرض ہے کہ اس جنگ میں حصہ لے اور بادشاہی سرکار کی جان و مال سے خفیہ یا اعلانیہ طور پر مدد کرے جیسا کہ ان کے حال کے مطابق ہو یا دلچسپی ہو اور برٹش حکومت سے اپنی وفاداری ترک کردے۔

سرکاری ملازمین کے متعلق یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ انگریزی حکومت کے تحت فوج اور شہری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی کوئی عزت نہیں، تنخواہیں کم ہیں اور رسوخ کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تمام اعلی منصبوں اور بڑی تنخواہوں کی جگہیں ان دونوں محکموں میں انگریزوں کو دی جاتی ہیں۔ مقامی باشندے، جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ نذر

کر دیتے ہیں صوبیدار کے عہدہ تک پہنچ پاتے ہیں (جو ان کی تمناؤں کی معراج ہے) جہاں ساٹھ یا ستر روپے ماہوار تنخواہ ہے اور وہ لوگ جو شہری ملازمتوں میں ہیں صدر علی کے عہدے پر جس کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہانہ حاصل کرتے ہیں۔ جس پر نہ کوئی رسوخ ہے نہ جاگیر اور نہ ہی تحفہ لیکن بادشاہی حکومت کے تحت کرنل، جنرل اور کمانڈر انچیف کے عہدے، جو فی الوقت انگریزوں کے پاس ہیں اس کے متوازی مناصب جیسے پانصدی، پنج ہزاری، ہفت ہزاری اور سپہ سالاری وغیرہ دیسی افراد کو جو فوجی ملازمت میں ہیں دی جائیں گی۔ کلکٹر، مجسٹریٹ، جج، صدر جج، سکریٹری اور گورنر کے عہدے، جو اس وقت یوروپین شہری ملازمین کے پاس ہیں، متوازی عہدے جیسے وزیر، قاضی نیز صوبہ ناظم اور دیوان وغیرہ لاکھ روپے تنخواہ کی عہدوں پر دیسی شہری ملازمین کو مع جاگیر، خلعت اور انعامات اور رسوخ کے نوازا جائے گا۔ دیسی ہندو یا مسلمان جو انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوں گے یقیناً جنت میں جائیں گے اور وہ لوگ جو انگریزوں کے لئے جنگ کریں گے بلاشبہ دوزخ میں جائیں گے۔ اس لئے تمام دیسی افراد کو جو انگریزوں کی ملازمت میں ہیں اپنے مذہب اور مفاد سے باخبر ہونا چاہئے، اور انگریزوں کی وفاداری ترک کر کے بادشاہی حکومت کا ساتھ دینا چاہئے اور فی الوقت دو سو یا تین سو روپے ماہانہ حاصل کریں اور مستقبل میں اعلیٰ عہدوں کے مستحق ہوں۔ اگر وہ کسی وجہ سے فی الوقت انگریزوں کے خلاف کھل کر اعلان نہیں کر سکتے تو دل میں ان کا برا چاہیں اور موجودہ حالات میں بغیر کوئی حصہ لئے خاموش تماشائی رہیں۔ لیکن اس وقت ان کو بلاواسطہ بادشاہی حکومت کی مدد کرنی چاہئے اور اپنی بہترین کوشش انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دینے کی کرنی چاہئے۔

> "وہ تمام فوجی اور سوار جنہوں نے اپنے مذہب کی خاطر اور انگریزوں کی تباہی کے لئے ساتھ دیا ہے اور ہر وقت کسی وجہ سے خواہ وہ اپنے وطن میں وطن سے باہر پوشیدہ ہیں، ان کو میرے پاس بغیر کسی تاخیر اور ہچکچاہٹ کے حاضر ہونا چاہئے"۔

پیدل فوجیوں کو تین آنے اور سوار کو آٹھ سے بارہ آنے روزانہ کے حساب سے فی الوقت ادا کیا جائے گا۔ بعد میں ان کو جو انگریزی حکومت کی ملازمت میں ملتا تھا اس کا دگنا دیا جائے گا۔ فوجی جو انگریزوں کی ملازمت میں نہیں ہیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے رہے ہیں ان کو روزانہ گذارہ کے لئے روپے دیے جائیں گے۔

درج ذیل شرح کے حساب سے جن کی صراحت کر دی گئی ہے فی الحال ادا کئے جائیں گے اور آئندہ پیدل فوجیوں کو آٹھ یا دس روپے اور سوار کو بیس تا تیس روپے ماہانہ ادا کئے جائیں

گے۔ بادشاہی حکومت کے مستقل قیام کے بعد وہ اعلیٰ ترین عہدہ کے جاگیر اور نذرانے کے مستحق ہوں گے۔

بندوقچی	دو آنہ روزانہ
رائفل مین	ڈھائی آنہ روزانہ
تلوار باز	ڈیڑھ آنہ روزانہ
گھوڑسوار بڑے گھوڑے کے ساتھ	آٹھ آنہ روزانہ
گھوڑسوار چھوٹے گھوڑے کے ساتھ	چھ آنہ روزانہ

اہل حرفہ کے متعلق یہ واضح ہے کہ فرنگیوں نے انگریزی مصنوعات کو ہندوستان میں رائج کر کے، جولاہوں، حذافوں، بڑھیوں، لوہاروں اور جوتا بنانے والوں کو بے روزگار بنا دیا ہے اور ان کے پیشہ پر قبضہ جما لیا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کے دیسی اہل حرفہ کو بھکاری بنا دیا ہے۔ لیکن بادشاہی حکومت کے تحت دیسی اہل حرفہ خصوصی طور پر بادشاہوں، راجاؤں اور امیر لوگوں کی خدمت میں ملازم ہوں گے اور بلاشبہ یہ ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔ اس لئے ان کاریگروں کو انگریزی ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیے اور مجاہدین کے ساتھ مل کر مذہب کی خاطر جنگ کرنی چاہیے اور اس طرح سیکولر اور روحانی خوشی کا حقدار بننا چاہیے۔

پنڈتوں، فقیروں اور علما کے متعلق پنڈت اور فقیر ہندو اور مسلمان کے سرپرست ہیں اور یورپین دونوں مذاہب کے دشمن۔ چونکہ اس وقت جنگ انگریزوں کے خلاف مذہب کی وجہ سے چل رہی ہے۔ پنڈتوں اور فقیروں کو میرے پاس ضرور آنا چاہیئے، اور اس پاک جنگ میں حصہ لینا چاہیے ورنہ وہ شرع اور شاستروں کے مطابق قصوروار ہوں گے لیکن گر وہ آتے ہیں تو بادشاہی حکومت کے اچھی طرح قائم ہونے کے بعد انہیں زمین معافی میں دی جائے گی۔

آخر میں یہ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ بالا طریقوں میں جو بھی اس اشتہار کے مشتہر ہونے کے بعد انگریزی حکومت کا وفادار رہے گا اس کا تمام علاقہ ضبط کر لیا جائے گا اور جائیداد لوٹ لی جائے گی، اسے اور اس کے پورے خاندان کو قید کر لیا جائے گا اور بالآخر ہلاک کر دیا جائے گا۔

حواشی و مآخذ

1۔دہلی گزٹ 1857 میں شائع ہوا تھا جسے فرینڈ آف انڈیا سیرام پور، کی اشاعت مورخہ 17 اکتوبر 1858 میں 'دی دہلی ملینم' کے عنوان سے درج ذیل تبصرہ کے ساتھ شائع کیا تھا:

''دہلی گزٹ نے بغاوت سے متعلق ایک اہم تاریخی مضمون شائع کیا ہے۔ یوروپین مذاق کے تحت یہ پہلا مینوفیسٹو ہندوستان سے شائع ہوا ہے، جس میں شکایات کی پہلی فہرست دی گئی ہے اور پہلی کوشش کی گئی ہے کہ لوگوں کو بغیر مذہب کے وعدوں کے ذریعہ بھڑکایا جائے گا۔ یہ ایک اعلانیہ کی شکل میں ہے جو بادشاہ دہلی کی (بلکہ شہزادہ فیروز شاہ) کی جانب سے 25 اگست 1857 کو ہندوستان کے لوگوں کے نام شائع کیا۔ ہر طبقہ کی شکایتوں کی صراحت کی گئی ہے اور اس کے حل کا وعدہ کیا گیا ہے اگر وہ چاہیں اور ہمت کے ساتھ پرانی حکومت کے لئے جنگ کریں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کی دستاویزات کی کوئی بنیاد نہ ہو وہ جانتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شکایتوں کو دور کئے جانے کو کبھی نہیں محسوس کیا گیا۔ اور اگر واقعی الزامات جو عوام لگا رہے تھے، تو اینگلو انڈین کتنی ہلاکت آمیز غلطی میں تھے کہ انہوں نے ان کے مزاج اور ضرورتوں، ان سازشوں کے جاننے کے بعد جو شہزادے برسوں سے کر رہے تھے، اور وہ پیشن گوئیاں جو ہندو اور مسلمانوں میں رائج تھیں کہ انگریزوں کا صفایا قریب ہے جیسا کہ بادشاہ نے زمینداروں سے خطاب کیا ہے۔ یہ اعلان کہ مال گذاری جابرانہ ہے اور سے کم ہونا چاہئے، کی صرف امید کی جانی چاہیے۔ قائدین جو عام لوگوں سے اپیل کرتے ہیں، جیک کیڈ سے لے کر مسٹر کوبڈن تک، سب نے ہمیشہ سستی روٹیاں مہیا کرنے اور کم گذاری کے وعدے کئے تھے۔ یہ وعدہ کہ ہر زمیندار اپنی زمینداری میں مالک ومختار ہوگا فطری تھا اور وہ جانتا تھا جو ہم نہیں جانتے تھے کہ اب بھی جاگیردارانہ نظام مضبوط تھا۔ لیکن اگر ہم نے کسی ایک عام پسند جدت پر فخر کیا ہے تو یہ کسی حق کو ختم کر کے کیا ہے۔ یہ کہ رعیت اور زمیندار ایک ہی عدالت میں کھڑے ہوں، ایک رجحان کے مطابق ایسا تھا جس نے ہماری حکومت کو لوگوں کے لئے بے مزہ کر دیا تھا۔ اعلانیہ میں یہ کہا گیا ہے ''یہ سب سے زیادہ جابرانہ ہے۔'' دی فرینڈ آف انڈیا 17 اکتوبر 1858، ص 939 مزید دیکھیے، رضوی، فریڈم اسٹرگل ان یوپی، جلد اول ص 455

2۔اس اعلانیہ میں یہ واضح کیا گیا ہے

3۔انگریزی میں 'مجاہد' کا ترجمہ Fanatic یعنی ''متعصب'' کیا گیا ہے جو گمراہ کن ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی وراثت اور ظفر کا شعری سرمایہ

ہندوستانی تہذیب جن عوامل سے عبارت ہے ان میں محبت، رواداری، نرم مزاجی، حسن خلق اور احترام انسانیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس ملک کو اپنے قبضے میں لینے اور یہاں حصول اقتدار کی خواہش میں آنے والوں میں سے اکثر کو آخر آخر مایوسی ہاتھ لگی اور انھیں عارضی فائدوں پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ غزنوی سے لے کر انگریزوں تک اکثر حملہ آور یہاں اپنی سلطنت قائم کرنے اور اس سونے کی چڑیا کو اپنے بس میں کرنے کے ارادے سے ہی آئے لیکن انہیں تھوڑی سی دولت یا چند دنوں کے جابرانہ اقتدار کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ غزنوی، غوری، نادر شاہ، عبدالقادر روہیلہ کو تاریخ نے لٹیرا کہا تو انگریزوں کو جابر حکمراں۔ ان حملہ آوروں میں سے اس ملک میں انگریزوں کی مدت قیام سب سے زیادہ (190 اور عملاً 90) سال ہے لیکن انھیں بھی اس ملک کے عوام نے بحیثیت مجموعی پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اسباب اس کے بہت سے تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن بالکل سامنے کی وجہ یہاں کے مزاج سے ناواقفیت یا یہاں کی تہذیبی صورت حال کی پروانہ کرنا ہی سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک ایسا خاندان بھی اس ملک پر حکمراں رہا جس کی بنیاد بابر نے رکھی اور اس کی اولاد صدیوں یہاں برسر اقتدار رہی، جسے مغل کہتے ہیں۔ تاریخ کے دامن میں اس بات کے بھی ثبوت کثرت سے موجود ہیں کہ اس خاندان نے ہندوستان کے بڑے حصے پر حکومت کی، یہ حکمراں جس تہذیب کے امین تھے اسے یہاں کی تہذیب سے آمیز کر کے انھوں نے ایک نئی و رزیادہ متمول تہذیب کی بنیاد ڈالی اور اسے پروان چڑھایا، جسے ہند ایرانی تہذیب کے نام سے ہم نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اردو تہذیب کی صورت میں یہ آج بھی ہماری زندگی میں موجود ہے۔ جس طرح مذکورہ بالا حکمرانوں کی ناکامی کے اسباب تاریخ کے دامن میں موجود ہیں، اسی طرح مغل حکمرانوں کے کامیاب دور اقتدار کے اسباب بھی، اور ان اسباب میں سب سے واضح نمایاں اور روشن سبب مغل حکمرانوں کا اس ملک اور یہاں کی تہذیب سے لگاؤ کی سمجھ

میں آتا ہے۔ مغلوں اور دوسرے حملہ آوروں (بشمول انگریز) میں فرق بھی یہی ہے کہ اوّل الذکر نے یہاں کی تہذیب کے ساتھ دلچسپی، تعلق اور ہمدردی کا معاملہ کیا جب کہ آخر الذکر نے اپنی تہذیب، اپنے تصورات، اپنے فیشن اور اپنے مذہب کو یہاں تھوپنے کی کوشش کی۔

ہندوستان کو جو بات سب سے زیادہ راس آتی ہے اسے ہم رنگارنگی یا کثرت میں وحدت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ صاحبانِ نظر واقف ہیں کہ ان دونوں خصوصیات کا تہذیب کی تشکیل میں کیا کردار ہے۔ لہٰذا اگر اسے پروان چڑھایا جائے تو یہاں کے لوگوں کا دل بھی جیتا جا سکتا ہے اور یہاں امن بھی قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا رویہ اپنایا جائے تو ناپسندیدگی مقدر ہوگی۔ مغلوں نے اس راز کو پالیا اور کامیاب رہے جب کہ انگریز اقتدار، طاقت، تہذیب، روشن خیالی وغیرہ کے غرور میں اس راز کو مغلوں کی طرح نہیں سمجھ سکے۔ جس رنگارنگی کا اوپر اشارہ کیا گیا اُس کی مثالیں ہندوستان میں عام ہیں۔ زبان، طریقۂ نشست و برخاست، طریقۂ عبادت، رسم و رواج، لباس اور رہن سہن گویا ہر جگہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ انداز نظر آتا ہے۔ ہم سے تہذیبی رنگارنگی کے علاوہ اور کیا نام دے سکتے ہیں۔ مغل حکمرانوں میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور شہزادہ داراشکوہ اس تہذیب کے سب سے بڑے پارکھوں کی حیثیت سے تاریخ میں جس مقام کے حامل ہیں اُسے کون فراموش کرسکتا ہے۔

تہذیب کے دامن کو مغلوں کے ذریعہ گوہرِ تمول سے مالا مال کرنے کا یہ سلسلہ آخر آخر تک اس خاندان میں قائم رہا۔ شاہجہاں کے ذریعہ تعمیر کیے گئے قلعۂ معلی میں جو زبان پروان چڑھی اس کے اس سلسلے میں ادا کیے گئے کردار کا ذکر آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس قلعۂ معلی کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ اس سلسلے کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر ہماری تہذیب و تاریخ میں بادشاہ ہند، پہلی جنگِ آزادی کے قائد اور ادیب و شاعر کی حیثیت سے اہم مقام رکھتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے چار دواوین کے علاوہ لغت و تصوف سے متعلق کتابیں بھی یادگار چھوڑیں۔ ظفر نے جب آنکھ کھولی تو مغل حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا جاہ و جلال قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ قلعۂ معلی عظمتِ رفتہ کے خاموش گواہ کی حیثیت سے موجود تو تھا لیکن مرکزِ اقتدار کی صورت میں کم، مرکزِ تہذیب کی صورت میں زیادہ۔ انگریز قلعۂ معلی میں داخل ہوا چاہتا تھا اور یہاں کی سرگرمیاں اُس کے اشارۂ چشم و ابرو پر منحصر

تھیں۔ بادشاہ اور ولی عہد اس کی مرضی کے مطابق مقرر ہوتے تھے۔ مغلوں کو عوام کی جو محبت ملی تھی اُس میں وفاداری اور عقیدت کے غلبہ کے پیش نظر سلسلۂ بادشاہت چل تو رہا تھا لیکن اس طرح جیسے بیمار کی آخری سانسیں چلتی ہیں۔ اس پس منظر میں اپنے پیش رووں کی طرح کی تربیت اور تعلیم حاصل کرنا ظفر کیلئے نہ مناسب تھا نہ ممکن۔ لہٰذا ظفر نے شہ سواری، شمشیرزنی، معاملاتِ حکومت وغیرہ سیکھنے سے زیادہ ادب، لغت، تصوف، شاعری اور خوش نویسی کی تربیت حاصل کی۔

ظفر کے پیش رو شاہ عالم کی سلطنت ''از دہلی تا پالم'' تھی تو ظفر کے بہادر شاہ کی حیثیت سے بادشاہ دہلی بننے کے بعد ان کی حکومت قلعۂ معلیٰ اور آس پاس تک محدود ہو کر رہ گئی۔ سیاسی و معاشی حالات، اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خوف اور مختلف چپقلشوں نے بہادر شاہ ظفر کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان حالات نے بادشاہ کے جسم ہی نہیں ہمت اور حوصلے کو بھی کمزور کر دیا۔ ایسے حالات میں 1857ء آگیا جو اصلاً صدیوں کی محنت سے تیار کی گئی تہذیب پر ایک بالکل الگ تہذیب کی یلغار اور ہندوستانی ثقافت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ اس ملک کی مٹی اور یہاں کی تہذیب کے عاشقوں نے اسے بچانے کی آخری کوشش کی۔ اس کوشش کو ہماری تاریخ نے پہلی جنگِ آزادی کا نام دیا۔ جس کی قیادت کا بوجھ بہادر شاہ ظفر کے ناتواں کاندھوں پر آیا لیکن ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔ سو ساری کوشش بیکار ثابت ہوئیں اور ہزار ہا اہلِ وطن (بشمول بادشاہ واس کے اہلِ خاندان) کی جانوں کے زیاں کے ساتھ انگریز قلعۂ معلیٰ پر قابض ہو کر برسرِ اقتدار آگیا۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی کے ساتھ مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر بحیثیت بادشاہ ناکام قرار پائے۔ لیکن بحیثیت معمارِ تہذیب ان کا پایہ کافی بلند ہے کہ دب بھی تہذیب کی ایک شاخ ہے۔ اس شاخ کے سب سے خوشنما اور رنگ برنگے پھولوں کو مختلف اصنافِ شاعری کی شکل میں بہادر شاہ ظفر کے دواوین میں دیکھا جاتا رہا ہے اور دیکھا جاتا رہے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ظفر کی شخصیت اور مزاج سازی میں جن عواملِ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ان میں برسرِ اقتدار اور حکمراں طبقہ کے مراسم سے زیادہ ادب ورتہذیب کے مراسم کی کارفرمائی ہے۔ ہمیں ظفر کی شخصیت کے اظہار کا سب سے موثر ذریعہ ان کی شاعری نظر آتی ہے جو ۱۹رویں صدی کے دبستانِ دہلی کی تمام خصوصیات اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ ۱۹رویں صدی بلکہ بیسویں صدی کے نصف اوّل تک ہماری شاعری کی تہذیب میں استادی

شاگردی کے ادارے کو اس حد تک اہمیت حاصل تھی کہ بے استاد ہونا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ اور شاہزادے بھی اگر اس میدان میں قدم رکھتے تو انہیں بھی کسی شاعر کو استاد تسلیم کرنا پڑتا اور اس سے باقاعدہ اصلاح لینی پڑتی دوسری طرف جو شاعر اس منصب پر فائز ہوتا ظاہر ہے کہ باکمال تو ہوتا ہی، معاشرہ میں بحیثیت استاد شاعر اس کا وقار اور اعتبار اور بڑھ جاتا۔ بہادر شاہ ظفر کے تعلق سے یہ اعزاز ہمارے تین اہم شعراء کو نصیب ہوا۔ جن میں شاہ نصیر، ذوق اور غالب شامل ہیں۔ شاہ نصیر اردو شاعری کی تاریخ میں اپنے نہایت منفرد انداز خصوصاً اپنی ردیفوں اور عام رویۂ شاعری سے الگ مضامین کے لئے مشہور ہیں، جسے ہمارے ناقدین نے اپنے اپنے طور پر تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے شاہ نصیر کے اس رویے کو استادی اور پہلوانی سے تعبیر کیا تو شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے مثبت قدر قرار دیتے ہوئے شاہ نصیر کو خیال بند شعراء کی صف میں جگہ دی ہے۔ نصیر اور ذوق کے دبستان کی تربیت کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر کے کلام میں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی سپاٹ نظم نگاری، شعر بازی، تضیع اوقات اور بے معنی وقت گزاری یعنی شاہ نصیر جیسی ردیفیں اور مضامین بھی ملتے ہیں اور ذوق کا انداز بھی۔ کلام ظفر پر سرسری نظر ڈالنے یا بے توجہی سے اس کا مطالعہ کرنے پر قاری مذکورہ بالا حوالوں کے باوصف غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے اور ہوا بھی ہے۔ اپنے زمانے کے نہایت ذہین قاری اور ہمارے صف اول کے ادب فہم نقاد اور ادبی مؤرخ محمد حسین آزاد کے ساتھ اس تعلق سے جب یہ معاملہ پیش آیا تو پھر کسی دوسرے کا پوچھنا ہی کیا۔ محمد حسین آزاد کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ ذوق کے شاگرد تھے اور انھیں اپنے عہد بلکہ ہر عہد کا سب سے بڑا [illegible] مستحق تھے۔ انھوں نے ظفر کے شعری سرمائے اور اس حوالے سے ان کے امتیازات کو اپنے استاد کے کھاتے میں ڈال دیا۔ بعد کے ناقدوں نے آزاد کے ظفر کے ساتھ کئے گئے اس نا[illegible] سلوک پر بجا طور پر تنقید بھی کی، جن میں حافظ محمود شیرانی سے لے کر خلیل الرحمٰن اعظمی تک متعدد قابل ذکر اسماء شامل ہیں۔

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے یہاں ایسی شاعری بھی کافی ملتی ہے جو انھیں اپنے عہد ہی نہیں ہر عہد کے قابل ذکر اور اہم شعراء کی صف میں نمایاں مقام پر فائز کر سکتی ہے لیکن ظفر کی تقدیر کو کیا کیجئے جس نے انھیں بحیثیت بادشاہ ناکام، بحیثیت قائد تحریک آزادی کمزور اور بحیثیت شاعر، مدار [illegible] بیمار [illegible]، کمر میں سلاخ، ہر تن میں سلاخ، بغل میں [illegible]، کھرل میں [illegible] ستم کے دانت،

ضیغم کے دانت، بادام میں شاخ، انجام میں شاخ، ارض وسما کے طبق، قل اعوذ برب الفلق جیسی ردیفوں کو برتنے والا، ذہنی قلابازی کا خوگر اور قافیہ پیما کی حیثیت سے زیادہ مشہور کیا۔

ہم اپنے مذکورہ بالا دعوے کی دلیل کے بطور آپ کی خدمت میں بہادر شاہ ظفر کی اس شاعری سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے ظفر اقلیمِ سخن کے حکمراں اور تہذیبی ورثے کے امین کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

دل و جاں سوزشِ غم سے پھنکے جاتے ہیں کیا کیجیے
لگی ہے آگ وہ اس خار و خس میں کچھ نہیں چلتی

سوزشِ دل کو بھی کیا خاک بجھاتے میری
مجھ کو رسوائے جہاں دیدۂ تر کرتے ہیں

عین گریے میں مرے سینہ و دل ہیں سوزاں
دیکھو اس شدتِ باراں میں یہ گھر جلتے ہیں

وفور گریہ نے میرے بچا لیا ورنہ
جلا چکی تھی مری آہِ اشکبار مجھے

لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں
کیا تماشہ ہے کہ یاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

شب اس کی بزم میں کیوں شمع ہوگئی خاموش
مگر مری خبرِ سوختن گئی ہوگی

ان تمام اشعار میں سوزشِ دل اور گریہ کو بنیادی اور کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ شاعری محض اس عہد کے فیشن کے مطابق ہے؟ کیا اس شاعری میں محض ایک ناکام عاشق کی

داستان بیان کی گئی ہے یا کیا محض لفظی کرتب بازی دکھائی گئی ہے اور اس مضمون کو طرح طرح سے شاعری میں باندھا گیا ہے؟ ہمارے خیال میں ان سوالات کا جواب دینے کیلئے ہمیں شاعر یا متکلم کی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ پہلے سوال کا جواب کوئی بھی غور کرنے والا اور شاعر کی زندگی اور عہد سے واقفیت رکھنے والا اثبات میں نہیں دے سکتا۔ دوسرے سوال کے جواب کی تلاش میں جب جواب دینے والے کو شاعر کی حیثیت کے بارے میں معلوم ہوگا تو وہ اُسے ناکام عاشق قرار دینے میں تکلف کرے گا۔ پھر لفظِ عاشق پر غور کرے گا اگر عشق و عاشق سوال میں استعارے کے بطور برتے گئے ہیں تو ان کے استعاراتی معنوں پر غور کرے گا اور شاعر کو ناکام عشق کے اس محاذ پر بتائے گا جسے زندگی کہتے ہیں اور زندگی بھی بادشاہ کی، جیسے ہی بادشاہ کی زندگی زیرِ بحث آئے گی اس کے عہد کو درپیش مسائل زیرِ بحث آئیں گے اور اس طرح ان اشعار کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ تجزیے کے آخری مرحلے پر تجزیہ کرنے والا اس نتیجے پر پہنچے گا کہ مذکورہ بالا اشعار میں اپنے عہد کے سوز و ساز اور درد و داغ کو شاعر نے کمال فنکاری کے ساتھ اپنی شاعری میں آئینہ کر دیا ہے۔ اگر تجزیہ نگار اس نتیجے پر پہنچتا ہے تو پھر شاعر عام یا نظر انداز کیے جانے کے لائق قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ظفر کے کلام میں حزن و ملال، رنج و غم، عبرت، دنیا بیزاری وغیرہ اور مضامین تصوف کے ساتھ ساتھ کیف و نشاط اور شگفتگی و معصومیت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ ان تمام مضامین کو صنفِ غزل میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہم نے حزن و ملال کی کیفیت والے اشعار مثال کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ نشاط و شگفتگی کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔

رات کس گل کو گلے ہم نے لگایا تھا ظفر
پیرہن جو عطر کی خوشبو میں ہے ڈوبا ہوا

جس رات ٹھہری آنے کی اُس برق وش کی یاں
گھر کا مرے چراغ سرِ شام ہنس پڑا

شبستاں میں سرِ شام ہوئی مشک افشاں
لے کے خوشبو ترے گیسوئے معنبر کی ہوا

رُخ پہ کیا زلف ترے غنچہ دہن چھوٹے ہے
ہم سیہ بختوں سے آخر کو وطن چھوٹے ہے

کہوں میں کیا ترے احسان تیغ اے قاتل
کہ زخم زخم کے منھ سے دعا نکلتی ہے

نہ کیوں کہ شوق کی گرمی سے دل کا داغ جلے
وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے

تمہارے نقشِ کفِ پا کے بوسے لینے کو
زمیں پہ سایہ کی مانند آفتاب آیا

ہمسری کی تری رفتار سے جب فتنے نے
قہقہہ طنز سے اک کبک دری نے مارا

مثال کے لئے منتخب کئے گئے ان اشعار میں مضمون و معنی آفرینی بھی اعلیٰ درجے کی ہے

تمہارے نقشِ کفِ پا کے بوسے لینے کو
زمیں پہ سایہ کی مانند آفتب آیا

ہمسری کی تری رفتار سے جب فتنے نے
قہقہہ طنز سے اک کبک دری نے مارا

صنائع لفظی و معنوی اور رعایت و مناسبت کا بھی خاطر خواہ التزام ہے ۔

رات کس گل کو گلے ہم نے لگایا تھا ظفر
پیرہن جو عطر کی خوشبو میں ہے ڈوبا ہوا

کہوں میں کیا ترے احسان تیغ اے قاتل
کہ زخم زخم کے منھ سے دعا نکلتی ہے

سنبلستاں میں سر شام ہوئی مشک افشاں
لے کے خوشبو ترے گیسوئے معنبر کی ہوا

اور مثال کے تمام اشعار میں زبان کا ایک خاص درجے پر استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قلعۂ معلّیٰ کی وہ زبان ہے جس پر ظفر کو حاکمانہ قدرت حاصل ہے اور وہ بادشاہِ ہند جیسے بھی ہوں اس زبان کے بادشاہ کی ان کی حیثیت مسلم ہے۔ اس زبان کو اردوئے معلّیٰ کہتے ہیں اور اکثر معاصر و مابعد کے شعراء (بشمول ذوق) نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اسی زبان کے فیض سے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں زمرہ اساتذہ میں شامل اور قابلِ ذکر ہیں۔

ظفر کی شاعری میں زنجیر، صیاد اور قفس کی علامتوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان علامتوں کی ماہیت اور کلامِ ظفر میں ان کے استعمال کے اسباب پر غور کیا جائے تو نتیجے میں جو مطالعہ سامنے آتا ہے اس میں ہمارا تہذیبی ورثہ یعنی غزل کے روایتی لفظیات و مضامین ہی نہیں عہدِ ظفر میں ہندوستان اور بادشاہ ہندوستان کو درپیش صورتِ حال اور اس کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ بادشاہِ ہند بحیثیت شاعر اپنے عہد کے مسائل پر ردِ عمل کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور وہ ان شعری طریقہ ہائے کار کا استعمال بھی کرتا ہے جو بیان شدہ واقعات کو شاعری بنا دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نہ تنگ یوں ہمیں صیاد کیوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

یہ کہہ دو شمع سے گل گیر چھوڑنے کا نہیں
ارادہ اس نے ترے تاجِ زر کا باندھ لیا

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشیاں کا خوف

کوئی بلا ہے خانہ زنداں آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

ان تمام اشعار کے پردے میں جو سخن ساز ہے وہ کس ذہنی کیفیت سے گذر رہا ہے کس طرح کے حالات اُسے درپیش ہیں اور گردوپیش کا ماحول اس کے لئے کس درجہ ناموافق ہے اس بات کو سرسری مطالعہ سے ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے اشعار کو جن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے یعنی استعارہ، تشبیہ اور دیگر صنائع لفظی ومعنوی، ان کا بھی مذکورہ بالا اشعار میں خاصہ التزام ہے۔ خاص طور پر مثال کا دوسرا شعر جس میں شمع گل گیر اور تاج زر میں باہم مناسبت اور رعایتوں نے اسے اعلیٰ درجے کا ادبی بیان بھی بنادیا ہے۔ عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے اعلیٰ درجے کے شعری پیرائے میں غزل کی زبان میں خود پر گزرنے والی کیفیات کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے کہ ہم ان کے شب وروز کو ان اشعار میں آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کہیں کہیں انھوں نے بالکل راست انداز میں اور ابھرے پن کے ساتھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو ان کی کیفیت اور اس صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہیں جس سے وہ دوچار ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھنا دو دو پہر اب تخت پر جاتا رہا

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

پہلے شعر میں ہما کا استعارہ اور دوسرے شعر میں ٹیپو سلطان کی تلمیح کے ذریعہ ظفر نے اپنی حالتِ زار بیان کی ہے۔

مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے آخری تاجدار کا نام اگر ایک ناکام بادشاہ کی حیثیت سے تاریخ میں درج ہے تو ایک کامیاب شاعر، تہذیب کے قابلِ ذکر معمار اور رہنما کی حیثیت سے بھی بہادر شاہ ظفر کو ہماری ادبی و تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہے گا۔ بقول علاء الدین خالد:

> ''بہادر شاہ ظفر کی سلطنت قلعۂ معلیٰ تک محدود رہی لیکن اس کی شاعری زمان و مکان کی حدوں کو پار کر گئی۔ سلطنت اسے لے ڈوبی شاعری نے اس کی آبرو رکھ لی۔''

(بہادر شاہ ظفر، فن اور شخصیت۔ صفحہ۔ 5)

انقلاب لکھنؤ کی ایک گمنام مثنوی

اردو ادب میں 1857ء کے انقلاب لکھنؤ کے متعلق مقابلتاً کم لٹریچر پایا جاتا ہے اس وقت تک میری نگاہیں جو کچھ تلاش کر سکیں وہ صرف دو اردو مثنویاں ایک مطبوعہ، دوسری غیر مطبوعہ چھپی ہوئی مثنوی تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی "حزن اختر" ہے اور غیر مطبوعہ مثنوی "رشک ماہ تمام" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس محفوظ ہے جو اصلی مسودہ تو نہیں ہے پھر بھی جس قلم سے یہ مثنوی لکھی گئی ہے اسی قلم نے اس مثنوی میں کئی جگہ اصلاحیں بھی کی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی خود صاحب مثنوی نے اپنے قلم سے لکھی ہے اور مسودہ صاف کرنے کے بعد خود ہی جگہ جگہ ترمیم واصلاحیں بھی کی ہیں مثنوی کے شروع یا آخر میں نہ تو کاتب مثنوی کا نام ہے نہ سن تحریر۔ جہاں تک میری رسائی ہو سکتی ہے اس قلمی مثنوی کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے کہیں نظر نہ آیا اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ انقلاب لکھنؤ کے متعلق یہ گمنام اوراق ایک ایسا ادبی خزانہ ہیں جو ہمارے قومی لٹریچر میں ایک قابل ذکر اضافہ کہے جا سکتے ہیں۔

162 صفحہ کی یہ قلمی مثنوی جس میں تقریباً چودہ سو اشعار ہیں کچھ ایسے مبہم اوراق ہیں جن سے یہ پتہ لگانا بھی دشوار ہے کہ صاحب مثنوی محمد رضا خاں عاشق کون تھے اور ان کا وطن کہاں تھا۔ اگر مثنوی کے آخر میں کسی نامعلوم شاعر ربط کا قطعہ تاریخ شامل نہ ہوتا تو شاید یہ بھی پتہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ اس مثنوی کا نام "رشک ماہ تمام" ہے۔ اور مثنوی کے شاعر نواب محمد رضا خاں عاشق کسی ضبط کے بیٹے تھے۔ جنھیں جرأت اور ناسخ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ربط نے اپنے استاد زادہ کی مثنوی کے لئے مثنوی کی بحر میں جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس میں صنعت توشیح میں چار پانچ شعر بھی کہے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استاد کا نام نواب نوازش علی خاں تھا اور پھر اپنے استاد زادے (صاحب مثنوی) کا ذکر کیا ہے۔

تخلص مگر شعر میں "ضبط" تھا
خدا اپنی رحمت میں دے ان کو جا

تھا فیضان "جرأت" سے ان کو قدیم
ہوئے بعد ان کے تھے ناتخ قدیم
محمد رضا خاں ہیں ان کے خلف
وہ ہیں درج عظمت کے در شرف
تخلص ہے عاشق بس، اے نیک نام
رہا ان کو علم معانی سے کام
محمد رضا خاں علی مقام
لکھی مثنوی "رشک ماہ تمام"

اسی قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی انقلاب 1857ء کے بعد ہی 1275ھ میں شروع کی گئی اور 1276ھ میں مکمل ہو گئی۔

پچھتر میں ہے ابتدائے کلام
چھہتر میں ہے انتہائے کلام

ربط نے "درخت الم" سے ابتدائے مثنوی کی تاریخ 1275ھ نکالی ہے اور تکمیل مثنوی کا مادۂ تاریخ "بگو مخزن امتحان جہاں" نکالا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ مادہ تاریخ اگرچہ کوئی معیاری نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں "بگو" کے اعداد بھی شامل کردئے گئے ہیں پھر بھی اچھا ہو یا برا یہی ایک قطعہ تاریخ ایسا ہے جس نے ہمیں مثنوی اور شاعر مثنوی سے روشناس کرایا ہے۔ نواب نوازش علی خاں ضبط (شاگرد جرأت و ناتخ) اور نواب محمد رضا خاں عاشق کا شمار اپنے دور کے کن اہل کمال افراد میں تھا میری نگاہ کو سنے یا پرانے تذکرے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے اور نہ کسی تذکرہ میں کہیں بھی ان کے متعلق اب تک کچھ دستیاب ہوا۔ مگر مثنوی رشک ماہ تمام کے دیکھنے سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ نواب محمد رضا خاں عاشق عہد واجدی میں لکھنؤ کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے، اور ایک اچھے خاصے مشاق اور پرگو شاعر بھی!

یہ مثنوی جو نستعلیق خط میں لکھی ہوئی حسب ذیل ابواب پر تقسیم کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ "انداز بیان" کا رخ بدلنے کے لئے کئی مقامات پر ساقی نامے کے پیوند لگائے گئے ہیں جو کہیں کہیں پر کچھ زائد سے معلوم ہوتے ہیں۔

(1) حمد و نعت (2) در مدح جناب امیر علیہ السلام (3) بیان وجہ تصنیف مثنوی (4) بیان

روداد 1271ھ (انقلاب لکھنؤ) (5) ملال نمودن شاعر بر اختلال (6) ساقی نامہ در روانگی لندن (7) ساقی نامہ در قید جان عالم (8) در بیان داخلہ سلطان عالم در محل (بعد رہائی قلعہ فورٹ ویلیم) (9) ساقی نامہ در تعریف سراپا جان عالم (10) ساقی نامہ در صفت آلات حرب (11) ساقی نامہ در سرعت اسپ (12) ساقی نامہ در توصیف باغ (13) ساقی نامہ در وصف مکان (14) قطع تاریخ ربط جہاں تک مثنوی کے پلاٹ کا تعلق ہے اس مثنوی میں بھی کم وبیش "انقلاب لکھنؤ" کے وہی واقعات نظم کیے گئے ہیں جنھیں خود "جان عالم" نے مثنوی "حزن اختر" میں لکھا ہے لیکن اسے خوش فہمی کہیے یا نیک نفسی کہیے "جان عالم" نے اودھ کی رائے عامہ کے خلاف نواب علی نقی خاں مدار المہام کے کردار کو سنبھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ لکھنؤ کا بچہ بچہ آج تک نواب علی نقی خاں کو اودھ کا "صادق" اور "جعفر" سمجھتا ہے اور یہ بات قریب قریب یقین کے درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ اودھ میں انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری نواب علی نقی خاں کے سر عائد ہوتی ہے چنانچہ "حزن اختر" میں "جان عالم" ایک سیدھے سادے "گریز" کے ساتھ نواب علی نقی خاں کے خلاف الزامات کو اپنے سر اوڑھ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

"رشک ماہ تمام" کے مصنف نے لکھنؤ کی رائے عامہ کی ترجمانی کرتے ہوئے نواب علی نقی خاں کو ہی اس سازش کا ذمہ دار قرار دیا ہے چونکہ اس زمانے میں لکھنؤ کے خواص سے لے کر عوام تک نواب علی نقی خاں کا نام لینا فال بد سمجھتے تھے اس لئے "رشک ماہ تمام" میں ان کا ذکر "عقل کل" کہہ کر کیا گیا ہے۔ غالباً اس دور میں نواب علی نقی خاں کو عام طور پر "عقل کل" ہی کہا جاتا تھا۔

دیا کچھ نہ سلطان نے اس کا جواب
وہیں "عقل کل" کو بلایا شتاب
نہ ایسا سمجھتا تھا میں تم کو آہ
کہا کیا تھا تم نے ہوا اب یہ کیا
تمہاری نہیں اس میں صاحب خطا
یونہی چاہیے مرحبا واہ واہ
دیا "عقل کل" نے یہ سن کر جواب
خطا اس میں کیا میری عالیجناب

مقدر کا میرے فقط پھیر تھا
نہیں اس میں کوئی ہے میرا قصور
یقیں آپ جانیں اے اے حضور
میں ذرہ تھا مجھ کو کیا آفتاب
میں قطرہ تھا مجھکو بنایا سحاب
کروں مختصر عرض گرچہ ہے طول
کرو التجا میری شاہا قبول
کرو اب نہ رد آرزم کا سوال
مناسب نہیں اس میں کچھ قیل و قال
یہی ہے مناسب جو کرتا ہوں غور
نظر آتے ہیں اس میں اچھے ہی طور
اگرچہ ہے ظاہر میں صورت بری
کرو "مہر" اس میں اب بہتری

"حزن اختر" اور "رشک ماہ تمام" میں ایک بڑا فرق تو ہے کہ اس کے علاوہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کثر واقعات ایک ایسی حقیقت نظر آتے ہیں جنھیں پوری ایک صدی تک انگریزی سامراج ہمارے ذہنوں سے نہ مٹا سکا اور آج بھی ہم س تلخی کا مزہ لے رہے ہیں۔ جو "صادق" نے دکن میں "جعفر" نے بنگال میں اور نواب علی نقی خاں نے اودھ کے جام آزادی میں گھول دی تھی۔

"رشک ماہ تمام" کے تخمیناً چودہ سو اشعار اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ اودھ پر انگریزی تسلط کے بعد تک یہاں کے عوام اپنے "جانعالم" کے لئے تڑپتے رہے اور ایک مدت تک ان کے جذبہ وفاداری نے انھیں اس دھوکے میں رکھا کہ "جان عالم" جلد ہی اودھ کی بساط سلطنت پر واپس آئیں گے۔

انقلاب 1857ء کی بہت سی بے سلسلہ کڑیاں جوڑنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 میں بنگال کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑنے کے بعد انگریز صرف میسور ٹیپو سلطان ہی کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کی نگاہیں دلی اور لکھنؤ پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ خیر کلائیو، میر جعفر اپنے کیفر دارد کو پہونچ چکا تھا۔ میر قاسم کا

کانٹا بھی نکلا جا چکا تھا دہلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا 1764ء میں بکسر کی جنگ اور شجاع الدولہ کی شکست نے انگریزوں پر اودھ کے دروازے کھول دیے معاہدوں کا سنہرا جال جھا کر انگریزوں نے اودھ پر بھی دست درازیاں شروع کر دیں۔ سر جان شور نے آصف الدولہ پر ہاتھ صاف کیا اور آصف الدولہ کے مرتے ہی اودھ انگریزی سازشوں کا سب سے بڑا قلعہ بن گیا۔ یہاں تک کے نوابین اودھ بساط شطرنج کے مہرے بنائے گئے جن کی موت وزندگی اور عروج وزوال انگریزوں کے اشاروں کا ایک معمولی کھیل بن گیا۔ نواب وزیر علی خاں، نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، نواب منا جان اور نواب امجد علی شاہ اودھ کے تخت وتاج پر اس طرح چمکے جیسے اسکرین پر فلم 1847ء میں نواب امجد علی شاہ اللہ کو پیارے ہوئے اور جان عالم نواب واجد علی شاہ مسند آرائے اودھ ہوئے ٹیپو سلطان کی شہادت اور بنگال کی دیوانی کے اختیارات پھر 1803ء کا معاہدہ لیک یہ اسباب ایسے نہ تھے جن سے انگریز فائدہ نہ اٹھاتا۔ لارڈ ڈلہوزی کے تنخواہ دار ایجنٹ اودھ میں سازشوں کے آتش فشاں سلگا چکے تھے آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ کو لال قلعہ دہلی کی چہار دیواری میں عضو معطل بنا دیا گیا تھا۔ اب تک فروری 1856ء میں انگریزی فوجیں لکھنؤ فوجیں لکھنؤ کے اندر داخل ہو گئیں۔ جنرل اوٹرم کمپنی کی طرف سے لکھنؤ کا ریزیڈنٹ تھا۔ وہ لارڈ ڈلہوزی کا الحاق محضر "لیکر جانعالم" کی درگاہ میں پہونچتا ہے نواب علی نقی خاں اور کئی اراکین سلطنت پہلے ہی سے ملک وقوم کا سودا کر چکے تھے "جانعالم" کو اودھ سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور "محضر الحاق" پر دستخط لے کر انھیں کلکتہ جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد نھیں لے کر جھانسی سے آگرہ اور آگرے سے لیکر دلی تک ہندوستان کے جذبۂ حریت میں ایک برقی سی لہر دوڑ گئی لکھنؤ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ جانعالم کو مٹیا برج میں گرفتار کر کے فورٹ ولیم میں قید کر دیا گیا۔ انقلاب لکھنؤ کی پوری کہانی بس اس پس منظر کے گرد گھومتی ہے اور مثنوی "رشک ماہ تمام" میں بھی اسی خونی تصویر کے مختلف رنگ وروپ ہیں۔

"محضر الحاق" پر مہر لگنے کا مرحلہ درپیش ہے نواب علی نقی خاں بار بار بیلی گارد جاتے ہیں۔ جنرل اوٹرم کے ریزیڈنٹ لکھنؤ سے صلاح مشورہ کرتے ہیں اور قیصر باغ آ کر جان عالم کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اودھ سے دستبردار ہونے کے معاہدہ پر دستخط کر دیں شاہی خاندان کے افراد بادشاہ کو روکتے ہیں یہاں تک کہ انگریزی فوجیں قیصر باغ پر حملے کی تیاری کرتی ہیں اور نواب علی خاں وزیر اعظم شاہی فوجوں کو مقابلہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔

کئی روز تک یوں ہی جھگڑا رہا
ہوا وہ مقدر میں جو تھا لکھا
یہ تدبیر کی عقل کل نے وہاں
نہ ہو جس میں اوٹرم کی خاطر گراں
کیے جاری پروانے عمال پر
اٹھانا نہ ہرگز اطاعت سے سر
نہ اپنی جگہ پر سے کوئی ہلے
یہی حکم ہم نے ہیں جاری کیے
ہوا توپ خانوں میں یہ حکم عام
گرادیں چھڑوں پر سے توپیں تمام
دیا حکم فوجوں کو یہ بر ملا
کرو فرق اس میں نہ ہرگز ذرا
نہ اپنی جگہ سے ہلے کوئی اب
کہ ہے کمپنی کا یہ اب ملک سب

نواب علی نقی خاں کے اس اعلان کو سنتے ہی مجاہدین آزادی میں کھلبلی سی مچ گئی۔ فوجوں میں ایک انجانی کیفیت پیدا ہوگئی لیکن موقع پرستوں نے ان کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کیا اور آوٹرم نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ شاہی فوجیں انگریزوں کا مقابلہ نہیں کریں گی اپنے تنخواہ دار ایجنٹوں کے ساتھ قیصر باغ پہنچ کر بادشاہ کی معزولی کا اعلان کیا۔ اس وقت قیصر باغ میں جو کہرام مچا تھا اس کی پُر درد تصویر قابل ملاحظہ تھی۔

کہوں کیا جو اس دن تھا ماتم بپا
بلا شک وہ دن تو محرم کا تھا
کوئی کہتا "ہے ہے" کدھر جائیں گے
کہاں عیش و عشرت یہ سب پائیں گے
کوئی کہتی "گوئیاں" ہوا کیا ستم
ہو مجھکو جینے نہ دے گا یہ غم
کوئی کہتی بھینا ادھر آؤ تو
کدھر ہیں "کندھیا" خبر لاؤ تو
کوئی لے کے ہاتھوں پہ سنبل سے بال

یہ کہتی تھی رو رو کے اے ذوالجلال
برا شاہ ہوئے جو غم سے رہا
میں "چومک" چڑھاؤں گی مسجد میں جا
کسی نے کہا میں کروں رت جگا
موئے "آوٹرم" کا جو ہو وے برا
کوئی چھاتی کو یہ کوٹ کر
کہ جھاڑو پھرے آوٹرم کے بھی گھر
یہ کہتی تھی کوئی کہ شاہ نجف
بچھے گھر میں "آوٹرم" کے ماتم کی صف
کوئی انگلی لب پہ دھرے تھی کھڑی
کوئی غش سے بستر کے اوپر پڑی

محلات ہی نہیں سارے لکھنؤ میں ایک کہرام مچا ہوا ہے منورالدولہ احمد علی خاں بارگاہ اقدس میں آتے ہیں اور کلکتہ چلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

کہی تب یہ احمد علی خاں نے بات
چلوں یاں سے کلکتہ والا صفات
سنا شاہ نے جب یہ ان کا کلام
بہے آنکھوں سے ان نے اشکوں کے جام
کہا جو ہوا چھا کر و اب وہ کام
سفر کا کرو جا کے تم اہتمام
سفر ہے وسیلہ ظفر کا اگر
ابھی ہم بھی کرتے ہیں گھر سے سفر
جوں ہی لکھنؤ میں یہ پھیلی خبر
ہوئے شاہ آمادہ بہر سفر
بڑے چھوٹے کرنے لگے یہ دعا
الٰہی تو بر حاجت شاہ لا

جان عالم کے کلکتہ پہنچنے کے بعد لکھنؤ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مجاہدین آزادی

نے فوجوں پر حملے شروع کر دیے بیلی گارد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ دل ور جنگ اور ممو با نکے نے کمسن شہزادے نواب برجیس قدر بہادر کو تخت نشین کر دیا۔ بغاوت کی خبریں کلکتے پہنچیں "جان عالم" کو مٹیا برج کی نظر بندی سے لے جا کر "فورٹ ولیم" کے آہنی قلعے میں قید کر دیا گیا۔

کیا جا کے قلعے میں سلطاں کو بند
لگے دینے ایذائیں ظالم دو چند
عجب غم سے تھا جان عالم کا حال
کرے رحم ان پر مرا ذوالجلال
لگے بڑھنے سنبل کی صورت سے بال
الجھتا ہوا ان کا دل پُر وبال
وہ کاکل کہ عنبر کی جن پر مہک
اسی میں نہ کنگھی ہو کیوں اے فلک
ہوا زرد رخ مثل برگ خزاں
نہ تھا سبز خط تھے کمودی نشاں
خط سبز ایسا تھا رخ پر بڑھا
لگا صاف مخمل میں تھا مورچا
تپ غم سے ایسا ہوا جسم زار
نظر آتا نظروں میں مانند تار
ہوا حد سے افزوں بدن نا تواں
تجمل زرد چہرے سے تھی زعفراں
نفاست سے سر تھا اٹھانا محال
ہوا بوجھ دل پر تھا بار خیال
وہ آنکھیں جو نرگس سے تھیں خوب تر
رواں ان سے آنسو تھے دو دوپہر
کسی کا مقدر ہوا ایسا نہ بد
نہیں جان عالم کے صدموں کی حد

جب لکھنؤ کے طوفان میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو انگریزوں نے جان عالم کو فورٹ ولیم سے رہا

کر کے پھر مٹیا برج میں رہنے کی اجازت دے دی۔ فورٹ ولیم سے رہائی کے بعد "جان عالم" جب "موچی کھولا" مٹیا برج پہونچے تو شاہی محلات میں از سر نو زندگی کی آخری لہر دوڑ گئی۔ "جان عالم" کی مثنوی حزن اختر" اور مثنوی "رشک ماہ تمام" میں یہی انقلاب کی آخری کڑی ہے۔ لکھنؤ کی انقلابی سرگرمیوں کا نہ "حزن اختر" میں کوئی ذکر ہے نہ اس مثنوی میں۔ یہ دونوں مثنویاں "جان عالم" کے ساتھ ساتھ کلکتہ کا سفر کرتی ہیں اور کلکتہ کے واقعات پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مصنف "رشک ماہ تمام" جان عالم" کے ساتھ کلکتہ میں تھے۔ لکھنؤ کی جنگ آزادی ان کی نگاہوں کے سامنے نہیں گزری ورنہ وہ ان معرکوں کو ضرور نظم کرتے۔ مٹیا برج میں جان عالم کی گرفتاری کا واقعہ کا "رشک ماہ تمام" کے ان چند اشعار میں ذکر کیا گیا ہے۔

سنا ہے یہ اک روز وقتِ سحر
گیا اس فرنگی کمر باندھ کر
جہاں "جان عالم" تھے پہنچا وہاں
یہ پوچھا بتاؤ ہے نائب کہاں
سنا جب یہ نائب نے دوڑے گئے
ہزاروں خیالات دل میں بھرے
گئے پاس جس دم تو اس نے کہا
کہاں "جان عالم" ہیں مجھ کو بتا
نظر آئے طوراں کو جس دم بُرے
نہ آپے میں اُپنے وہ اس دم رہے
گئے ہو کے مجبور سلطان کے پاس
کہا بیٹھے کیا ہو تم اے حق شناس
بلاتا ہے انگریز در پر کھڑا
نظر مجھ کو آتا ہے ساماں بُرا
کہا شہ نے جو مرضیٔ کردگار
کہ ہے مالک الملک کو اختیار

گھوڑے کی تعریف، آلات حرب کا ذکر، جان عالم کا سراپا۔ جانِ عالم کے بھائی اور والدہ کی

لندن روانگی اور فورٹ ولیم کی قید کے حالات شاعرانہ تعبیرات اور انداز بیان کے ہلکے پھلکے فرق کے ساتھ دونوں مثنویات میں قریب قریب ایک ہی انداز میں پائے جاتے ہیں۔ فرق ہے تو اتنا کہ ''حزن اختر'' ایک ایسی ''آپ بیتی'' ہے جو تاجدار اودھ واجد علی شاہ جان عالم نے لکھی ہے در ''رشک ماہ تمام'' نواب محمد رضا خاں عاشق نے۔ نیچرل تاثرات دونوں میں پائے جاتے ہیں مگر فطری طور پر وہ فرق ضرور ہے جو ایک ''آپ بیتی'' اور کہانی میں ہونا چاہئے۔ جس طرح ''حزن اختر'' میں کچھ ابواب اور تفصیلات ایسی ہیں جو اس مثنوی میں نہیں ملتیں اس طرح ''رشک ماہ تمام'' کے بھی کچھ حصے اس سے مختلف ہیں مثلاً جان عالم کی روانگی کے بعد اور جنگ آزادی شروع ہونے سے پہلے لکھنؤ کن مصائب و آلام کا گہوارہ بنا رہا اس کی تفصیلات ''رشک ماہ تمام'' ہی میں ملتی ہیں۔

کہاں ہیں وہ جلسے کہاں ہیں وہ رنگ
مئے عیش و راحت کے جتنے تھے ڈھنگ
کہاں ہیں وہ غنچے کہاں ہیں وہ گل
نہ ساغر ہے باقی نہ بوتل نہ مل
نہ وہ زمزمے ہیں نہ وہ چہچہے
نہ محفل نشیں ہیں نہ وہ قہقہے
کہاں ہیں وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج
نہیں لکھنؤ کا وہ باقی اب اَوج
پڑے توپ خانے ہیں سنسان سب
نہ جانے یہ اب ہوں گے آباد کب
سواروں کی ''لینیں'' ہوئیں سب اُجاڑ
گرا آسماں اُن پہ ٹوٹا پہاڑ
''نجیبوں'' کی جب پلٹنیں ٹوٹیں سب
غریبوں کی حالت ہوئی غیر تب
ہوئی ہر طرف جب ''تلنگوں'' کی فوج
کہاں پھر وہ کپتان صاحب کا اُوج
کیدان گوڑی کے دو دو ہوے

مثل ہے نہ کپڑے بھی ثابت ہوئے
غزاں کا سواروں پہ چھرّہ چلا
ہوئے سب نشانہ وہ بندوق کا

....

الٰہی کہاں ہے وہ تخت رواں
اڑا لے گئے ان کو پریاں کہاں
غضب ہے جہاں فرشِ مخمل بچھے
ستم کی اسی جا پہ جھاڑو پھرے
محلے ہیں سنسان کوچے اُجاڑ
گرا لکھنؤ پر ہے غم کا پہاڑ
"بگل" کی صدا تھی بہت خوشنما
"جلاجل" کی آواز تھی دل رُبا
کہاں ہیں وہ گھوڑے کہاں ہیں وہ فیل
کہاں ہیں؟ جو رہتے تھے ان کے کفیل
کہاں ہیں کبوتر؟ کہاں ہیں وہ باز
کہاں اڑ گئے کر کے آپس میں ساز
کہاں ہیں وہ چیتے، کہاں ہیں وہ شیر
شکم وہ کریں آکے دشمن سے سیر
کہاں ہیں ہرن اور کہاں نیل گاؤ
صدا پھر سنوں میں ادھر لاؤ لاؤ
کہاں ہے وہ فخرِ سلیماں گیا
پتہ دے "ہمایوں" کا یا د صَبا

جان عالم کی جلاوطنی کے بعد لکھنؤ پر مصیبت کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے؟ ہزاروں اور لاکھوں گھر اجڑ گئے۔ شاہی فوجیں اور پنشنیں ٹوٹ جانے سے لاکھوں انسان بیکار ہو گئے۔ غربت و افلاس کی نحوست

منڈلانے لگی۔ ان چند اشعار میں اس کے صحیح خدوخال نظر آتے ہیں۔ اب جان عالم کی "قید جلاوطنی" کے وہ تصورات بھی ملاحظہ فرمایئے جو ایک "معزول بادشاہ" کے لئے موت سے زیادہ سخت گھڑیاں ہوتی ہیں۔

برابر کھلے تھے نشانِ الم
ترقی پہ ہردم تھا دریائے غم
گیا جبکہ آب رواں پر خیال
لگا بڑھنے دریا کی صورت ملال
"رہس" کا جو ساماں تھا پیش، نظر
بیاں کیا کروں۔ الاماں ۔ الحذر
تصور جو محلوں کا دل پر بندھا
تو دروازہ بابِ الم کا کھلا
مزا صحبتوں کا جو یاد آگیا
چبا ہونٹ ہاتھوں کا پیہم ملا

اختصار کے لحاظ سے میں نے نمونتاً منتخب اشعار ہی پیش کئے ہیں۔ اور بعض مقامات پر اس انتخاب کا "تسلسل" اس لئے ٹوٹ گیا ہے کہ یا تو معمولی ردوبدل کے ساتھ مفہوم کی تکرار آگئی ہے یا پھر ابتذال عریانیت کی حد تک پہونچ گیا ہے لیکن جہاں تک مثنوی "رشک ماہ تمام" کی تاریخی اہمیت کا سوال ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انقلاب لکھنؤ کے متعلق جو ادبی اور لٹریری چیزیں سامنے آئی ہیں۔ یہ مثنوی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ضرور ہے۔

قدیم دہلی کالج اور ۱۸۵۷ کا غدر

شمالی ہندوستان کے اوّلین تعلیمی ادارے قدیم دتی کالج کی مفصل روداد بیان کرنے کا سہرا بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سر جاتا ہے۔ جنہوں نے "مرحوم دہلی کالج" کے عنوان سے نہ صرف یہ کہ کالج کی تاریخ رقم کرنے کی سعی کی بلکہ اس کی علمی، ادبی، تہذیبی اور سماجی خدمات پر بھی سیر حاصل تبصرے کئے۔ 1790ء میں مدرسہ غازی الدین کے نام سے دہلی میں ایک روایتی مدرسے کا آغاز ہوا مگر انگریزی حکومت کی سرپرستی میں 1825ء میں دلی کالج کے نام سے ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی جس نے مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس سے تقریباً 25 سال قبل 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہو چکا تھا۔ جس کا مقصد انگریز سرکاری نوکروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا تاکہ وہ یہاں کی زبان و تہذیب سے واقفیت حاصل کر سکیں اور کمپنی بہادر کی ہندوستان پر گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کر سکیں۔ اردو نثر کے ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ محض پچیس سال کے عرصے میں ہندوستان کی انگریز حکومت کے نقطۂ نظر میں نہایت واضح تبدیلی نظر آتی ہے اور اس تبدیلی کے دوررس اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کے پاؤں مضبوطی سے جم گئے تو انہوں نے یہاں کی مجموعی سماجی و تہذیبی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور ہندوستان کے گرتے ہوئے تعلیمی نظام کی طرف ان کی توجہ ملتفت ہوئی اور اس کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانیوں کو مغربی علوم اور بطور خاص انگریزی زبان کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی سعی کی۔ اور جس کے نتیجے میں 1825ء میں دلی کالج کی بنیاد رکھی گئی۔[۱] کالج میں مشرقی اور مغربی شعبے قائم کیے گئے جنہیں جدید اصطلاح میں انگلش میڈیم اور اردو میڈیم کہا جا سکتا ہے۔ مغربی شعبے میں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھی۔ جبکہ مشرقی شعبے میں اردو کو

ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ طلباء کے لئے وظائف کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اور مشرقی زبان وادب کے ساتھ ساتھ مغربی علوم مثلاً ریاضی، سائنس، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم کے لئے بھی مدرسوں کا تقرر عمل میں آیا۔ ابتداء میں دہلی کی عوام نے اس کالج کو شک کی نگاہ سے دیکھا مگر آہستہ آہستہ اس کی طرف کھنچتے چلے گئے اور چند سالوں میں طلباء کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ جن میں انگریزوں کے علاوہ دلی کے ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں داخلِ کالج ہوئے۔ مشرقی شعبے کے لئے نصاب کی کتابوں کی فراہمی کے لئے ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کالج کے اساتذہ اور ہونہار طلباء نے بڑی تعداد میں نصاب کی کتابوں کا آسان وسلیس اردو میں ترجمہ شروع کیا۔ مولوی عبدالحق اور مالک رام کی کتابوں میں دتی کالج میں ترجمہ وتالیف کی گئی کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ جس کے سرسری مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مضامین وعلوم پر فرزندگانِ کالج نے بڑی تعداد میں کتابیں تالیف کیں۔

چند ہی سالوں میں کالج نے دتی اور اس کے اطراف میں شہرت حاصل کرلی اور طلباء کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہوتا گیا۔ ماسٹر رام چندر، چمن لال، موتی لال دہلوی، بھیروں پرشاد، ماسٹر پیارے لعل، حکم چند، ماسٹر کیدار ناتھ، میر ناصر علی، مدن گوپل، ماسٹر جانکی پرشاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی کریم الدین، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کالج کے اولین نامور طلبا ہیں جنھوں نے زبان وادب کی بے پناہ خدمات کی اور کالج کی شہرت وعزت میں بے پناہ اضافہ کیا۔

کالج کے نامور اساتذہ اور پرنسپل حضرات نے بھی اپنے کارہائے نمایاں سے شہرت ودوام حاصل کی۔ ماسٹر ٹیلر جو کالج کے بانی پرنسپل تھے ڈاکٹر اسپرنگر مسٹر کارگل اور مسٹر بترو نے کالج کی خدمت نہایت خلوص وایمان داری سے کی۔ مشرقی شعبے کے بعض اساتذہ کے نام ہی سے اس شعبے کی اہمیت ووقار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولوی محمد باقر، امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لعل، مولوی احمد علی، پنڈت رام کشن دہلوی، ماسٹر مسیحی وغیرہ کے نام بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ یادگار زمانہ لوگ اپنے قول وعمل سے انیسویں صدی کے ہندوستان اور بطور خاص دلی کی ادبی وتہذیبی زندگی کا تانا بانا بن رہے تھے۔

کالج کے ناموروں کے سلسلے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

"اس کالج نے جو لوگ پیدا کیے وہ معمولی نہیں ہیں۔ ان کے دل میں ماضی کی محبت ان کے ارادوں میں حال کی قوت اور ان کی آنکھوں میں مستقبل کا نور ہے۔ وہ ماضی پر تنقید کرتے ہیں لیکن ان کی تنقید میں ہمدردی ہے، وہ مغرب کی طرف بڑھتے ہیں جس کے پیچھے یورپ کا صنعتی انقلاب تھا لیکن کورانہ نہیں، رفتہ رفتہ بدگمانیاں دور ہو جاتی ہے اور ان کے اچھے کاموں کا نقش باقی رہ جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا مغربی تعلیم کی تائید کرنا اور مولوی نذیر احمد کا یہ فرمانا کہ اگر میں (دہلی) کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط..... تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا صمٌ بکمٌ عمیٌ فھم لایرجعون معمولی بات نہیں ہے"

(خواجہ احمد فاروقی "شذرات" دلی کالج میگزین قدیم دلی کالج نمبر ص 21)

دہلی کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر جوزف ہنری ٹیلر اپنی فہم و فراست اور علمی و ادبی صلاحیت کے باعث کالج ہی میں نہیں بلکہ شہر میں بھی نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اپنے شاگردوں میں بھی وہ ہر دلعزیز تھے۔ ماسٹر رام چندر، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ ان سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ماسٹر ٹیلر ان سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ مگر اہل شہر، ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور شاگردوں سے ان کے قربت پر شک وشبہ کی نظر رکھتے تھے اور ان کا شک 11 جولائی 1852ء کو اس وقت حقیقت میں تبدیل ہو گیا کہ جب ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ بقول صدیق الرحمٰن قدوائی:۔

"ماسٹر رام چندر 11 رجولائی 1852ء کو اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر چمن لال (سب اسسٹنٹ سرجن دہلی) کے ہمراہ سینٹ جیمز چرچ پہنچے اور ہندؤں اور مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے اصطباغ حاصل کیا"

(ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی ص 42)

اس غیر معمولی واقعہ کا اثر دہلی کے عوام پر بہت گہرا پڑا اور وہ کالج، اس کے اساتذہ اور بطور خاص یہاں کے طلبا کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے اور یہ غلط فہمی کہ انگریز کالج کے ذریعے عیسائیت

کی تبلیغ کر رہے ہیں اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں، عام ہوگئی۔ اس پر تازیانے کا کام کالج کے دو ہونہار، باصلاحیت اور قابل طلبا کا مذہب عیسائیت قبول کر لینا تو تھا ہی ساتھ ہی مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد سے ماسٹر رام چندر کی قربت کے پیش نظر یہ غلط فہمی بھی عام ہوگئی کہ یہ حضرات بھی اپنے مذہب سے منحرف ہو کر عیسائیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ صدیق الرحمٰن قدوائی مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

"رام چندر کے مشہور و معزز شاگرد مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد جنہیں ان سے بہت لگاؤ تھا، استاد کے عیسائی ہو جانے کے بعد بھی ان سے جدا نہ ہوئے۔ چنانچہ شہر میں عام طور پر ان لوگوں کو بھی عیسائی سمجھا جانے لگا"

(ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی ص 49)

نیز مشرقی شعبے کے مقابلے مغربی شعبے کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت نے بھی کالج کو اہل شہر کی نظر میں مشکوک کر دیا کہ مغربی شعبہ کا ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی اور جس میں بڑی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بچوں نے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ بادی النظر میں اس صورت حال سے کالج متاثر نہیں ہوا مگر ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے پیش نظر یہ واقعات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور چونکہ مورخین، بغاوت ہند پر گفتگو کرتے ہوئے عیسائیت کی تبلیغ، مشنریز کی سرگرمیوں اور انگریزی زبان و تہذیب کی پذیرائی پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں لہٰذا ملک کے دارالحکومت میں اس طرح کے واقعات کا رونما ہونا آگ میں تیل کا کام کرنے کے مترادف تھا۔ اسباب بغاوت ہند میں سرسید مداخلت مذہبی پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:۔

"مداخلت مذہبی شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی (غدر) میں یہی ہے۔"

(اسباب بغاوت ہند از سرسید احمد خاں ص 43)

اس کے علاوہ کالجوں میں طریقۂ تعلیم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بھی سرسید نے بغاوت

کی ایک خاص وجہ بتایا ہے۔ حالانکہ سرسید نے کسی کالج کا نام نہیں لیا مگر قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ دلی کالج کی بدلتی ہوئی صورتِ حال بھی ان کے پیشِ نظر رہی ہوگی اور عوامی بے چینی کا مشاہدہ بھی انہوں نے کیا ہوگا۔ چنانچہ اس خاص نکتے پر انہوں نے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بڑے بڑے کالجوں میں جو شہروں میں مقرر تھے۔ اوّل اوّل ان سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندستان میں نہایت نامی مولوی تھے زندہ تھے۔ مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا، انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے مگر اس زمانے میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا ...... مگر آخر کو یہ بات نہ رہی قدر عربی کی بہت کم ہوگئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابلِ لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا۔ اردو اور انگریزی کا رواج بہت ہوا۔ جس کے سبب وہی شبہہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے قائم ہو گیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسے کے طالب علم کہ جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا مدرس ہونے لگے۔''
>
> (اسبابِ بغاوتِ ہند از سرسید احمد خاں ص 47-46)

اس اقتباس سے کالجوں کے تئیں عوام کی بے چینی یا غلط فہمی اور شک وشبہ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ نیز سرسید نے اگرچہ کسی کالج کا نام نہیں لیا مگر بباطن تقریباً یہی صورتِ حال دلی کالج کی بھی تھی خاص طور پر انگریزی زبان کی مقبولیت، دینی تعلیم کے بجائے مغربی علوم پھر تو جدادر کالج کے طلبا کی مدرسوں کے عہدوں پر تقرری کا تعلق بڑی حد تک دلی کالج کی طرف ہی اشارہ کر رہا ہے۔ خیال رہے کہ سرسید کا دلی کالج کا طالب علم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لہٰذا سرسید کا یہ تجزیہ عوامی بے چینی کی صحیح عکاسی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ابتداء میں مدرسہ غازی الدین

(مقابل اجمیری گیٹ) میں قائم کردہ یہ کالج 1842ء میں کتب خانہ دارا شکوہ نزد کشمیری گیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ بقول بشیرالدین احمد:

''یہ کالج اسی عمارت (مدرسہ غازی الدین اجمیری گیٹ) میں 1842ء تک رہا۔ بعد میں کشمیری دروازے کے قریب رزیڈنسی کی عمارت میں رہا''

(وقعات دارالحکومت بشیرالدین احمد حصہ دوم ص 57ء)

مولوی عبدالحق نے کالج کی عمارت کی منتقلی کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ پرانی عمارت سے یورپین کوارٹر دور تھے۔ جس کی وجہ سے انگریز اساتذہ اور طلبا کو پریشانی ہوتی تھی اسی لئے 1841ء میں اسے کشمیری گیٹ کے نزدیک ایک تاریخی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ خیال رہے کہ کشمیری گیٹ کے پاس ہی یورپین کوارٹر تھے۔ چنانچہ بابائے اردو لکھتے ہیں کہ:۔

''کالج کتب خانہ دارا شکوہ میں اُٹھ آیا۔ یہ بھی ایک تاریخی عمارت ہے۔ کبھی کسی زمانے میں دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا۔ اس کے بعد (1637) علی مردان خان مغل حاکم پنجاب کا اقامت خانہ رہا۔ 1803ء میں سر ڈیوڈ اختر لونی بارٹ کی رزیڈنسی ہوئی اس کے بعد کالج آیا۔''

(مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق ص 128)

لوتھیان پل سے کشمیری گیٹ کی جانب چلیں تو ڈاک خانے سے آگے نظروں کے سامنے ایک پرانی عمارت کے آثار نظر آتے ہیں۔ چند سال پہلے تک یہاں دتی کالج آف انجینیر نگ قائم تھا۔ جسے اب اندر پرستھ یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہی عمارت کتب خانہ دارا شکوہ تھی اور اسی عمارت میں انقلاب 1857ء تک دہلی کالج موجود تھا۔

10 مئی 1857ء کو میرٹھ میں باغی سپاہیوں نے انگریزوں کا قتلِ عام کیا اور نہایت پھرتی اور ہوشیاری کے ساتھ دارالخلافہ کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے نزدیک دتی کا بوڑھا مغل بادشاہ اس جنگ میں ان کا سالارِ اعظم ہو سکتا تھا اور وہی ہندوستان کا مستقبل تھا۔ 11 مئی کی صبح یہ باغی سپاہی غازی آباد سے ہوتے ہوئے راجگھاٹ دروازے کے نزدیک پہنچے اور کسی صورت سے فصیل شہر میں داخل ہو گئے بعض مؤرخین کے مطابق دروازے کے قفل کو پتھروں سے توڑ ڈالا گیا۔ بقول غلام رسول مہر:

''بس راج گھاٹ دروازے سے داخل ہوتے ہی انگریزوں کا قتل عام

شروع ہوگیا"

(1857ء از غلام رسول مہر ص117)

میرٹھ کے باغیوں کے ساتھ بڑی تعداد میں شہر کے لوگ بھی شامل ہوئے اور دریا گنج سے لیکر کشمیری گیٹ تک انگریزوں کا قتل عام کیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ میرٹھ کے باغیوں نے بہادر شاہ ظفر سے گفتگو کے دوران اس شورش کو دین کی لڑائی کہا چنانچہ انگریزوں کے علاوہ دیسی عیسائی بھی ان کی زد میں آ گئے۔ پنڈت منشی کنہیالال کے مطابق دلی میں پہلا مقتول گرجا گھر کا پادری تھا جبکہ دوسرا ڈاکٹر چمن لال جو کالج کے ہونہار طلبا میں سے ایک تھا اور جس نے ماسٹر ٹیلر کی سرپرستی میں عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ کنہیالال لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر چمن لال ہندوستانی ڈاکٹر کو شفاخانے میں اور انگریزی ڈاکٹر صاحب کو جیل خانے میں قتل کیا۔ تین روز تک لاشیں مقتولین کی بے گور وکفن پڑی رہیں اور بروز چہارم مفسدین نے ان کو اٹھوا کر دریا میں ڈلوادیا۔"

(تاریخ بغاوت ہند مسمّی بہ محاربۂ عظیم پنڈت کنہیالال ص58)

ظہیر دہلوی نے چمن لال کے قتل کی روداد اپنے مخصوص انداز میں یوں تحریر کی ہے:۔

"(سواران باغیہ) لال ڈگی کے سرے پر پہنچے اور ہسپتال میں داخل ہوکر ڈاکٹر صاحب کی مزاج پرسی کی۔ چمن لال ڈاکٹر ذات کے کائستھ تھے۔ تھوڑے عرصے سے وہ اور ماسٹر رام چندر دونوں عیسائی ہو گئے تھے۔ اس وقت شفاخانے میں سواران جا کر نکیرین کی طرح چھاتی پر سوار ہوگئے اور سوال کیا ،کیا دین رکھتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا عیسیٰ مسیح کا۔ فرقۂ باغیہ نے ان کو بھی ایک ضرب طمنچہ میں پادری صاحب کے پاس پہنچادیا۔"

(طراز ظہیری داستان غدر ظہیر دہلوی ص83)

ڈاکٹر چمن لال کے اس اندوہناک انجام کے بعد باغیوں نے دلی کالج کی طرف رُخ کیا اور اسے بڑی بے دردی سے تاخت وتاراج کردیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک دن کالج میں عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی تھی اور جسے انگریز سرکار نے ہندوستانیوں کے لئے قائم کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کالج کی تباہی کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"گیارہویں مئی پیر کا دن تھا۔ کالج کا وقت صبح کا تھا۔ پڑھائی حسب معمول ہو رہی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے چندلالہ ہانپتے کانپتے آئے۔ ان کی سراسیمگی اور وحشت کا عجب عالم تھا۔ دوڑتے دوڑتے آئے اور جماعتوں میں بے تحاشا گھس گئے اور اپنے لڑکوں سے کہا۔ گھر چلو، بھاگو، غدر مچ گیا"

(مرحوم دلی کالج ص 70-69)

غرض افراتفری پھیل گئی اور لڑکے اپنے گھروں کی طرف دوڑ گئے۔ پرنسپل ٹیلر عالم حیرت واستعجاب ہی میں تھے کہ میگزین سے یہ خبر آئی کہ شہر میں شورش برپا ہو گئی ہے اور انگریزوں کی جان کو خطرہ ہے لہٰذا فوراً محفوظ مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس وقت کالج میں کئی انگریز اساتذہ تھے۔[1] نیز ماسٹر رام چندر بھی کالج ہی میں موجود تھے۔ تمام انگریز بھاگ کر میگزین کی عمارت میں جا چھپے کہ وہ کالج کی عمارت کے نزدیک ہی واقع تھی۔ اسی اثنا میں باغیوں نے کالج کی عمارت پر حملہ کر دیا۔ نہایت بے دردی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے کالج کی لائبریری کو نشانہ بنایا۔ انگریزی کتابوں کو ورق ورق بکھیر دیا اور عربی، فارسی اور اردو کی کتابوں کو بوریوں میں باندھ کر شہر میں لے گئے جنھیں بعد میں کباڑیوں کے ہاتھوں کوڑیوں میں فروخت کر دیا گیا۔ لائبریری کی قیمتی کتابوں کا یہ حشر افسوسناک تو ہے ہی ساتھ ہی اس سے باغیوں کی ناعاقبت اندیشی اور وحشت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے تہذیبی وعلمی وادبی سرمائے کو مٹانے سے بھی انہوں نے گریز نہیں کیا۔ کتابوں کی ابتری اور تباہی و بربادی کے تعلق سے پنڈت کنہیالال محاربۂ عظیم میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مدرسہ دلی (دلی کالج) روز اوّل لوٹا گیا تھا اور انگریزی کتابیں اب تک گلی وکوچہ میں پڑی ہیں"

(تاریخ بغاوت ہند کنہیالال ص 83)

مولوی عبدالحق کالج کے کتب خانے کی تباہی کے تعلق سے بیان کرتے ہیں:

"دن کے بارہ بجے کے کچھ دیر بعد کالج کا کتب خانہ لٹنا شروع ہوا۔ لٹیرے بڑے بے ڈھب تھے۔ انگریزی کی تمام کتابوں کی خوب صورت خوبصورت سنہری فرموں کی جلدیں پھاڑ لیں اور ورقوں کا کالج کے تمام باغ میں دو دو انچ موٹا فرش

بچھا دیا۔ عربی فارسی اردو کی جتنی کتابیں تھیں ان کی گٹھریاں باندھ باندھ کر اپنے گھر لے گئے اور پھر کباڑیوں اور مولویوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دیں۔ سائنس ڈپارٹمنٹ میں جتنے آلات تھے۔ انھیں بھی توڑ پھوڑ ڈالا اور لوہا پیتل وغیرہ دھاتیں لے گئے۔

(مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق ص 73-72)

مولوی محمد باقر کی ادارت میں شائع ہونے والے "دہلی اردو اخبار" کے رپورٹر نے 17 مئی 1857ء کے ایڈیشن میں کالج کی بربادی اور تباہی کا آنکھوں دیکھا حال ان دردناک الفاظ میں رقم کیا ہے۔

"جانب مدرسہ جو نظر کی تو دیکھا کہ تمام اسباب و میز و کرسی و تصاویر، صدہا، ہزار ہا روپے کے آلات و ادوات تجربہ اور ہزار ہا روپے کا کتب خانہ انگریزی و فارسی و تشجیات سب لوگ لوٹ لئے جاتے ہیں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ شطرنجی وغیرہ فرش سے لیکر فرشِ زمین یعنی چوکہ ہائے سنگ اور چوکھٹ و دروازے تک نکال لے گئے۔ غرض کہ تمام حالات بدیدہ عبرت دیکھتا ہوا حقیر غریب خانے آیا۔"

(دہلی اردو اخبار بحوالہ ماسٹر رام چندر از قدوائی ص 22)

غرض یہ کہ روزِ اوّل ہی باغیوں نے قدیم دہلی کالج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ 1857ء کی اس شورش میں کالج کا جو نقصانِ عظیم ہوا اس کو اعداد و شمار میں بیان کرنا مشکل ہے۔ کالج کے قیمتی اثاثوں بطورِ خاص کتابوں کی بے حرمتی نے شہر کے علماء اور طبقۂ اشرافیہ پر جو اثر مرتب کیا ہوگا۔ اُسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے اور غالباً باغیوں کی ایسی ہی نازیبا حرکتوں (جس میں بے قصور انگریزوں کا قتلِ عام بھی شامل ہے) کی وجہ سے شہر کا ایک بڑا طبقہ غیر جانبدار رہا۔

کالج کے انگریز اساتذہ نے میگزین کی عمارت میں پناہ لی تھی۔ لہٰذا باغیوں نے میگزین کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس وقت میگزین میں چند انگریز افسر اور سپاہی موجود تھے جنھوں نے ان باغیوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں طرف سے گھمسان کی لڑائی ہوئی مگر ہندوستانی سپاہی سیڑھیاں لگا کر جب میگزین کی دیوار پر چڑھنے لگے تو انگریزوں نے میگزین کے گولہ بارود میں آگ

لگادی۔ جس سے ایک زبردست دھماکہ ہوا اور بقول ظہیر دہلوی:

''زمین کو اس درجہ لرزہ ہوا کہ زلزلہ محسوس ہوتا تھا''

میگزین نے آس پاس کی عمارتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور بڑا جانی و مالی نقصان ہوا۔ میگزین میں پھنسے ہوئے انگریزوں نے نہایت بہادری سے اپنی جان قربان کر دی اور ساتھ ہی بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو بھی شہید کر دیا۔ پرنسپل ٹیلر اپنے ساتھیوں کے ساتھ میگزین اُڑنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل بھاگے۔ اور باغیوں سے بچتے بچاتے دوبارہ کالج کے احاطے میں جا داخل ہوئے اور اپنے خانساماں کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد خانساماں نے انھیں مولوی محمد باقر کے گھر پہنچا دیا۔ جو ان کے خاص دوست اور رفیق کار بھی تھے۔ نیز ماسٹر ٹیلر کو فارسی کی تعلیم بھی مولوی محمد باقر نے ہی دی تھی۔ ماسٹر ٹیلر پورے چار دن مولوی صاحب کے گھر میں چھپے رہے۔ مگر کسی طرح باغیوں کو ان کے چھپنے کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔ اس پورے واقعے کی تفصیل آغا محمد باقر کی زبانی سنیے:

دہلی میں غدر پڑا مولانا آزاد کی عمر کوئی تیس سال تھی۔ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر ان کے والد (مولوی محمد باقر) کے گہرے دوست تھے۔ وہ کالج کے کچھ کاغذات لیکر مولانا کے گھر آ گئے اور چار دن چھپے رہے۔ آخر باغیوں کو پتہ چل گیا کہ ماسٹر ٹیلر مولانا کے یہاں روپوش ہیں۔ دروازے کے سامنے بہت سے شورہ پشت جمع ہو گئے اور شور مچایا کہ ماسٹر ٹیلر کو ہمارے حوالے کر دو سمجھانے بجھانے سے یہ لوگ تو چلے گئے لیکن مسٹر ٹیلر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ دوسرے دن علی الصبح وہ اپنے ضروری کاغذات مولانا باقر کے حوالے کر کے گھر سے نکلے کہ کشمیری دروازے سے باہر نکل جائیں اور انگریزی فوج سے جا ملیں لیکن باغی ان کی تاک میں تھے۔ انہوں نے نکلتے ہی بھانپ لیا۔ وہ بھاگ کر مولانا محمد باقر کی مسجد میں گھسے۔ انہوں نے وہاں سے بھی گھسیٹ نکالا اور پاؤں میں رسی باندھ کر گلیوں میں کھینچتے پھرے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے۔''

(محمد حسین آزاد از آغا محمد باقر نقوش شخصیات نمبر ص 10)

ماسٹر ٹیلر کے اس عبرت ناک انجام کی بہت سی تاویلات کی جا سکتی ہیں۔ باغیوں کی سفاکی اور درندگی کی اس سے وحشت ناک مثال مشکل سے ملے گی مگر جب بغاوت ہوتی ہے تو اُس وقت صحیح و غلط اور اچھے برے کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ ماسٹر ٹیلر نے دلّی کالج نام کے پودے کو اپنے خون

جگر سے سینچا تھا۔ وہ اچھے منتظم ہی نہیں بلکہ ہر دلعزیز اُستاد بھی تھے اور شہر کے اکابرین وعلما میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے مگر عیسائیت کی تبلیغ اور چمن لال اور رام چندر کے عیسائی ہو جانے والے واقعے کے بعد کچھ لوگ انھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اسی لئے باغیوں نے سب سے پہلے ماسٹر ٹیلر اور ان کے شاگردوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا۔

قیاس کہتا ہے کہ ماسٹر رام چندر دلی کالج کی عمارت ہی میں تھے جب انھیں باغیوں کی آمد اور انگریزوں اور عیسائیوں کے قتلِ عام کی اطلاع ملی ہوگی۔ مولوی عبدالحق نے 11 مئی 1857ء کے حالات کے تحت ماسٹر رامچندر سے متعلق واقعات کا سلسلہ یوں قائم کیا ہے:

"رہے پروفیسر رام چندر۔ یہ پیدل چل کر پن چکی کی سڑک پر آتے ہوئے قلعے کے سامنے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چند ترک سوار یا مغلوں کا دستہ ننگی تلواریں لئے ہوئے لال ڈگی کی سڑک پر آ رہا ہے۔ یہ اسے دیکھ کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئے اور چاندنی چوک کے کوٹھے پر صحیح سلامت پہنچ گئے۔ وہاں سے انھیں ان کے بھائی رام شنکر داس اپنے ساتھ لے گئے اور کائستھوں کے محلّے میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جا چھپایا۔ مگر ان کے اقرباء نے اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم پر آفت نہ آئے۔ ان کا وہاں زیادہ قیام گوارا نہ کیا۔ ان کا ایک قدیم نوکر جاٹ تھا۔ اس نے بڑی وفاداری اور رفاقت کی انھیں جاٹ بنا کر گنواروں کے سے کپڑے پہنا، پگڑ بندھوا اپنے گاؤں لے گیا اور وہاں رکھا۔ وہاں سے یہ باؤلی کی سرا میں انگریزی لشکر سے جا ملے۔"

(مرحوم دلی کالج از مولوی عبدالحق ص 72)

ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق نے واقعات کی تفصیل سے گریز کیا ہے کہ ان کا اصل موضوع تو کالج کی تاریخ اور اس کی تعلیمی و ادبی خدمات ہے۔ 1857ء کے غدر کے تعلق سے ان کی اس کتاب میں محض پانچ صفحات ہی مختص کیے گئے ہیں۔ مگر ہمارے پاس خود ماسٹر رام چندر کے اور دیگر محققین کے بیانات موجود ہے جو اس واقعے کی تفصیل ہمارے روبرو لاتے ہیں۔ خود ماسٹر رامچندر نے 1857ء کے ہنگامے میں اپنی زندگی کے واقعات تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"باغیوں نے مجھے بہت تلاش کیا۔ مگر میرے چھوٹے بھائیوں نے جو ابھی

تک ہندو ہیں مجھے میرے آبائی خاندان کے زنان خانے میں چھپادیا جو ایک گلی میں واقع تھا۔ میرے پڑوسیوں اور جان پہچان والوں نے بھی ازراہِ کرم مجھ سے بے وفائی کی۔ تیسرے روز یعنی 13 مئی 1857ء کی شام کو جب اندھیرا چھا گیا تو میں اپنے دو ملازموں کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلا۔ یہ لوگ مجھے دہلی سے کوئی دس میل دور مستوالا گاؤں لے گئے۔ میں اس گاؤں میں تقریباً ایک ماہ تک اس خطرے میں ٹھہرا رہا کہ جس زمیندار نے مجھے ازراہِ عنایت اپنے یہاں رکھا ہے۔ اس کے مخالفین کہیں میرا پتہ نہ بتا آئیں ... ... 10 جون 1857ء کو باغیوں کا ایک دستہ گاؤں سے ہو کر گذرا اور کسی نے انہیں بتادیا کہ یہاں ایک عیسائی ٹھہرا ہوا ہے۔"

A Treatise on the Problems of Maxima and Minima by Ramchandra Page xxii

(بحوالہ ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی ص ۶۰-۶۱)

غرض یہ اُس وفادار زمیندار کے مشورے پر وہاں سے بھی نکل گئے اور جنگل میں دربدری اور کس مپرسی کے حالات سے گزر کر کسی طرح 21 / جون 1857ء کو انگریزی کیمپ میں بہ حفاظت پناہ گزیں ہوئے۔ چمن لال اور ماسٹر ٹیلر کے مقابلے ماسٹر رام چندر خوش قسمت نکلے کہ کسی طرح باغیوں کے چنگل میں نہ آئے اور اہل شہر میں اپنے وفاداروں کی مدد سے ان کی جان محفوظ رہی۔ جبکہ چمن لال اور ماسٹر ٹیلر کا عبرت ناک انجام ہوا۔

یسوع داس رام چندر کو 1857ء میں انگریزوں کی حمایت نیز حکومت کی مدد کرنے کے صلے میں انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ چنانچہ صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:۔

"دو ہزار کا نقد انعام کمشنر دہلی کی طرف سے انہیں 1857ء کی بغاوت میں حکومت کی مدد اور تعاون کے صلے میں عطا کیا گیا۔"

(رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی ص 38)

اس کے علاوہ امن و امان قائم ہو جانے کے بعد سر ولیم میور نے انہیں دلّی کالج کی تباہی سے بچے ہوئے قدیم فارسی مخطوطات کو جمع کرنے اور انہیں انگریزی میں منتقل کرنے کے نہایت اہم کام پر معمور کیا مگر 31 دسمبر 1857ء کو وہ دہلی کالج سے الگ ہو کر رڑکی چلے گئے اور اس طرح یہ اہم کام بھی ادھورا رہ گیا۔

دہلی پر آزاد شاہی حکومت محض چار مہینے اور کچھ دن ہی قائم رہی اور اس کے بعد انگریزی حکومت کے ازسرِ نو قیام کے بعد قتل و غارت گری کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوا جس نے درندگی وسفاکی کے پچھلے سارے رکارڈ توڑ ڈالے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانیوں کو تہ تیغ ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کی ہلاکت کے نئے نئے طریقے بھی ایجاد کیے گئے۔ کمپنی بہادر کا ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی بھی خود ساختہ منصف بن بیٹھا اور ہندوستانیوں کا خون بہانا، انہیں پھانسیوں پر لٹکا دینا اور توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دینا جیسے ان کے لئے ایک کھیل بن گیا اور وہ اس خونی کھیل سے محظوظ بھی ہونے لگے۔ اس ظلم و بربریت کی داستانیں ہماری تاریخ کا خونیں باب ہیں۔

شہر دہلی کہ 1857ء کے انقلاب کا مرکز تھا۔ انگریزوں کا عتاب سب سے زیادہ اسی پر نازل ہوا۔ بوڑھے بادشاہ کو معمولی مقدمے کے بعد جلاوطن کر کے ہزاروں میل دور رنگون بھیج دیا گیا۔ مگر اس سے پہلے شہزادوں کو بے دردی سے قتل کر کے بادشاہ کو ذہنی اذیتوں سے دوچار کیا گیا۔ جب بادشاہ کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا تو عوام کے ساتھ جو ظلم و ستم ہوا ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔ دہلی کالج کے حوالے سے بھی ردِّ عمل کی اس گھناؤنی روایت کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ انگریزوں کا عتاب براہِ راست اور بالواسطہ دونوں ہی طرح سے یہاں کے اساتذہ اور طلبا پر نازل ہوا۔

مولوی محمد باقر اردو کے اولین صحیفوں میں سے تھے اور ابتداء میں دہلی کالج میں مدرّسی بھی کر چکے تھے۔ انہوں نے اردو میں ایک ہفتہ وار اخبار اپنی ادارت میں دہلی سے جاری کیا ابتداء میں اس کا نام "اخبارِ دہلی" تھا بعد میں "دہلی اردو اخبار" ہوگیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ 12 جولائی 1857ء سے اس کا نام جنگِ آزادی کے سالارِ اعظم بہادر شاہ ظفر کے نام کی رعایت سے اخبار الظفر ہو گیا۔ بغاوت کے ناکام ہو جانے کے بعد انگریزوں کا عتاب باغی اخبار نویسوں پر بھی نازل ہوا اور مولوی محمد باقر کے تعلق سے تو ماسٹر ٹیلر کے قتل کا سلسلہ بھی جوڑ دیا گیا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ مولانا محمد باقر ماسٹر ٹیلر کی ہدایت کے مطابق ان کے چند کاغذات لیکر نہایت سادہ دلی کے ساتھ انگریز حاکم کے پاس پہنچے۔ وہ کاغذات دیکھتے ہی غضب ناک ہو گیا اور سوال کیا کہ مسٹر ٹیلر کہاں ہیں۔ انہوں نے تمام احوال بتا دیا کہ کس طرح باغیوں نے ٹیلر کا خاتمہ کر دیا نتیجے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا، انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ان کے گھر کو لوٹ کر ضبط

کرلیا گیا۔ آغا محمد باقر نے محمد حسین آزاد کی سوانح مرتب کرتے ہوئے مولوی باقر کے ہلاکت کی تفصیل کچھ یوں بیان کی ہے کہ:۔

"ایک دن دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے میدان میں عمائدین شہر کو دیکھا جنہیں گولی مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان ہی میں ان (محمد حسین آزاد) کے والد بزرگوار (مولانا محمد باقر) بھی تھے۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ بعد نماز دور سے نظریں چار ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ چلے جاؤ اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دو چار روز بعد معلوم ہوا کہ انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔"

(نقوش شخصیات نمبر محمد حسین آزاد از آغا محمد باقر ص 11)

مولوی محمد باقر اپنی بے باک صحافت اور کھلے بندوں انگریزوں کی مخالفت کے سبب بھی ان کے عتاب کا شکار رہے ہوں گے۔ ماسٹر ٹیلر سے ان کے قلبی لگاؤ اور دوستی سے سب واقف ہیں مگر شورش کے دوران اپنے اخبار میں ماسٹر ٹیلر کی موت پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں (میگزین) بند تھے۔ اس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ قریب دو پہر اسی تھانے کے علاقے میں مارے گئے۔ یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا اور اکثر ناواقف لوگوں کو اٹھوالیا کرتا تھا۔ چنانچہ چمن لال کا خون اسی کی گردن پر رہا قابل عبرت ہے حال دنیائے دوں کا کہ باوجود اس زر کثیر کے کہ دن بھر شہر برہنہ خاک و خون میں پڑا رہا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ فقیری کا لباس اس وقت تھا اور منہ پر حاک ملی ہوئی تھی۔"

(حوالہ دلی میں ان از ضیاء الرحمٰن مضمون اردو صحافت کا مجاہد اول مولانا محمد باقر دہلوی ص 129-130)

یقین ممکن ہے کہ حاکم وقت نے مولانا محمد باقر کی اسی قسم کی بے باک صحافتی روش کے تحت انہیں گردن زدنی قرار دیا گیا ہو۔

مولانا محمد حسین آزاد غدر کے وقت تیس سال کے تھے۔ کالج کے ہونہار طلبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خاص طور پر مضمون نگاری کے مقابلوں میں اکثر اول آتے۔ اور انعامات سے نوازے جاتے تھے۔ کچھ شاگرد ہونے کے سبب اور کچھ والد محترم کی دوستی کی وجہ سے وہ بھی ماسٹر ٹیلر کے

نہایت قریب تھے۔ ماسٹر ٹیلر کے قتل میں انہیں بھی ملوث پایا گیا اور اس کے نتیجے میں خودساختہ جلاوطنی قبول کی اور انگریز حکم کے قہروغضب سے محفوظ رہے۔ ان کی گرفتاری کے حکم نامے کے سلسلے میں آغا محمد باقر رقمطراز ہیں:

"اطلاع ملی کہ ان کے (محمد حسین آزاد) وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں اور گرفتار کرنے والے کے لئے پانسو کا انعام مقرر ہوا ہے۔"

(نقوش شخصیات نمبر محمد حسین آزاد از آغا محمد باقر ص 11)

مولوی عبدالحق نے ذرا تفصیل کے ساتھ محمد حسین آزاد کی ممکنہ گرفتاری اور صحرانوردی کا حال تحریر کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج' میں اس واقع کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی تھی اور ان پر بھی قوی شبہ تھا۔ مگر یہ راتوں رات بھاگ نکلے اور کئی سال تک سرزمین ایران میں بادیہ پیائی کرتے رہے۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔"

(مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق ص 17)

غرض یہ کہ والد کی شہادت کے صدمے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد حسین آزاد طویل دربدری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ دہلی سے نکل کر دوردراز علاقوں کی خاک چھانی۔ ایران گئے وہاں سے پنجاب آئے اور بقول مولوی عبدالحق عام معافی کے بعد ہی انہیں سکون و طمینان کی زندگی نصیب ہوئی۔

امام بخش صہبائی بوقت غدر قدیم دہلی کالج میں فارسی کے مدرّس تھے اور اہل دہلی میں نہایت عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔ فارسی علم وادب کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس دور کے چند بڑے شعراء میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ یہ دور غالبؔ و ذوقؔ و مومنؔ وشیفتہؔ کا دور ہے اور اس دور میں ان اکابرین کے سامنے اپنا چراغ جلائے رکھنا کارے دارد ہے۔ دہلی کالج میں ان کی تقرری کا واقعہ بھی کم دلچسپ نہیں کہ انہیں مرزا غالبؔ اور مومنؔ خاں مومنؔ پر ترجیح دیتے ہوئے فارسی کا اوّلین مدرّس مقرر کیا گیا۔ دوران شورش ان کے کردار پر یوں تو کوئی روشنی کسی محقق نے نہیں ڈالی مگر گمانِ غالب ہے کہ دوراندیشی کے تحت وہ اس معاملے سے دور ہی

رہے ہوں گے۔ مگر وہ بھی ایک نہایت افسوس ناک حادثے کا شکار ہوئے۔

اس حادثے کی تفصیل یوں ہے کہ دہلی کے ایک معروف علاقے کوچہ چیلان میں جہاں مولانا امام بخش صہبائی کا آبائی مکان بھی تھا۔ دوران غدر کوئی خاص شورش برپا نہیں ہوئی۔ بہ اتفاق انگریزی لشکر کا کوئی سپاہی زخمی ہو گیا۔ دراصل وہ کسی زنان خانے میں زبردستی داخل ہونا چاہتا تھا۔ لوگوں نے اسے روکا اور اس کشمکش اور جدوجہد میں وہ معمولی طور پر زخمی ہو گیا۔ دہلی پر قبضے کے بعد انگریزوں نے اس کی پاداش میں کوچہ چیلان کے تمام مردوں کو مار دینے کا حکم صادر کر دیا۔ کئی مرد اپنے ہی گھر میں شہید کر دیے گئے۔ باقی ماندہ مردوں کو جمنا کی ریت میں لے جا کر گولی مار دی گئی۔ انہیں مقتولین میں امام بخش صہبائی بھی شامل تھے۔ کوچہ چیلان میں سکونت پذیر علماء اور ذی علم حضرات کی تفصیل امداد صابری یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "دہلی میں سب سے زیادہ کوچہ چیلان میں رہنے والوں پر مصیبت آئی۔ قلعہ معلیٰ کا قرب بھی اس محلے کو حاصل تھا۔ اس محلے میں بڑے بڑے عالم فاضل اور نامور علما اور اہل فن رہتے تھے۔ بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔ مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کا گھرانہ بھی اسی محلے میں آباد تھا۔ سرسید احمد خاں کا خاندان بھی اسی محلے کے ایک حصے میں رہتا تھا۔ منشی ذکاء اللہ بھی اسی محلے کے باشندے تھے۔ مولانا صہبائی اور ان کا خاندان بھی اسی محلے میں سکونت پذیر تھا۔"
>
> (1857ء کے مجاہد شعرا از امداد صابری ص 268)

غرض اس مردم خیز علاقے پر انگریزوں کا قہر محض اس لئے کہ ان کا ایک سپاہی زخمی ہو گیا تھا قطعی ناجائز تھا اور اس ظالمانہ فعل میں دہلی کے کئی باکمال ہلاک ہوئے۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی کتاب "تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ" میں امام بخش صہبائی کی ہلاکت کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "مسلمانوں کا کوچہ چیلان بالکل قتل ہوا۔ اس پر یہ آفت آئی کہ اس میں کوئی سپاہی انگریزی لشکر کا زخمی ہوا یا مارا گیا۔ سپاہی نے کسی کو گھائل کیا۔ اس کے باب میں مختلف روایات ہیں کوئی کہتا ہے کہ نواب شیر جنگ کے بیٹے محمد علی خان نے کوئی کہتا ہے کہ حکیم فتح اللہ خاں نے ایک سپاہی کو اس لئے زخمی کیا کہ ان کے

زنانے میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا۔ غرض اس قصور میں کہ اس محلے میں ایک سپاہی قتل ہوا، حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچے کے سارے مردوں کو مار ڈالو یا پکڑ کر لے آؤ، بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان کے گھروں میں مار ڈالا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا کہ جس میں کوئی مارا نہ گیا ہو۔ کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے۔ جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعے کے نیچے گولی مار دیئے جائیں۔ سپاہی ان کو ریتی میں لے گئے۔ ان پر سپاہیوں نے صرف گولیوں کی ایک باڑھ ماری۔ ان میں سے دو آدمی مرزا مصطفیٰ بیگ اور وزیر الدین زندہ بچے۔ جو اس قتل کا حال بیان کرتے ہیں کہ ہم سب بسن بستہ جمنا کی ریتی میں گئے۔ گولیوں کی باڑھ ہم پر سپاہیوں نے صرف ایک دفعہ ماری۔ پھر وہ چلے گئے بہت سے تو گولیوں کے لگتے ہی سرد ہو گئے بعض ان میں سے دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب کر مرے۔ ان دو آدمیوں میں سے مصطفیٰ بیگ قلعے کی طرف بھاگے ان کو کوئی گولی نہیں لگی تھی اور وزیر الدین مہابت خان کی ریتی کی طرف دوڑے۔ ان کی ساق میں ضعیف سا گولی کا زخم لگا تھا۔ یہ دونوں بچ کر زندہ سلامت رہے۔ ان مقتولوں میں بے گناہ ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے کنبے کے اکیس فرد تھے۔"

(بحوالہ 1857ء کے مجاہد شعراء از امداد صابری ص 271-270)

خیال رہے کہ مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے اہل خاندان کو عین فجر کی نماز کے وقت کٹرہ مہر پرور کی مسجد سے اُٹھایا گیا تھا کہ جب وہ فجر کی نیت باندھے باجماعت نماز ادا کر رہے تھے۔ لاشوں سے متعلق دو مختلف روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمام لاشوں کو دریائے جمنا میں بہا دیا گیا اور دوسری روایت یہ کہ وہیں دریا کے کنارے گڈھے کھود کر لاشوں کو دفنا دیا گیا۔ انگریز سرکار کی اس بہیمانہ درندگی کی مثال غالبًا تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ امام بخش صہبائی کو بغیر کسی جرم کے ہلاک کیا جانا نہایت افسوس ناک واقعہ تھا۔ چنانچہ مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے جذبات کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غرض یہ وہ چند اہم واقعات ہیں جن کا براہِ راست تعلق قدیم دہلی کالج سے ہے۔ کالج کی عمارت کا باغیوں کے ذریعے تاخت و تاراج کیا جانا، انگریز پرنسپل اور دیگر اسٹاف کا بے دردی سے قتل، چمن لال کی موت، ماسٹر رام چندر کی دربدری، مولوی محمد باقر اور امام بخش صہبائی کی شہادت، یہ تمام واقعات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ 1857ء کے غدر میں کالج کو اپنوں اور پرایوں دونوں سے نقصانات اٹھانے پڑے۔ باغیوں نے اسے ''انگریزی ادارہ'' سمجھا اور پہلی فرصت میں اسے نقصان پہنچایا جبکہ انگریزوں نے کالج کے کئی ناموروں کو تہ تیغ کر کے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا بقول صدیق رحمٰن قدوائی:۔

> ''1857ء میں دہلی کالج کو اتنا زبردست نقصان پہنچا کہ پھر اسکی حالت نہ سنبھل سکی۔ ہندوستانیوں نے یہ سمجھا کہ یہ ادارہ اور اس کے متعلقین بیرونی حکومت کے طرفدار ہیں۔ کالج میں انگریز پرنسپل اور اساتذہ کی موجودگی، انگریزی زبان اور مغربی علوم پر زور، طلبا اور اساتذہ کی طرف سے مغربی سیاسی نظریات اور نظام کی حمایت اور اخبارات و رسائل کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں اس کا پرچار، دو بڑا نے طلبا رام چندر اور چمن لال کا قبول عیسائیت یہ سب باتیں کالج کی تباہی کے لئے کافی تھیں۔''

(رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی ص 22)

اس رُستخیز بے جا کے بعد کالج کے از سر نو قیام کا کسی کو خیال نہ آیا اور یہ عظیم الشان ادارہ سات سال تک بند رہا۔ بالآخر 1864ء میں حکومت وقت کا خیال اس کی طرف ملتفت ہوا اور اسے دوبارہ قائم کیا گیا۔ مگر اس کا محل وقوع تبدیل کر کے اسے موجودہ ٹاؤن ہال کی ایک عمارت میں جگہ دی گئی۔ جہاں یہ شتم پشتم 1877ء تک چلتا رہا۔ 1877ء میں اچانک گورنمنٹ نے اسے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر میں جو نقصان کالج کو اٹھانا پڑا اس کی تلافی پھر نہ ہو سکی اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم، اُستادی و شاگردی کے مخلصانہ رشتے اور بے لوث خدمت کے جذبے جیسے معدوم ہو گئے کہ وہ لوگ ہی نہ رہے جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے

اس ادارے کی پرورش و پرداخت کی تھی اور یوں یہ اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں سے محروم ہو گیا۔
بقول مولوی عبدالحق :۔

"اصل یہ ہے کہ 1864ء سے جب یہ غدر کے بعد دوبارہ کھلا تو زمانہ دوسرا تھا۔ انتظام تعلیم میں نیا ورق الٹ چکا تھا۔ ہر چیز کی تنظیم و ترتیب بالکل نئے سرے سے کی گئی۔ دلی کالج کی جو خصوصیتیں اور جن پر اس کالج اور کالج کے اساتذہ اور اس کے خیر اندیشوں کو ناز تھا وہ باقی نہ رہیں۔"

(مرحوم دلّی کالج از مولوی عبدالحق ص 81)

حواشی و مآخذ

1۔مرحوم دہلی کالج: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہندی دہلی 1989ء

2۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء: مولانا انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، دینی بک ڈپو دہلی

3۔غدر کے چند علماء: انتظام اللہ شہابی، دینی بک ڈپو دہلی

4۔1857ء (پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی): غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

5۔ہندوستانی نشاۃ الثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار: ڈاکٹر شمس الہدی دریابادی، شاہد پبلی کیشنز، دہلی 2005ء

6۔دلی کالج اردو میگزین: قدیم دتی کالج نمبر، نگراں خواجہ احمد فاروقی 1953ء

7۔اردوئے معلّیٰ: مرزا اسداللہ خاں غالب، الہ آباد

8۔ماسٹر رام چندر: صدیق الرحمٰن قدوائی، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی 1961ء

9۔طراز ظہیری (داستانِ غدر): ظہیر دہلوی، مرتبہ پروفیسر افغان اللہ، گورکھپور 2003ء

10۔جنگِ آزادی اٹھارہ سو ستاون: خورشید مصطفےٰ رضوی، مکتبہ برہان اردو دہلی 1995ء

11۔سن ستاون: پنڈت سندر لال انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1975ء

12۔انقلاب 1857ء تصویر کا دوسرا رخ: ترجمہ شیخ حسام الدین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982ء

13۔قدیم دلی کالج: مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1975ء

14۔تاریخ بغاوتِ ہند (محاربۂ عظیم): پنڈت منشی کنہیالال

15۔آثار الصنادید: سرسید احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی 2000ء

16۔واقعات دارالحکومت: مولوی بشیر الدین، اردو اکادمی، دہلی

17۔دہلی اردو اخبار: مقدمہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی 1972ء

19۔1857ء کے مجاہد شعرا: امداد صابری، مکتبہ شاہراہ، دہلی 1959ء

20۔اسبابِ بغاوتِ ہند: سرسید احمد خاں،

21۔نقوش: شخصیات نمبر

دستنبو، غالب اور ۱۸۵۷

غالب اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا نام ہے جس پر ہم سبھی فخر کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اردو ادب میں ایک نابغہ روزگار کے طور پر مشہور ہے اور انھوں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں ہی سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ سب پر غالب ہیں۔ ان کے نثری شہ پارے یعنی خطوط غالب کو تو اردو ادب میں گراں قدر اضافہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دستنبو بھی کچھ کم اہم نہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ انقلاب 1857 سے قبل غالب ایک نابغۂ روزگار شاعر کے طور پر مشہور و معروف بھلے ہی رہے ہوں لیکن اس جدوجہد آزادی یا غدر نے ایک دوسرا غالب پیدا کیا اس میں کوئی شک نہیں، اس انقلاب نے ایک شاعر ہم سے چھینا تو ایک مورخ اور نثار ہمیں عطا بھی کیا جس پر اردو نثر ہمیشہ نازاں رہے گی۔ اس دور میں غالب اپنے خطوط کی وجہ سے مشہور ہوئے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تو انکے روزنامچہ' نے انھیں مطلبی اور غرض مند شخص کے طور پر بھی متعارف کرایا، بقول ڈاکٹر سید معین الرحمن:

> "(دستنبو) یہ سراسر انگریز حکام کی تائید و تحسین میں ہے اور ذاتی تحفظ اور فروغ مراتب کی غرض سے لکھی گئی ہے، اس لئے اس کے مندرجات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس میں انگریزوں سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زور بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے"۔1

غالب کی ادبی اہمیت کے پیش نظر ہی ہم ان سے امید کرنے لگے کہ وہ جو کچھ بھی تحریر کریں گے دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تاریخ ہند کا مطالعہ کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ روزنامچہ ان کو غرض مند اور انگریزوں کا خوشہ چیں ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔ انھوں نے یہ روزنامچہ اس وقت لکھنا شروع کیا جب باغی 11 رمئی کو دہلی پہونچ چکے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا (20 ستمبر 1857) جب تک انگریزوں نے اولین جدوجہد آزادی (غدر) کو کچل نہیں دیا بلکہ بعد تک یعنی 31 جولائی 1858 تک، یہ وہ زمانہ ہے جب سامراجیوں کے ذریعہ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔

دلی لٹ رہی تھی، جل رہی تھی اور برباد ہو رہی تھی ظاہر ہے کہ ایسے حوصلہ شکن ماحول میں غالب سے یہی امید کی جاتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا ہوگا، محسوس کیا ہوگا یا لوگوں سے سنا ہوگا اسے ہی اپنے روزنامچے میں درج کیا ہوگا۔ وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''11 رمئی کو یہاں فساد شروع ہوا میں نے اسی دن سے گھر سے آنا جانا موقوف کر لیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی، جو سنا وہ ضمیمہ کرتا گیا''2

دستنبو کی زبان فارسی قدیم ہے ایسی فارسی جس پر غالب تحریر کیا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ''دساتیر'' کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور اس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ اپنے مقصد اور منشاء میں وہ کتنے کامیاب رہے اس کا ذکر آگے آئے گا لیکن اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اس تصنیف میں انھوں نے فارسی زبان پر عبور رکھنے کا منھ بولتا ثبوت پیش کیا۔ اور اس قدر قدیم فارسی لکھی کہ اس کی درست عبارت پڑھنا بھی عام آدمی کیلئے بڑی بات تھی اور ہے چہ جائیکہ اس کا سمجھنا۔ دستنبو کو غالب نے روزنامچہ اور سرگزشت قرار دیا ہے جس میں 11 رمئی 1857 سے 31 جولائی 1858 تک کی روداد نثر میں لکھی ہے ملاحظہ فرمائیں یہ جملے جو انھوں نے، نوادرالدولہ کو تحریر کیے تھے۔

' میں نے 11 رمئی 1857 سے 31 جولائی 1858 تک روداد نثر میں لکھی ہے دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے سے کام رکھا ہے''۔ 3

دیکھیں دستنبو سے متعلق مرزا یوسف علی خاں عزیز خاں کے نام تحریر کردہ خط میں وہ کیا کیا فرماتے ہیں:

'' تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارہویں 1857 سے جولائی کی 31 ویں 1858 تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے و رنثر فارسی زبان قدیم میں ہے جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے ور ایک قصیدہ وہ بھی متعارف عربی اور فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے یہ کتاب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے''4

غالب نے دستنبو کا سرنامہ یوں لکھا ہے۔

بنام خدا وند پیروز گر

مہ و مہر ساز و شب و روز گر

(میں اس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اس خدا کے نام سے جو کامیابی بخشنے والا ہے جو چاند سورج اور دن رات کا خالق ہے۔) ترجمہ: رشید حسن خاں

اوپر درج کئے گئے غالب کے بیان میں ذرا سی تبدیلی کی ضرورت تھی اور وہ یہ کہ یہ روزنامچہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر لکھا گیا ہے جس کے لئے وہ خدا سے بھی دعا گو ہیں۔ غالب کی خواہش تھی کہ دستنبو جب شائع ہو جائے تو وہ اسکی ایک جلد لارڈ کیننگ کی خدمت میں پیش کریں اور دوسری جلد ملکۂ انگلستان کی نذر کریں۔ ایسے میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے دستنبو میں شفافیت کا مظاہرہ کیا ہوگا اور 1857 کے واقعات کو من وعن پیش کر دیا ہوگا قطعاً ناممکن ہے۔ تفتہ کے نام لکھے خطوط سے بھی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایسے عالم میں جب کہ پریس ایکٹ نافذ ہو چکا تھا اس کتاب کی اشاعت کے لئے انگریز حکام نے بہ خوشی اجازت کیوں کر دے دی ۔اس کتاب کی اشاعت ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں انگریزوں کی کارستانیوں کا بیان کم سے کم، شاید نہیں کے برابر تھا۔ اسی لئے کہا بھی جاتا ہے کہ دستنبو مصلحت کے قلم سے تحریر کردہ روزنامچہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انگریز وفادار پردۂ زنگاری میں بول رہا ہے۔ غالب کی غرض مندی ان کے اس اقتباس سے بھی جھلکتی ہے جو دستنبو کا آخری حصہ ہے:

''کاش میری ان تین خواہشوں یعنی خطاب وخلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جس کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی کچھ لکھا ہے میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر دوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔''5

میرے خیال میں یہ تصنیف غالب کی سرگزشت بھلے ہی ہو ان کے مشاہدے کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ خود ان کے بیان کے مطابق وہ فساد والے دن یعنی 11 رمئی کو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیتے ہیں اور باہر آنا جانا موقوف کر دیتے ہیں ایسے میں مشاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مزید برآں ان کا یہ کہنا کہ انھوں نے جو کچھ سنا وہ رقم کر دیا۔ یہ بات اس لئے صحیح نہیں ہے کہ غالب بہرے پن کی وجہ سے زیدہ سن بھی نہیں پاتے تھے۔ نھوں نے جو کچھ سنا وہ رقم کر دیا والی بات صرف اس لئے لکھ دی ہے کہ وہ خود کو کسی طرح کے الزام سے بچا سکیں اور اگر کوئی انہونی ہو تو وہ صاف بچ نکلیں کہ انھوں نے یہ بات کسی اور سے سنی تھی۔ دیکھیں ان کا نرالا انداز بیان:

"اس کتاب میں شروع سے آخر تک ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں یا ان واقعات کا (ذکر) ہوگا جس کے متعلق سننے میں آتے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہونگی یا کچھ کم کر کے لکھی ہونگی۔ میں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں دل قید (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے"[6]

اس چھوٹے سے پیراگراف میں عجیب سا تضاد نظر آتا ہے یہ ہم سبھی پر واضح ہے کیونکہ جس کی آنکھیں بے کار ہوں یعنی کارآمد نہ رہی ہوں وہ بھلا کیا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ غالب تا عمر غرض مندی کے حصار میں رہے اور ان کی ہمیشہ سے یہ مساعی رہی کہ بادشاہوں ،نوابوں، امراء اور دیگر صاحب اقتدار افراد کو خوش کر کے یا پھر کسی اور صورت اپنی زندگی کو خوبصورت بنائے رکھا جائے اس کے وافر ثبوت ان کے خطوط میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ جس دربار کے تاریخ نگار کے طور پر ان کا تقرر ہوا تھا، وہ جس بادشاہ کے اتالیق، درباری اور ندیم رہ چکے تھے اسی سے روگردانی کریں اور وہ کچھ لکھ جائیں جس کی ان سے امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ انقلاب 57 سے قبل بہادر شاہ ظفر نے 1850 میں غالب کو باضابطہ اپنے دربار میں عزت و اکرام سے نوازا اور انھیں نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ جیسے خطابات عطا کیے تھے نیز انھیں چھ سو روپیے کے عوض خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ انھوں نے ایسا جان بچانے کیلئے کیا، یا انھیں روزی روٹی کا مسئلہ درپیش تھا اور حکام سے پنشن لینی تھی تو بھی اسے غالب کی غرض مندی کا کھلا ثبوت گردانا جائے گا، ساتھ ہی خود کو انگریزوں کا وفادار ثابت کرنا اور جنگ آزادی سے الگ تھلگ رہنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ غالب کا یہ روزنامچہ ایک نہایت ذاتی چیز تھی اسے شائع کرانے کی تگ و دو چہ معنی دارد؟ درآں حالیکہ انھوں نے اسے شائع کرانے کیلئے مشیر الدولہ رائے امید سنگھ بہادر سے مالی اعانت کی درخواست کی تھی جو دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ دیکھیں میر مہدی مجروح کو لکھا گیا ایک خط جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

"منشی امید سنگھ اندور والے نے .... نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا .... بھائی میں نے 11 رمئی 1857 سے 31 رجولائی 1858 تک کا حال لکھا ہے

اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے............کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا

...اگر ختم کر کے مسودہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون۔"7

سچ تو یہ ہے کہ روزنامچہ دستنبو صرف اس لیے تحریر کیا گیا کہ قلعہ معلی سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹایا جاسکے، اس کی پردہ داری کی جاسکے، نیز ہندوستان کی اولین تحریک آزادی کو "رستخیز بے جا" قرار دے کر انگریزوں کی نظر میں سرخرو ہوا جائے تا کہ ان کی مطلب برآوری میں آسانی ہو اور وہ پنشن اور خطاب وغیرہ سے نوازے جاسکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دستنبو کی پرتکلف جلدوں کو شائع کرانے پر زور دیا تھا اور ملکہ برطانیہ کے حضور میں لارڈ ایلن برا کی معرفت ایک قصیدہ بھی لکھ بھیجا تھا جس کا عنوان "قصیدہ برگزیدہ در تہنیت فتح ہند" تھا جس میں روم و ایران میں شعراء کی سرپرستی اور عزت افزائی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے لیے خلعت و خطاب اور پنشن کی درخواست کی گئی تھی جس کا جواب خاطر خواہ ملنے کے آثار بھی تھے اور اسی سے وہ امید و بیم کے ہچکولے کھانے لگے تھے لیکن غدر سے ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور وہ مجاہدین سے ناراض ہوگئے اور ان کے جو جی میں آیا کہہ گئے بہر حال غالب کے ذہن میں مطالب برآوری، غرض مندی اور مصلحت پسندی نہ ہوتی تو وہ منشی ہرگوپال تفتہ کو دستنبو کی طباعت کی خاطر متوجہ نہ کرتے اور یہ نہ کہتے کہ:

"میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔"8

1857 کی اولین جنگ آزادی میں غالب کے کردار کو لے کر ان کے طرفدار یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ جس روزنامچے کے لیے انھوں نے جو نوٹس لیے تھے وہ انھوں نے مصلحت کی بنا پر ضائع کر دیے ورنہ سچی تصویر سامنے آتی۔ ظاہر ہے اس طرفداری سے ان کے کردار پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ دستنبو کے ذریعے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ خود کو انگریزوں کا خیرخواہ ثابت کرسکیں جس کی مثال میں وہ قصیدہ پیش کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے شہزادی کی شان میں لکھا تھا اور اس کی ایک خاص جلد لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ جنگ آزادی میں اگر غالب کا رول مخلصانہ ہوتا تو وہ مجاہدین کے خلاف ہرگز نہ لکھتے خواہ ایسے میں انھیں روزنامچہ لکھنا ترک ہی کیوں نہ کرنا پڑتا لیکن غالب کی غرض مندی اور مصلحت پسندی نے ہندستان کی اولین جنگ آزادی میں کام آنے والے سورماؤں کو غلط الفاظ سے یاد کیا ہے جو ان کی منفی شبیہ بناتی ہے کیونکہ یہ وہی غالب ہیں جو اپنی انا کے لیے مشہور ہیں اور وہی شخص اس مرحلے پر چند سکوں کے عوض اپنے

آرام و آسائش کی خاطر انگریزوں کی کالی کرتوتوں کی مدح سرائی میں ملوث ہو جاتے ہیں اور اگر کہیں باغیوں سے ہمدردی دکھاتے بھی ہیں تو اس میں مصلحت آمیز طنز پوشیدہ نظر آتا ہے مثلاً دیکھیں یہ جملے:

"..... یہ جاہل فوجی جھاڑوں کے تنکوں کی طرح متحد ہیں بغیر روزانہ مشق کے بھی یہ شاندار طریقے سے مارچ کرتے ہیں اور بغیر کمان کے جنگ کرتے ہیں۔"9

یا پھر یہ جملے:

"عوام حکام کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اور انجام سے بے پروا انگریزوں کا خون بہا کر جشن منا رہے ہیں۔"10

ان دونوں اقتباسات سے قطع نظر یہ جملے ملاحظہ فرمائیں جس میں غالب مجاہدین کو غنڈہ گردانتے ہیں اور Public Protest کو عوام کی بھیڑ سے عبارت کرتے ہیں اور اسکے برعکس انگریزوں کو مضبوط دل فوجی کہہ کر ان کی حمایت کرتے ہیں:

"شہر کے بعض غنڈے اور عوام کی بھیڑ اب مضبوط دل فوجیوں (انگریزوں) کے ساتھ بھڑ گئے دو روز تک کشمیری دروازے سے لے کر شہر کا گوشہ گوشہ میدان جنگ بنا رہا۔"11

یہاں خطوط غالب سے ایک تراشہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں انھوں نے مجاہدین کو روسیاہ گردانا ہے اور انگریزوں کے قتل پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ان سے انکی مطلب برآوری کے امکانات تھے:

"انگریزی قوم میں سے جو ان روسیہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔"12

دستنبو غالب کی غرض مندی کا سب سے عمدہ ثبوت تو ہے ہی اس ضمن میں ان کے خطوط بھی کچھ کم نہیں ہیں گرچہ خطوط میں ان کی غرض مندی زیادہ ابھر کر نہیں آتی اور کبھی کبھی ہمدردی کا شائبہ بھی نظر آتا ہے دیکھیں دو اقتباسات جس میں غالب جذباتی انداز میں کچھ اس طرح کے جملے لکھ جاتے ہیں:

"کئی لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر (دہلی) پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں (انگریزی فوج جن کی وردی خاکی تھی) کا۔

اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔''13

''آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت..... غم فراق۔''14

مندرجہ بالا اقتباس کی بازگشت کے طور پر یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں غالب ویسے غالب ہرگز نظر نہیں آتے جیسے کہ دستنبو میں دکھائی دیتے ہیں:

''ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ شاگرد کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔''15

یہاں غالب نے اہل شہر کا اعتبار لوٹنے کی بات کہی ہے اس سے مراد کیا ہے۔ وہ کس اعتبار کے لٹنے پر اس قدر افسردہ ہیں غالب کے یہاں یہ تضاد عجیب سا لگتا ہے اس پر طرہ یہ کہ وہ بار بار اپنے خطوط میں لکھتے جاتے ہیں کہ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ڈر اس لئے بھی تھا کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت ذوق کے شاگرد دویران نے دہلی کے صادق الاخبار میں ''سکۂ نو'' کے عنوان سے سکہ شائع کرایا تھا جس کا الزام انگریزوں کے ایک مخبر گوری شنکر نے غالب پر لگا دیا تھا اور پھر یہ الزام وبا کی طرح پھیلا جس پر اکثر بحث ہوا کرتی ہے۔ یہ سکہ کچھ یوں تھا:

بزر　زد　سکۂ　کشور　ستانی
سراج　الدین　بہادر　شاہ　ثانی

اس سکے کی بنیاد پر انھیں باغیوں کا ہمنوا ٹھہرایا گیا اور بحالی پنشن کی غالب کی امید پر پانی پھر گیا، دیکھیں غالب کے خط کا یہ تراشا جو نھوں نے عبدالغفور سرور کے نام تحریر کیا ہے:

''سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے اس کے علاوہ اب تک لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں

مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارنے ثابت ہوئے۔ میں ہر چند قلم رو ہند میں دلی اُردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔"16

یہ تو غالب کا بیان ہے لیکن نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں 13 رزی قعدہ 1273ھ کا صادق الاخبار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ پر یہ الزام سچا نہیں ہے بلکہ یہ الزام برائے الزام ہے اور اس کا تعلق نہ ذوقؔ سے ہے نہ ہی غالبؔ سے، لیکن چونکہ غالبؔ اپنی غرض مندی کیلئے مشہور ہو گئے تھے اس لئے یہ سکہ ان سے منسوب کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ان کے خیر خواہوں نے کیا ہوگا کہ بادشاہ وقت سے انھیں فائدہ پہنچ سکے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد معاملہ الٹا بلکہ سنگین ہو گیا اور غالبؔ کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے کافی تگ ودو کرنی پڑی، انہوں نے کبھی حسین مرزا کو خط لکھا تو کبھی عبدالغفور سرور کو، کبھی یوسف مرزا کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلایا کہ دہلی اردو اخبار دلا دو کہ بے گناہی ثابت ہو سکے۔ یہ اور اس طرح کے اور بھی کئی جتن غالبؔ نے کیے جس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ حق تو یہ ہے کہ غالبؔ نے یہ سکہ ہرگز نہیں لکھا تھا جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے دہلی اردو اخبار کا مطالبہ کیا تھا جب کہ سکہ صادق الاخبار میں شائع ہوا تھا اسی پر بس نہیں غالبؔ نے خود کو بچانے کے لئے ذوقؔ اور مولوی محمد باقر کو بھی نہیں بخشا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ذوقؔ نے یہ دونوں سکے کہے ہیں جسے مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار میں شائع کیا۔ بغیر تصدیق کیے اس طرح کے بیانات کس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ انھوں نے اپنی دلیل کو مزید پختہ کرنے کیلئے یہ بھی کہا کہ مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکہ لوگوں نے سنا بھی ہے اور ان کو اب تک یاد ہے۔ وہ صاحب عالم مارہروی کو 1859 میں لکھتے ہیں۔

"..... اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارنے ہوئے ثابت ہوئے ہیں میں نے ہر چند قلم رو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر آیا"۔

بہر حال یہ تو تھا خطوط غالب کا انداز لیکن دستنبو میں تو انھوں نے کھل کر انگریزوں کے گن گان کئے ہیں اور ان کی ظالمانہ، آمرانہ اور سامراجیانہ حرکتوں کو درست قرار دیا ہے۔ اگر 1857 کے بعد کے خطوط میں غالب نے اس فتنہ وفساد کا ماتم کیا تو دوسری طرف دستنبو میں انھوں نے مجاہدین آزادی کو شوریدہ سر، آشفتہ سر، دیوانہ و آوارہ، بد باطن، سیہ باطن، بدنصیب، درندہ صفت، ظالم، مدہوش، کم رتبہ، گدازاد، گم نام، گم راہ، دیوانہ، بدذات، ناشکرے، ناخدا ترس اور بے رحم و قاتل تک گردانا ہے حد تو یہ ہے کہ انھیں خبیث، خنزیر، نمک حرام اور فسادی تک کے القاب دیئے ہیں تو دوسری طرف سامراجی ذہنیت کے نقیب انگریزوں کو وہ عزت واحترام سے یاد کرتے ہیں مثلاً انہیں قابل احترام، پیکر علم وحکمت، منصف، خوش اخلاق و نیک نام، صاحبان علم و دانش، شیر دل، گل اندام، غضبناک، سخی، دانشور، حقیقت پسند، نیک ذات، حاکمان عادل والا شکوہ وغیرہ صفاتیہ کلمات کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تخلیقات میں ایک ایسا غالب نظر آتا ہے جو نہ صرف حالات سے Frustrated ہے بلکہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ کبھی اس پر جذبات غالب آتے ہیں تو کبھی وہ مصلحت کے حصار میں ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ غالب نے انگریزوں کی خوشنودی اور اپنی غرض مندی کی وجہ سے کئی بار صریحاً غلط بیانی سے کام لیا اور یہاں تک لکھ گئے کہ انگریزوں نے انتقامی کارروائی کرتے وقت:

"بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا....."

غالب کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز دوران جدوجہد آزادی بڑے مہذب تھے اور انھوں نے عورتوں، بچوں کو ذرا نہیں ستایا جب کہ دوسری طرف وہ خود لکھتے ہیں کہ ہمارے نئے آقاؤں کی آتش انتقام کا نیا دور شروع ہوا۔ اس تضاد کے درمیان انگریز مورخوں کا بیان ہے کہ انگریز سپاہی جہاں گھستے یا راستے میں جہاں جو ملتا بلا امتیاز اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے، گولی سے اڑا دیتے یا پھر انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیتے یعنی انگریزوں نے Mass Genocyde کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بیان میں غالب کا قصور نہیں کیوں کہ وہ پہلے ہی خود کو نمک خوار سرکار انگریز سمجھتے تھے۔ وہ 13 رجنوری 1858 کو نواب رام پور کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "وہ نمک خوار سرکار انگریز ہیں" اب ایک نمک خوار اپنے آقا سے نمک حرامی کیوں کرتا؟ ان کے بیان کی قلعی کے ورملسن کے اس قول سے کھلتی ہے۔

"گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتی تھیں اور سب مردوں، عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی..... کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔"17

اگر کے اور ملسن کے بیان سے بات واضح نہ ہو پائی ہو تو ہم غالب کے مندرجہ بالا بیان کے مقابلے میں چارلس بالس کا یہ بیان نقل کرتے ہیں جس میں اقرار کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں نے کس قسم کا ظلم روا رکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، جھونپڑوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔"18

دیکھیں یہ اقتباس جس میں انگریز مورخ جان کے نے خونی عدالتوں اور جھوٹے مقدموں سے متعلق سچ لکھا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانیوں پر کیا کچھ گزری۔ درآں حالیکہ غالب جیسا بالغ نظر شخص اپنی غرض کی خاطر ان سامراجیوں سے وفاداری کے درپے ہے:

"فوجی اور سول دونوں طرح کے انگریز افسر اپنی اپنی خونی عدالتیں لگا رہے تھے یا بغیر کسی طرح کے مقدمے کا ڈھونگ رچائے اور بغیر مرد، عورت یا چھوٹے بڑے کا خیال کیئے ہندوستانیوں کا قتل عام کر رہے تھے ہندوستان کے گورنر جنرل نے جو خط انگلستان بھیجے، ان میں ہماری برٹش پارلیمنٹ کے کاغذوں میں یہ بات درج ہے کہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو اسی طرح ذبح کیا گیا جس طرح ان لوگوں کو جو بغاوت میں شامل تھے۔"19

ملاحظہ فرمائیں غالب کی حاشیہ آرائی جس میں انھوں نے مجاہدین آزادی کے مجاہدانہ عمل کو منفی انداز میں بیان کیا ہے اور انھیں ظالم، مفسد وغیرہ کہہ کر وہیں انگریزوں کو قابل احترام ٹھہرایا ہے اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا:

"11/مئی 1857 کو میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر (دہلی) میں آئے نہایت ظالم اور مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے (یہ) مدہوش سوار اور اکھڑ پیادے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر

دیا، ادھر سے رخ نہیں پھیرا۔"20

ملاحظہ فرمائیں ایک اور اقتباس جس میں غالب اپنی وفاداری ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اور ان انگریزوں کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے ہیں جن کے ہاتھ ان کے عزیزوں اور دوستوں کے خون سے رنگے ہیں:

"زمین گل اندا موں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔ افسوس وہ پیکر علم وحکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا) میں ڈوب گئے" 21

دستنبو، غالب اور 1857 پر مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب اس قیامت کبریٰ کے بعد عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئے تھے۔ یہاں جس طرح ایک نابغۂ روزگار کو اس واقعہ سے اثر قبول کرنا چاہئے تھا ویسا کچھ نہیں ہوا اور نہ ہمیں تلاش کرنے پر بھی ویسا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ یہ ان کی مجبوری تھی، مصلحت پسندی تھی یا کہ غرض مندی یہ وہ خود جانیں یا ان کا خدا جانے کیوں کہ دستنبو کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو جس پیمانے پر وہ خود کو انگریزوں کا حاجی اور وفادار ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ یہ سلسلہ بہت پرانا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی اس کوشش میں ان کے نثر کی سادگی و پرکاری جاتی رہی اور ان کا انداز بے جان سے ہو گیا کیونکہ جو تخلیقات سچائی کی تپش میں پروان چڑھتی ہیں وہی کندن بنا کرتی ہیں اسی میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی قوت ہوا کرتی ہے۔ دستنبو میں ایسا کچھ نہیں ہے یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ بقول سید معین الرحمٰن:

"غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے نا آشنا طرز تحریر کی وجہ سے ہندستانیوں کے لئے سر بستہ راز رہے تا کہ وہ ان میں ہدف ملامت بننے سے محفوظ رہے۔"22

افسوس کہ غالب اپنی اس کوشش میں ناکام رہے اور ان کا یہ طریقہ سب پر واضح ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی عام ہندوستانی کو ان سے اس قسم کی امید نہ تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے انانیت پسندی کو اپنا مطمح نظر بنایا ہو یعنی لوٹ آیا اگر در کعبہ وا نہ ہوا والا ذہن رکھتا ہو اس سے انجانے میں بھی اس طرح کی غلطی سرزد ہو جائے اور دستنبو جیسی تخلیق منظر عام پر آجائے، شاید ایسا ہرگز نہیں ہے چہ جائیکہ یہ تخلیق ان کے لئے ننگ عار ثابت ہوئی۔ آخر میں اودھ اخبار کا یہ تراشہ ملاحظہ فرمائیں جس میں غالب نے اولین جدوجہد آزادی ختم ہونے کے بعد خوشی کا اظہار کیا ہے اور جو انگریزی عمل داری سے خفا ہیں ان پر طنز کے تیر چلائے ہیں:

> ''ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلم رو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے اور بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عمل داری میں ناخوشنود ہے۔''23

میں اس بحث کو اس نتیجے پر ختم کرنا چاہوں گا کہ غالب کے خطوط اور دستنبو میں 1857 کا ذکر جہاں کہیں بھی ہوا اس میں دل و دماغ کا نہایت اہم رول ہے کیوں کہ جہاں غالب نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نثر لکھی ہے فطری انداز میں اظہار خیال کیا ہے، وہ اس وقت کے سماجی کرب کا اظہار کر گئے ہیں اور جہاں انھوں نے دماغ کی بات مانی ہے مفاد اور مطلب کے حصار میں آگئے ہیں۔ اس سے بھلے ہی انھیں وقتی فائدہ پہنچا ہو ادب میں انھیں بڑا نقصان اٹھانا پڑا ہے اور یہ روزنامچہ آج بھی غالب کے متعلق منفی سوچ کو مہمیز کرتا ہے اس پر تمام ناقدین ادب متفق ہیں۔

حواشی و مآخذ

1۔ غالب اور انقلاب 57، ڈاکٹر سید معین الرحمن صفحہ 310 ایڈیشن 1988

2۔ چودھری عبدالغفور سرور 18 نومبر 1858ء

3۔ نامۂ غالب بنام انوار الدولہ شفق اکتوبر 1858ء

4۔ مرزا غالب: عود ہندی، لکھنؤ صفحہ 95

5۔ مرزا غالب: دستنبو

6۔ مرزا غالب: دستنبو ص 57

7۔ خطوط بنام میر مہدی مجروح اکتوبر 1858ء

8۔ غالب بنام تفتہ 3 ستمبر 1858ء

9۔ مرزا غالب: دستنبو

10۔ مرزا غالب: دستنبو

11۔ مرزا غالب دستنبو

12۔ خطوط غالب بنام تفتہ 1858

13۔ عود ہندی: نامہ غالب ص 90 بنام انور لدولہ شفق 1860ء

14۔ نامہ غالب بنام یوسف مرزا 28 نومبر 1859

15۔ خطوط بنام تفتہ 1858

16۔ خلیق انجم: خطوط غالب جلد دوم، صفحہ 204 غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی 1985

Kaye & Melleson's: History of Mutiny, Voll-2, P. 17 ۔ 17

Charles Balls. History of Indian Mutiny, Voll-1 P 243-244 ۔ 18

Kaye's History of the Sepoy War, Voll.2-19

20۔ مرزا غالب: دستنبو

21۔ مرزا غالب: دستنبو

22۔ سید معین الرحمن، غالب اور انقلاب 1857، صفحہ 17 غالب انسٹی ٹیوٹ، 1988

23 مرزا غالب: اودھ اخبار 23 اپریل 1862

ڈاکٹر انور پاشا

اٹھارہ سو ستاون اور سر سید تحریک

ادب یا ادیب اپنے عہد کا صرف ترجمان یا عکاس ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے عصر کا ناقد، معمار اور رہبر بھی ہوتا ہے۔ ادیب اگر ایک طرف اپنے عہد کے مادی اور فکری خرمن سے خوشہ چینی کر کے اپنے شعور کی آبیاری کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے شعور کو نئے مادی اور فکری جہان کی نمود اور رنگ آمیزی کے لیے بروئے کار بھی لاتا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیقات میں پنہاں تاریخی وعصری تناظر کو نظر انداز کر کے نہ تو اس کی صحیح تفہیم ہی ممکن ہے اور نہ ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین ہی کیا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ لازم ہے کہ 1857 کے بعد کے ادب اور اس ادب میں اختیار کردہ ادیبوں کے فکری موقف اور ان کے ادبی ردعمل کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے۔

1857 کے بعد کے ادبی منظر نامے کے پس پشت انیسویں صدی کا وہ تغیر خیز منظر نامہ تھا، جس کی بنیاد اٹھارویں صدی میں ہی پڑ چکی تھی اور جس نے ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، سیاست، معیشت، معاشرت اور مذہب و اخلاق گویا ہر شعبہ زندگی کو یکسر متاثر و متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ اور تغیر و تبدل کا یہ فیل بدمست بے مہار، بے لگام اس طرح رواں دواں تھا کہ جس پر ہندوستانی عوام وخواص کا نہ تو کوئی بس تھا اور نہ ہی اس سے نبرد آزما ہونے کی ان میں سکت و ہمت تھی۔ وہ ایک بے بس تماشائی کی طرح اس طوفانی منظر کو دیکھنے اور اس کی حشر خیزیوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور ہندوستان گیر سطح پر اقتدار و انتظام کی لامرکزیت سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی رفتہ رفتہ انگریزوں نے اس صورت حال کو اپنی شاطرانہ چالوں اور عیارانہ حکمت عملی کے ذریعے اپنے حق میں موافق بنا لیا۔ اپنے تجارتی مفادات کی کماحقہ تکمیل کے لیے انہوں نے سیاسی اقتدار کے حصول اور اس کے استحکام و توسیع کو لازمی گردانا۔ اپنے اس نصب العین کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایسی حکمت عملی مرتب کی کہ قلیل عرصے میں ہی پورے ہندوستان پر ان

کا مکمل سیاسی و معاشی تسلط قائم ہو گیا۔

1857 میں انگریزی سامراجیت ہندوستانی حریت پسندوں کے ذریعہ کی گئی جدوجہد کی ناکامی کے بعد انگریزی فوج کے انسانیت کش انتقامی مظالم نے حریت پسندوں کے کس بل توڑ کر رکھ دئے تھے۔ بچے کھچے رجواڑوں اور خودمختار ریاستوں کی خودسپردگی و نیاز مندی نے نہ صرف برطانوی عزائم کو مزید استحکام عطا کیا بلکہ مستقبل قریب میں آزادی کے تمام تر امکانات کو بھی معدوم کر کے رکھ دیا۔ اب ہندوستان براہ راست برطانوی سامراجیت کے دام میں اسیر تھا جس کا واضح مقصد ہندوستان کی قسمت میں طویل غلامی تھا۔

لیکن غلامی کا یہ گراں بار طوق بظاہر ہی ہندوستانیوں کے گلے میں ایک لعنت ناگزیر بن گیا ہو مگر بیدار ذہن افراد کے لیے یہ سوہان روح سے کم نہ تھا۔ ذہنی و نفسیاتی طور پر اب بھی آزادی خواہی کی چنگاری باقی تھی۔ لیکن آزادی خواہی کی اس چنگاری کا اظہار اب برملا اور منظم عسکری عزائم کے اظہار کے ذریعے ممکن نہ تھا۔ اب آزادی خواہی کا اظہار ایک نئی حکمت عملی کا متقاضی تھا۔ ایک ایسی حکمت عملی جو برطانوی حکومت کی نظر میں قابل گرفت بھی نہ ہو اور ہندوستانی عوام میں ذہنی و فکری بیداری کے لیے فضا بھی سازگار کر سکے۔ لہٰذا اب اصلاحی حکمت عملی ہی واحد راستہ تھا جس کے ذریعہ قوم کو خطاب بھی کیا جاسکتا تھا اور ان کے شکست خوردہ احساسات کی راکھ میں دبی بیداری کی چنگاری کو بھی سرد ہونے سے محفوظ رکھا جاسکتا تھا۔ نیز برطانوی حکومت کو ایسی اصلاحی کوششوں کو اپنے مفاد کے منافی تصور کرنے کا جواز بھی نہ مل سکتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس برطانوی سامراجیت کو اس وہم میں مبتلا رکھا جاسکتا تھا کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ ہندوستانی عوام کی ذہنی ہم آہنگی کے لیے اصلاحی حکمت عملی عین حکومت وقت کے مفاد کے موافق ہے۔ کیونکہ ایسی کوششوں میں ہندوستان میں اس طبقے کے ورود کے امکانات پوشیدہ تھے جو برطانوی حکومت کے لیے معاون ہو سکتا تھا۔ وہ طبقہ جس کے ورود کا خواب میکالے نے دیکھا تھا:

> ”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“

میکالے کا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا، کیونکہ قومی و ملی حمیت و غیرت ہندوستانی عوام کی رگ

دبے میں خون بن کر دوڑتا رہا۔ جسے انگریز لاکھ کوششوں کے باوجود سرد نہ کر سکے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اصلاحی حکمت عملی کے لیے راستہ ہموار ہو گیا لیکن اس حکمت عملی میں وہ سارے عناصر موجود تھے جو مارکس کے جدلیاتی نظام کی رو سے میکالے اور برطانوی سامراجیت کے خوابوں کے شیرازے کو بکھیرنے کے لیے کافی تھے۔ بقول غالب:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس پس منظر میں اگر ہم دیکھیں تو سرسید اور ان کے رفقائے کار ادیبوں اور دانشوروں کی یہ اصلاحی حکمت عملی عصری تناظر سے بے حد مطابقت رکھتی تھی، کیونکہ ہندوستان کے دیگر خطوں مثلاً بنگال وغیرہ میں اسی نوع کی حکمت عملی کو راجہ رام موہن رائے اور اس عہد کے دیگر دانشوران واہل نظر حضرات بہت پہلے سے اختیار کر چکے تھے۔ اس حکمت عملی کو اختیار کرنے میں ان کی سبقت خاطر خواہ رنگ بھی لا رہی تھی اور ایک قابل لحاظ طبقہ انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی پر گامزن ہو کر اپنی معاشی، سماجی اور انتظامی پوزیشن کو مستحکم کرنے میں کامیاب تھا۔ لیکن مسلمانوں کا طبقہ 1857ء کی حریت پسندانہ جدوجہد کی ناکامی کے زخموں کو ہنوز چاٹنے میں مصروف اور ماضی پرستی کے ذہنی حصار میں مقید تھا۔ سرسید اور اس دور کے دیگر ادیب اور دانشور مثلاً نذیر احمد، آزاد، حالی، شرر وغیرہ کی دور اندیش نظر صورت حال کی اس نزاکت سے بخوبی واقف تھی۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو قوم کو اس صورت حال کے رحم کرم پر چھوڑ دیا جائے یا پھر اس صورت حال کو بدلنے کے لیے ایک ایسی حکمت عملی اختیار کی جائے جو شکست خوردہ مغلوب و محکوم قوم کو عصری مرکزی دھارے میں لانے میں کارگر ہو۔ سرسید اور ان کے معاصر ادیبوں اور دانشوروں کی اس اصلاحی حکمت عملی کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ کم نظر ناقدین و مورخین سرسید کی تحریروں اور مقالات کے بعض حصوں سے اخذ شدہ اقتباسات کی روشنی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی مساعی کو انگریز پرستی سے تعبیر کرنے سے نہیں چوکتے۔ لیکن وہ اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اپنے اصلاحی مشن کو بلا مداخلت جاری رکھنے کے لیے لازم تھا کہ جابر حکومت وقت کی مداحی میں بھی چند الفاظ صرف کیے جائیں۔ سرسید کی اس نوع کی تحریریں اور مقالات وقتی نوعیت اور شعوری طور پر مخصوص مقصد کی تکمیل کے لیے وقف تھیں، لیکن ان کے وقیع تحریری کارناموں میں یا ادبی نوع کی تحریروں میں کہیں بھی ایسی فکر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ان دانشوروں اور ادیبوں کی یہ حکمت عملی دو

دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف تھی۔ یہ دانشور اور ادیب اس حکمت عملی کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ادبی تخلیقات میں کہیں بھی انگریز پرستی کو راہ نہ پانے دی۔ بلکہ سارا زور قومی محاکے اور احتساب، نیز اپنی حیثیت کی از سر نو بازیافت کی ترغیب پر صرف کیا۔ قومی محاکے اور احتساب کی یہ دعوت، ملک وقوم سے ان کی محبت اور بتر صورت حال سے ان کی بے اطمینانی کا مظہر ہے۔ ورنہ عصری حالات سے اطمینان وآسودگی کی صورت میں کسی محاکے یا احتساب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

1857ء کے بعد کا عہد ایک عبوری عہد تھا۔ ایک طرف تغیرات کا عمل جاری تھا تو دوسری طرف یہ تغیرات اندیشہ ہائے دور دراز اور مختلف نوعیت کے شکوک وشبہات کے متحرک بھی تھے۔ شکست وریخت کا عمل ابھی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچا تھا جب کہ دوسری جانب تعمیر وتشکیل کا عمل بھی اپنی واضح سمت سے محروم تھا۔ گویا ایک مبہم اور غیر واضح فضا طاری تھی۔ عوام وخواص دونوں ہی سطحوں پر تذبذب اور شکوک وشبہات کا رویہ غالب تھا۔ ہندوستانی عوام وخواص کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو غلامی کے طوق کو بصد افتخار اپنے گلے میں ڈالنے پر راضی تھا۔ یہ طبقہ اپنی ترقی اور اپنا مفاد اپنے برطانوی آقاؤں کی کورانہ تقلید اور ابن الوقتی میں مضمر پاتا تھا۔ جب کہ دوسری جانب ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو فرنگیوں سے مصافحہ کرنے تک کو کفر کے مترادف قرار دیتا تھا۔ یہ طبقہ پوری شدت کے ساتھ انگریزوں سے لاتعلقی اور ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر کاربند تھا۔ غرض کہ ان دونوں ہی طبقات میں ایک شدت پسندی تھی، جو عصری حالات کے تناظر میں ایک منفی نتیجے کا پیش خیمہ تھی۔ اس صورت حال کے متوازی ایک طبقہ ایسا ابھر کر آیا جو تعلیم یافتہ تھا اور جدید علوم کی اہمیت سے واقف بھی۔ متغیر حالات پر اس کی گہری نظر تھی اور دور اندیشی کو ترجیح دیتا تھا۔ دانشوروں اور مفکرین کے اس طبقے نے مصلحت پسندی، ذہنی بیداری وہوش مندی کے ساتھ اصلاحی حکمت عملی کو اپنا شعار بنایا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کا تعلق اسی طبقے سے تھا، جنہوں نے اصلاحی حکمت عملی کو اختیار کیا اور زمانہ شناسی کو اہمیت دی۔

سرسید اور ان کے رفقائے کار، اس عہد کے اردو ادیبوں اور دانشوروں نے یہ محسوس کیا کہ مغلیہ سلطنت کی باقیات اور جاگیردارانہ تہذیبی اقدار کو من وعن ڈھوئے جانا، انہیں سینے سے چمٹائے رکھنا قوم کے لیے سودمند نہیں۔ اس طبقے کا یہ خیال تھا کہ از کار رفتہ اقدار کی موت فطری

ہوتی ہے۔ لہٰذا جاگیردارانہ نظام کا اپنی انتہا کو پہنچ کر زوال سے ہم کنار ہونا ایک فطری عمل تھا۔ کیونکہ وہ نظام ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں اس کی بقا کے لیے ایسے وسائل اور حکمت عملی کی ضرورت تھی جو اسے توانائی عطا کر سکتی تھی، لیکن نااہل حکمراں اس نظام کو نئی توانائی عطا کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا تغیر کے فطری عمل کے تحت اس نظام کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ نئے نظام نے اپنی بنیادیں مستحکم کرنا شروع کیں۔ اس لیے اب اہل وطن کو نوحہ خوانی کی بجائے، نئے نظام کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے اور اس نظام میں اپنی حیثیت بنانے کی فکر کرنی چاہئے نہ کہ مردہ نظام کی نوحہ گری وسینہ کوبی۔ اور یہی حکمت عملی نئے نظام میں سرخرو سر بلند کرے گی اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مزید پستی میں گرنے کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہ جائے گی۔ اردو کے یہ دانشور اور ادیب چاہتے تھے کہ قوم کے ندران کے اپنے زوال اور پسپائی کے اسباب کا ادراک پیدا ہوتا کہ اس کی روشنی میں وہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آگاہ ہوسکیں اور ان کے تدارک کی تدبیر کر سکیں۔ یہی وہ بنیادی فکری محور تھا جس پر 1857ء کے بعد کے اردو ادیبوں اور دانشوروں کی تخلیقات مرکوز ہیں۔ سرسید کی ادبی تحریریں ہوں یا آزاد، حالی اور شبلی کی شعری ونثری تخلیقات یا پھر نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسوا کی ناول نگاری ان سب میں اس فکری محور کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

غرض کہ ادب کو شعوری طور پر فکری نظام سے جوڑنے کا کام اس عہد کے ان ادیبوں اور دانشوروں نے کیا۔ ادب اب تک یا تو تفنن طبع کا ذریعہ محض تھا یا پھر منظم فکر و شعور سے عاری ایک ایسا عمل جو بیشتر لسانی وفنی جوہر کے اظہار تک موقف ومرکوز تھا۔ انفرادی جودت طبع کو شعوری طور پر اجتماعی احساس وادراک سے مربوط کرنے کا کام انہیں ادیبوں کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ انہوں نے ادب وسماج اور ادب وعصری زندگی کے مابین رشتے کی نہ صرف بازیافت کی بلکہ اس پر اصرار کیا اور ادب کو انسانی فطرت، عقلیت پسندی اور عصری حقیقت سے ہم آہنگ کیا۔ ان ادیبوں کی تخلیقات کی بدولت ادب زندگی اور معاشرت کا ترجمان اور آئینہ دار بن گیا۔ عصری ادبی منظرنامے پر سرسید کے یہ بلیغ وبے لاگ تبصرے اس وقت کے ادیبوں وشاعروں کے لیے ادبی فتوے بن گئے:

"علم ادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے اور دور دراز کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں

کے لکھنے پر منحصر ہے........فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی، مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب واخلاق کے ہیں خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ واستعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں، جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کس پیرایہ یا کنایہ واشارہ یا تشبیہ واستعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔''

پھر آگے فرماتے ہیں:

''ہماری زبان کے علم وادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں وکہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔'' ـــــ ردیف وقافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا، ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔''1

سرسید نے صرف ادبی فتوے ہی صادر نہیں کیے بلکہ خود اپنی تحریروں میں ان خصوصیات کو برتنے کی کوشش کی جن کی تلقین اس عصر کے ادیبوں کو وہ کرتے رہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا، جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی، اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''2

غرض کہ پہلی دفعہ ادب کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا۔ مقصدی وافادی ادب کو اعلا ادب قرار دیا گیا، اور جمالیت کو ذات وانفرادی چیز تصور کرنے کی بجائے اسے اجتماعی وعصری زندگی سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا گیا۔ ادب اور ادیب کی سماجی ذمہ داری اور اس کے منصب ومقام

میں اضافہ ہوا۔ اب اس کی حیثیت محض مداری یا مصاحب کی نہیں رہی بلکہ فکری و جمالیاتی رہبر ورہنما کی ہوگئی۔ سرسید کی تحریک و ترغیب کا ہی نتیجہ تھا کہ حالی نے عصری ادب کی بوطیقا "مقدمہ شعروشاعری" کی شکل میں لکھ کر اردو میں باضابطہ تنقید کی بنیاد ڈالی اور معاصر ادیبوں وشاعروں کو تخلیقی ضابطے سے آشنا کرایا، ایک ایسا ضابطہ جو ترقی یافتہ عالمی ادب کے ضابطوں سے اردو ادب کو ہم آہنگ کر سکے۔

1857 کے بعد اردو کے ادیبوں اور دانشوروں نے ادب کے دامن کو بے پناہ وسعت عطا کرنے کا کام کیا۔ وہ طرز اظہار جو عصری معنویت سے عاری اور بے وقت کی راگنی ہو کر رہ گئی تھی، یکسر متروک قرار پائی، از کار رفتہ اصناف کی گنجائشیں ختم ہوتی چلی گئیں۔ داستان، قصیدہ، روایتی مثنوی اور مرثیے یکسر ناپید ہو گئے۔ ان کی جگہ ایسی اصناف نے لے لیں جو عصری زندگی کی ترجمانی اور فکری تنظیم کے اعتبار سے عین موافقت رکھتی تھیں، مثلاً نظم، ناول، مضمون نگاری، مقالہ نگاری، سوانح، تاریخ نویسی، انشائیہ نگاری، تنقید نگاری وغیرہ کو کافی اہمیت ملی اور ان اصناف کو بے مثال فروغ حاصل ہوا۔ غزل کو بھی بہ نگاہ احسن نہیں دیکھا گیا، لیکن غزل نے نئے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کا گر سیکھا۔ فکری و لفظی دونوں سطحوں پر نئے چیلنجز کو اس نے قبول کیا اور نئے امکانات کے لیے اپنے دروازے وا کر دیے۔ اس طرح غزل نے اپنی بقا اور فروغ کا سامان مہیا کر لیا۔

1857ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی عوام پر اپنے سامراجی شکنجے کو مضبوط کرنے کے لیے اگر ایک طرف اپنے ظلم و استبداد اور معاشی استحصال کے عمل میں شدت پیدا کی تو دوسری طرف ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے ہندوستانی عوام کو مغلوب بنانے کے لیے انہیں غیر مہذب اور Native قرار دے کر ان کے ذہنوں پر اپنی تہذیبی و نسلی برتری کی مہر ثبت کرنے کی سعی بھی کی۔ تاکہ ہندوستانی عوام ان کی ہمہ پہلو برتری کے آگے نہ صرف سر تسلیم خم کر دیں بلکہ انہیں اپنا محسن بھی تصور کرنے لگیں۔ انگریزی سامراجیت کا یہ رویہ نہ صرف انسانی حقوق اور انسانی آزادی پر قدغن تھا بلکہ ہندوستان کی صدیوں پرانی تاریخ و تہذیب اور اخلاقی اقدار و روایات کے لیے زبردست چیلنج تھا۔ اس خطرے کو اس عہد کے دانشوروں اور مفکرین نے شدت سے محسوس کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کے تدارک اور تکذیب کی بھی کوشش کی۔ یوں تو مجموعی طور پر اس عہد میں تخلیق پانے والے نثری و شعری ادب میں اس تہذیبی کشمکش کی ترجمانی ملتی ہے لیکن نثر چونکہ اس عہد کا ایک اہم وسیلہ اظہار

بن کر ابھری۔ اس لیے نثری اصناف میں بالعموم اور ناول میں بالخصوص اس کشمکش کا رنگ زیادہ نمایاں اور گہرا ہے۔ اس عہد میں لکھے جانے والے بیشتر ناول اس تہذیبی کشمکش کے نہ صرف ترجمان ہیں بلکہ ان میں برملا اور بین السطور مغربی تہذیب و تمدن کی تکذیب اور اپنی تہذیبی و تاریخی روایتوں کی پاسداری کا پیغام موجود ہے۔ نذیر احمد کا ناول 'ابن الوقت' ہو یا 'توبۃ النصوح'، پنڈت رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد' ہو یا رسوا کا 'امراؤ جان ادا'، منشی سجاد حسین کا ناول 'کایا پلٹ' یا 'احمق الدین' یا شرر کے تاریخی ناول ان سبھوں کے یہاں مختلف زاویوں اور مختلف انداز سے اسی آگہی کی ترجمانی ملتی ہے۔

نذیر احمد اور سرشار نے اگر اپنے ناولوں میں عصری ابتری و بدحالی کو موضوع بنا کر ملک و قوم کو آئینہ دکھانے اور انہیں صلاح و بیداری کی جانب مائل کرنے کی سعی کی ہے تو رسوا نے زوال پذیر سیاسی و معاشرتی نظام کے خاتمے کو عین فطری عمل قرار دیا ہے کیونکہ بقول اقبال:

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

جب کہ شرر نے تاریخی حوالوں کے ذریعہ عظمت ماضی کا احساس جگا کر شکست خوردہ ذہنوں میں نفسیاتی حرارت و توانائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام ادبی کاوشیں ایک ہی فطری روش کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اردو ادیبوں اور دانشوروں کی نثری و شعری تخلیقات میں نہ صرف عصری حالات کی ترجمانی اور تنقید موجود ہے بلکہ حالات کو بدلنے کی ترغیب اور مستقبل کی تعمیر کی دعوت و پیغام بھی ہے۔ ان ادیبوں کے تعمیر کردہ ادبی و تہذیبی منظر نامے نے قومی سطح پر جو فضا تیار کی اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ کاوشیں رائیگاں نہ گئیں۔ کیونکہ انہیں کاوشوں نے آگے چل کر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی ہمہ جہت فکری بیداری اور آزادی خواہی کے لیے فضا ہموار کی۔ لہٰذا قومی بیداری اور آزادی وطن کی راہ میں چراغ روشن کرنے والے ان اردو ادیبوں اور دانشوروں کی گراں قدر خدمات کو جس قدر بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

حواشی

(۱)۔ سرسید، مقالات سرسید۔ حصہ دہم۔ ص۔ 120)

(۲)۔ سرسید، مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ حصہ دہم، ص۔ 114)

ڈاکٹر کوثر مظہری

۱۸۵۷ اور حالی کی نظمیں

مولانا الطاف حسین حالی کی گلو بند والی تصویر دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ اُن کے اندر بھی کسی طرح کی سیاسی اور سماجی اُتھل پتھل کے نقوش ہوں گے۔ چوں کہ وہ ایک اعلیٰ ذہن اور بردبار شخصیت کے حامل انسان تھے اس لیے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے ورنہ ان کی تحریروں میں اپنے زمانے کے تمام تر انقلابات کی تصویریں جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا طرزِ اظہار نثر اور شاعری دونوں میں بہت ہی بالیدہ، سدھا ہوا اور شور و غوغا سے پاک ہوتا ہے۔

حالی 1837ء یعنی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے سال ہی پیدا ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انقلاب 57ء کے لیے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی پوری تہذیبی اور اقتصادی بساط الٹ رہی تھی۔ انگریز قوم کا دست تطاول روز افزوں دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ تجارت اور تعلیم کے میدان میں فرنگی نقوش مستحکم ہوتے جا رہے تھے۔ فرنگیوں کی سیاسی چالوں نے ہندوستان کو پوری طرح شکست دے دی تھی۔ ان کو میر جعفر اور میر صادق جیسے غدارانِ وطن بھی مل گئے تھے۔ اگر اس لوٹ کھسوٹ اور سیاسی چال بازی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر غور کیا جائے تو حالی کے ذہن پر اس کا گہرا اثر پڑا تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس کا طرزِ اظہار نہایت ہی شائستہ اور نپا تلا ہوتا تھا:

سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی

چوں کہ انگریز قوم خود کو بہت ہی مہذب اور Cultured کہتی تھی اس لیے یہاں حالی نے بھی "شائستہ قوم" کا استعمال طنز کے طور پر کیا ہے۔ انھیں بے حد تکلیف پہنچتی ہے تو طرزِ اظہار میں قدرے شدت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود چیخ پکار والی آواز نہیں آتی۔

پہلی جنگ آزادی کے وقت حالی کی عمر بیس برس تھی۔ اس وقت ان کا شعور پختگی کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس جنگ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے اثرات پر کچھ اس طرح نکتہ چینی کی:

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر، اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے، نہ برگ و بار چھوڑے تونے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لُٹس ہے سمجھیں یا ہے قزاقی

ظاہر ہے تجارت اور نئی تعلیم و ترقی کی آڑ میں ہندوستانی تہذیب اور معاشیات کو کافی نقصان پہنچا، جس کی طرف حالی نے اشارہ کیا۔ حالاں کہ جب حالی سن شعور کو پہنچے تو سرسید کا تصور تعلیم و ترقی باضابطہ ایک Ideology کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سرسید جس طرح انگریزی تعلیم و تربیت اور تہذیبی ترقی کے قائل تھے اُس سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض بھی تھا لیکن حالی اس طبقے کے برخلاف سرسید کی جماعت میں شامل ہو کر یہ کہنے لگ گئے تھے ع

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالی نے ایسا کیوں کیا؟ اپنی بات اور اس سوال کی توثیق میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں:

"حالی نے مغلیہ سلطنت کی بساط اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھی تھی۔ انگریزی حکومت کو انھوں نے ناگزیر حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان، اخلاقی اور روحانی زوال کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔ ان میں حکومت کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ . چنانچہ سرسید کی طرح حالی نے بھی انگریز دوستی کو اصول قرار دیا..."

(ہندستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، ص:۳۲۶)

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ آخر حالی کے اندر وہ کون سی کمزوری تھی جس کے سبب وہ سرسید کی فکر اور [illegible] سے مقابلہ کرنے پر مجبور تھے؟ ان کی اپنی علمی کاوش و استعداد ایسی تھی کہ جس سے سرسید خود بھی متاثر تھے۔ اسی زمانے میں شبلی کی شخصیت بھی سامنے آتی ہے جو عین

1857ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ دونوں کی عمر میں بہت بڑا فرق ہے لیکن انھوں نے بہت جلد سرسید کے نظریے سے خود کو الگ کرلیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ شبلی کے اندر حالی کی بہ نسبت اجتہادی عناصر وعوامل زیادہ توانا تھے۔ حالاں کہ کسی طرح بھی حالی کے اخلاص اور سچے جذبات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ انگریز قوم کی نئی روشنی سے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو فیض اٹھانے کی تلقین بھی کیا کرتے تھے لیکن کہیں نہ کہیں ان کے اندر یہ آرزو بھی پوشیدہ تھی کہ ہندوستان کسی بھی طرح ایک آزاد ملک بن جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بہت کھل کر یا بہ بانگ دہل حصول آزادی کے نعرے بلند نہیں کر سکتے تھے۔

حالی کی آرزوئے آزادی معتدل اور سبک ہے۔ تندی اور تیزی ان کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ حالی کا ایک اقتباس پروفیسر نارنگ نے اپنی کتاب میں دیا ہے، یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ حالی کا یہ بیان سرسید کی وفات کے بعد کا ہے۔ حالی سودیشی تحریک کی تعریف میں لکھتے ہیں:

> ''اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا ہے جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کا بند کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے... اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو کہ اس کو بہت جلد کامیابی ہوئی۔''

(بحوالہ: ہندستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، ص:330)

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں میں جو ایک طرح کا اضمحلال اور قنوطی رویہ سرایت کر گیا تھا، حالی کی شاعری میں اس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اس مضمون میں ان کی صرف نظمیہ شاعری کو پیش نظر رکھا ہے۔ تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے یکسر بکھر جانے سے قومی زندگی میں یک لخت انحطاط نظر آنے لگا تھا۔ حالی ایک حساس دل کے مالک تھے، انھوں نے اپنے احساس اور فکر سے اس تہذیبی تناظر کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی۔

حالی نے 1857ء میں ایک نظم ''ننگ خدمت'' کہی تھی جو 29 بند پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اصلاحی نوعیت کی نظم ہے۔ دراصل اس میں محنت سے جی چرانے والوں اور تقدیر کا رونا رونے

والوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہ نظم معاشرے میں پھیلی کاہلی جیسی بیماری، زعم بے جا اور اپنے حسب نسب پر اترانے والوں پر ایک طرح کا طنز بھی کرتی ہے۔ اس میں عہد گزشتہ کی عظمت کو حالی نے پیش کرنے کے بعد ظلم و جبر کی آندھی اور گردش ایام کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ دو بند ملاحظہ کیجیے جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ پہلی جنگ آزادی کے بعد کی تصویر حالی نے کس طرح پیش کی ہے:

ناگہاں جور و تغلب کا اک اٹھا طوفاں
جس کے صدمے سے ہوئی زیر و زبر نظم جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں
بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جائے اماں
تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہ کھولنے دریا میں نہنگ

اب حسب اور نسب کچھ نہیں نازش کا محل
گردش دہر نے دی صورت احوال بدل
خاندانوں کی نجیبوں کے گئی ٹیک نکل
گر گئے جو ہوئے پندار کے تھے متوالے
بڑھ گئے پیشہ و مزدوری و محنت والے

غور کیجیے کہ اوپر کے دونوں بندوں میں جور و تغلب کا طوفان اٹھنا اور گردش دہر کے سبب صورت حال کا بدل جانا کس طرف اشارہ کرتا ہے؟ حالی نے اپنی اس نظم میں ایک ایسا تہذیبی تناظر خلق کیا ہے جو پہلی جنگ آزادی کے بعد کا ہے۔

حالی یہ سمجھتے تھے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنا ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں اگر جینا ہے تو آپس کے گلے شکوے مٹا کر غفلت کی نیند سے بیدار ہونا ضروری ہے، ورنہ ہماری نشانیاں تک مٹ جائیں گی۔ ان کی ایک نظم جشن قومی (ترکیب بند) میں یہی تاثر نظر آتا ہے۔ یہ شعار دیکھیے:

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کدھر ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

اس ہولناکی اور دہشت خیزی سے ہندوستان کا نقشہ بگڑ گیا تھا۔ انگریز حکومت کی بربریت اور سفاکی کو حالی نے پیش تو کیا لیکن اس کے لیے اپنے لہجے کو نہایت ہی دھیما اور شیریں ہی رکھا۔ دہلی کے اجڑنے کا ذکر غالب کے خطوط میں بھی ملتا ہے اور حالی کی شاعری میں بھی۔ اشعار ملاحظہ کیجیے جو دہلی مرحوم کا مرثیہ پیش کرتے ہیں:

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں پہ نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک، اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
جن کو زخموں کے حوادث سے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانہ ہرگز

انگریزوں نے جو قتل و غارت گری کی، اس کے لیے خود ہم نے زمین ہموار کی۔ حالی کا رشتہ پہلی جنگ آزادی سے اسی طرح قائم ہوتا ہے کہ انھوں نے قومی تنزل کے اسباب پر اور غارت گری کے بعد پیدا ہونے والے حالات پر سنجیدگی اور منطقی طور پر روشنی ڈالی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حالی کے نزدیک قوم کا تصور مسلمانوں کیلئے ہے اور ہم وطن کا تصور دوسرے تمام مذاہب کے ماننے والوں کیلئے ہے۔ قومی زوال اور انحطاط سے وہ مسلم قوم کا زوال مراد لیتے تھے۔ حالی کے سیاسی شعور کا مطالعہ کرتے ہوئے جذبی نے یک نظم پیش کی ہے اور پھر تبصرہ کیا ہے۔ پہلے نظم کا یہ حصہ دیکھیے:

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم
زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اُسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو رائے میں اپنی مذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
ہوں آدم تک جُدا سب کے جد و اب
جو واحد لاشریک اس کا خدا ہو
تو لاکھوں اس کے ہوں معبود اور رب

جذبی لکھتے ہیں:

''حالی گویا قوم کے لیے زبان، نسل اور مذہب کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسرا نظریہ جس میں یہ قید نہیں ان کے نزدیک مضحکہ خیز ہے کیوں کہ اس کی رو سے خدائے واحد ولاشریک کے ماننے والوں اور لاکھوں خداؤں کو پوجنے والے ایک دوسرے کے ہم قوم بن جاتے ہیں۔ آخری شعر میں مذہب پر جو زور ہے اس سے بہ ظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ قوم کے لفظ کا اطلاق صرف ایک ہی مذہب کے ماننے والوں پر ہو سکتا ہے۔''

(ص:162، حالی کا سیاسی شعور)

حالی کی ایک مشہور نظم حب وطن ہے۔ جس میں ایک دکھے ہوئے دل کا احساس مرتعش نظر آتا ہے۔ یہاں ماضی کی عظمت، وطن عزیز کی تعریفیں اور پھر درد بھرے لہجے میں ملتجیانہ انداز بھی کچھ ہے ملاحظہ فرمائیں اب نظم ''حب وطن'' کے یہ حصے:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو!

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

ظاہر ہے کہ اگر حالی کا ''تصورِ قوم'' تمام ہندوستانیوں کے لیے ہوتا تو وہ اپنی اس نظم میں ''ہم وطنو!'' کہہ کر مخاطب قطعی نہیں کرتے۔ آگے چل کر دانشوروں کو نشانہ بناتے ہیں:

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
سب کمالات اور ہنر ان کے
قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے

نظم اس طرح اختتام پذیر ہوتی ہے:

کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

یہ ہے وہ سیاسی، اخلاقی، ذہنی اور تہذیبی انحطاط جس کو حالی نے اپنے لیے حرزِ جاں بنا لیا تھا۔ حالی نئے شعور اور نئے سماج کی تشکیل کے وقت بھی مذہبی اور اصلاحی امور کو اپنے پیشِ نظر رکھے ہوئے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علی سردار جعفری نے ان کی عقل پسندی اور حقیقت نگاری کی داد تو دی لیکن سیاسی طور پر رجعت پرست بھی کہا (ترقی پسند ادب، ص:104) لیکن اس رجعت پرست حالی کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا موقف دیکھیے:

''تہذیب اور تاریخ کا پورا سوادِ اعظم حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا اور اس کھنڈر پر حالی بے پایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور غیرت

قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں۔ (مضمون جدید غزل، از رشید احمد صدیقی فکر ونظر 1954ص: 27 علی گڑھ)

اگر بغور دیکھا جائے تو نظم جدید کی اساس کے پیچھے بھی اسی انحطاط سے نبرد آزمائی کی نفسیات پوشیدہ تھی۔ سماجی، علمی، تہذیبی اور ادبی امور پر 1857ء کے بعد اس وقت کا ہر حساس آدمی غور وفکر کر رہا تھا۔ محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر 1867ء میں انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں لکچر دیا اور 1874ء میں نظموں پر مشتمل ایک نشست ہوئی جس میں حالی نے بھی شرکت فرمائی۔ انھوں نے بھی انگریزی طرز شاعری سے بالواسطہ اثر قبول کیا تھا لیکن بڑی سادگی اور صفائی سے مجموعہ نظم حالی کے دیباچے میں انھوں نے یہ اعتراف بھی کر لیا:

> "مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اُس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے... ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔"
>
> (دیباچہ: مجموعہ نظم حالی)

بظاہر یہ اقتباس حالی کی نئی طرز شاعری سے رغبت کو پیش کرتا ہے لیکن اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں اس جنگ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے حالات اور سرسید کے تصورات بھی بطور محرک کے کام کر رہے تھے۔ دراصل آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد یہ سب کے سب سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ ساتھ یا آس پاس رہ کر اسی اضمحلال اور انحطاط کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ حالی کبھی برطانوی حکومت کی برکتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی اس کی ناانصافیوں سے متنفر نظر آتے ہیں۔ دونوں طرح کی مثالیں حالی کی نظموں میں موجود ہیں لیکن معتد بہ حصہ انگریزی حکومت اور انگریزی جدید تعلیمات کی تعریف وتوصیف میں ہے۔ آل احمد سرور کے بقول:

> "حالی نے زمانے کی رفتار پر چلنا سکھایا تھا۔ زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا حساس دلایا تھا۔ شاعری کو انسانیت کا علم بردار بنانے کی کوشش کی تھی۔"

(نئے پرانے چراغ 1951ء، ص:348)

شاعری کو انسانیت کا علم بردار بنانے کا جو عمل ہے وہ بہت آسان نہیں۔ بدلتے ہوئے ماحول میں ایک طرح کا جو انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کو حالی اور اُن کے معاصرین ختم کرنا چاہتے تھے۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"حالی نے یہ نظمیں ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیر اثر لکھی ہیں۔"

(تنقیدی زاویے: 1951، لاہور، ص:183)

حالی کی نظموں میں "حب وطن" اور "نشاط امید" کا مطالعہ کریں یا "مدو جزر اسلام" کا، ہمیں یہ احساس ہوگا کہ سرزمین ہند پر جو زوال آمادہ قوم ہچکیاں لے رہی تھی، اُس کے سامنے ایک امید کی کرن سی پھوٹ رہی ہے۔ کہیں کہیں منظر ہولناک بھی معلوم ہوتا ہے لیکن حالی کا مقصد خوف زدہ کرنا نہیں بلکہ وہ ہمدردانہ جذبے کے ساتھ قوم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ "حب وطن" سے یہ اشعار دیکھیے جن میں ایک طرح کی سیاسی بے چینی نظر آتی ہے۔ حالی کا سیاسی شعور کس قدر بالیدہ ہے، اور ان کے اندر قوم اور اپنے وطن سے محبت کا جذبہ کتنا مستحکم ہے، ملاحظہ کیجیے:

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اس کے بعد حالی غیروں کی ٹھوکریں کھانے کے اسباب بیان کرتے ہیں:

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

"مدو جزر اسلام" سرسید کی سوچ اور فرمائش کا نتیجہ تھی۔ 1857ء کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس قوم کا ستارہ جیسے بجھ سا گیا تھا۔ نا امیدی، پشیمانی اور بے سرو سامانی

نے آگھیرا تھا۔ حالی نے ماضی کی عظمت اور حال کی شکستہ خوردگی کو پیش کیا اور پھر اخیر میں امید کی کرن دکھائی۔ اس نظم نے واقعتاً مسلمانوں کے اکھڑتے سانسوں کے زیر و بم کو درست کیا اور جہانِ تیرہ و تار میں جگنو کی سی چمک نظر آئی۔ امید نے اپنا چہرہ دکھایا:

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم
جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے
پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے
کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے
جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں اُن پہ خنداں زناں ہیں

اور اب امید کی ایک جھلک:

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آکر بڑھا تو
ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

میں یہاں ''مسدس'' کی تعریف و توصیف کر کے یا اس پر کچھ زیادہ لب کشائی کر کے آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا البتہ دو چھوٹے چھوٹے اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں:

۱- جس کے (مسدس) اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں اور ہر قومی مجلس میں پڑھا جاتا تھا۔"

(گل رعنا،ص:475)

۲- مسدس نے قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقے تک پہنچایا جہاں علی گڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔حالی کے آنسو خالص آب حیات کے چھینٹے تھے۔

(موج کوثر،شیخ محمد اکرام،1958ء،ص:126)

1857ء کا انقلاب ہندوستانیوں کے لیے ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے آگے بڑھنے کے لیے ہمت درکار تھی۔اس انقلاب کے بعد قومی روح پر افسردگی کے بادل چھا گئے تھے۔لہٰذا زعمائے قوم اور اکابرین شعروادب اپنی اپنی طرح اس مردہ قوم میں ازسرنو روح پھونکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالی بھی اس انقلاب کے After Effect کے نوحہ خواں بن گئے تھے۔سرسید اس عہد کے ایک روشن خیال نوحہ گر تھے جن کے سامنے قوم کے مستقبل کا ایک کامیاب خاکہ تھا،جس میں رنگ بھرنے کی انھوں نے پوری کوشش کی۔اس کام میں ان کے رفقا نے ان کا بھرپور ساتھ دیا—اسی جماعت میں حالی اور شبلی بھی تھے۔شکست خوردہ قوم میں جوش اور ولولہ بھرنے کے لیے اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری اور زنگ آلود ذہنوں کو صیقل کرنے کے لیے مختلف تحریکیں شروع ہوگئیں۔ 1857ء سے پہلے سیاسی نوعیت کی نظمیں کم ہی نظر آتی ہیں۔اس پہلی جنگ آزادی کے بعد حالات کچھ ایسے بن گئے کہ اردو شاعری میں ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔آزاد اور حالی کی نظم جدید کی تحریک بھی اسی قعرِ مذلت اور اضمحلال کے دلدل سے نکلنے کی ایک کوشش تھی۔محمود الرحمٰن نے بہت صحیح لکھا ہے:

"1857ء کے ناکام انقلاب اور بیسویں صدی کی سیاسی تحریک کے درمیان کی یہ عبوری شاعری ہمارے موضوع سے خارج نہیں کی جاسکتی۔اس نے ملک وملت کی عظمت کو اجاگر کر کے سیاسی شعور کا ڈول ڈالا ہے اور آزادی کے جذبے کو فروغ دیا ہے۔"

(جنگ آزادی کے اردو شعراء،محمود الرحمٰن،1968ء،ص:159 قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت،اسلام آباد،پاکستان)

حالی سرسید کی علی گڑھ تحریک میں گاہے گاہے روح پھونکتے رہے جس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے لانا تھا۔حالی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کئی اجلاسوں میں اپنی

نظمیں اہتمام سے سنائیں۔ مسلمانوں کی تعلیم، قوم کا متوسط طبقہ، جشن قومی، تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی جیسی نظمیں حالی کے افکار و تصورات پر دال ہیں۔ ان نظموں کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرسید کے تصورات سے حالی کی پوری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے اور حالی کی دوررسی کی داد دیجیے:

یہ دارالعلم سدّ راہِ آسیبِ زماں ہوگا
اسی دارالشفا میں بختِ پیر اپنا جواں ہوگا
یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سرچشمہ
اسی چشمے سے دیکھو گے تو اک دریا رواں ہوگا
یقیں ہے ٹہنیاں پھیلیں گی طوبیٰ سے سوا اس کی
ہمارے واسطے دنیا میں یہ باغ جناں ہوگا

(مسلمانوں کی تعلیم، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے چوتھے اجلاس میں 1889ء میں پڑھی گئی)

پہلی جنگ آزادی کے بعد والے پُرآشوب دور میں سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد وغیرہ جیسے اکابرین کے سبب ہی ہندستان میں تہذیبی اور مذہبی نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس انقلاب کے بعد ذہنی و فکری تموج نے جینے کا سلیقہ سکھا دیا۔ شرفا پر جب برا وقت آن پڑا اور اس سے بھی بڑھ کر جب پوری قوم اور مذہبی اقدار پر حملے ہوئے تو اجتماعی تشخص (Collective Identity) بھی مجروح ہوئی۔ لہٰذا ہر محاذ پر اصلاح اور بیداری کے نغمے سنائے جانے لگے۔ اسلامی ثقافت اور ماضی کے سرچشموں کی طرف مراجعت میں عافیت سمجھی گئی۔ حالی کو اپنی عظمت رفتہ سے ایک ایسا تناظر تشکیل دینا پڑا جو انحطاط پذیر قومی چہرے کے لیے آئینے کا کام کر سکے۔ ایسا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس سے اپنے مستقبل کی فکر دامن گیر ہوگی۔ کانٹ ویل اسمتھ نے یہ صحیح لکھا ہے کہ:

"انھوں نے مسلمانوں سے ان کی اپنی شاندار تاریخ کا واسطہ دینے میں اسلام کے ماضی کی نظریہ تعمیر نو کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ امر نہایت اہم ہے کیونکہ وہ پورے دور آئندہ میں مذہبی ترقی کے لیے بنیاد کا کام کرتا ہے۔"

(Modern Islam in India-Smith, p-38)

ایک انگریز مورخ کو اس بات کا احساس تھا کہ 1857ء کے بعد حالی نے جو "مسدس" یا

اس قسم کی دوسری نظمیں کہیں ان کا مقصد دور آئندہ میں مذہبی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کرنا تھا۔ حالاں کہ حالی بھی روایتی مذہبی رویوں سے قدرے بیزار تھے۔ وہ مذہبی معاملات میں کچھ حد تک Liberal بھی تھے۔ جذبی نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سرسید نے مذہب کو مغرب کے صنعتی دور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مغرب کی عقلیت اور سائنس کی روشنی میں اسلام کو پیش کیا۔ ... اس سلسلے میں انھوں نے صرف قرآن کو مذہب کا اصل سرچشمہ قرار دیا اور اس کی وہ تفسیر پیش کی جو مغربی اقدار کے مطابق تھی۔ ... سرسید کی تفسیر القرآن میں بعض جگہ نمایاں لغزشیں نظر آئیں پھر بھی حالی نے سرسید کی مذہبی خدمات میں اسے ایک نہایت جلیل القدر خدمت سے تعبیر کیا......"

(حالی کا سیاسی شعور، 1959ء، ص:138)

حالی نے 1857ء کے بعد کے تہذیبی، فکری، سیاسی، مذہبی، علمی اور اصلاحی شعور کو کریدا۔ اپنی قوم کے ماتم میں حالی کا کیا حال تھا اس کا اندازہ ان کے ایک مرثیہ کے اس شعر سے ہو جاتا ہے:

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

(ماخوذ از مرثیہ حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی)

حالی کی نظموں کو اور اُن کے موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے فکری کینوس پر مسلم معاشرے کی زبوں حالی اور وطنی زندگی کی افراتفری کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اخیر میں اپنے تجزیے اور اپنے ان خیالات کی توثیق میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کا یہ موقف پیش کرنا چاہتا ہوں:

"درحقیقت اردو شعر و سخن کی نشاۃ ثانیہ اور حیات نو، انھیں کی مرہون منت ہے اسی لیے حالی کو قدیم شاعری کا مصلح، جدید غزل اور نیچرل شاعری کا مجدد، قومی اور وطنی شاعری کا امام، نو رجائیت اور ترقی پسند تحریک کا علمبردار اور حکیمانہ نظم کا موجد تسلیم کیا گیا۔"

(حالی بحیثیت شاعر، 1960، ص:379)

<u>حواشی و مآخذ</u>

1۔ ہندستان کی اردو شاعری اور تحریک آزادی، گوپی چند نارنگ ص 326-330

2۔ حالی کا سیاسی شعور، جذبی ص:162

3۔ رسالہ فکر و نظر، علی گڑھ، 1954 ص:27

4۔ تنقیدی زاویے، ڈاکٹر عبادت بریلوی 1951 ص:183

5۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام 1958 ص:128

6۔ گل رعنا، ص:475

7۔ جنگ آزادی کے اردو شعرا، محمود الرحمٰن 1986 ص:159

8-Smith:Modern Islam in Indian ص:38

9۔ حالی بحیثیت شاعر، سلام سندیلوی، 1960 ص:379

10۔ ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری ص:104

تاریخی نظم کا آئینہ

تاریخ شہر خموشاں نہیں ہے، شہر آرزو ہے۔ انسانی خوابوں کی متحرک تصویر تاریخ کے ایوانوں میں سجی ہوئی ہے تاریخ کا ہی کوئی لمحہ جب شعر میں ڈھل جاتا ہے تو دونوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے' شعر میں وقار آجاتا ہے اور واقعہ مزید تابناک ہو جاتا ہے لیکن ایک بات ہے' واقعہ بھی ایسا ہو کہ وہ پھر تاریخ کے ذریعہ سے مستقبل کو آواز دے۔ اسی طرح کی آواز جیسی تیز آندھی میں پہاڑ پر سے اذان کی آواز آتی ہے جو آندھی کے گزر جانے کی خبر بھی سناتی ہے اور ایک پر سکون ماحول کی بشارت بھی دیتی ہے۔ اس لیے شاعری میں بھی تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ اپنی تمام تر غنائیہ خصوصیات کے ساتھ تال وسر کے ساتھ، ہر تان کی طرح دل ودماغ کو مسحور کرتے ہوئے اپنی گنگناہٹوں اور ترنم کے ساتھ یہ واقعات' کبھی الفاظ کی گھن گرج سے' کبھی صف جنگ میں خون برساتے ہوئے' کبھی تیغوں کی بجلیاں چمکاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور غور کیجیے رزمیہ کی یا المیہ کی جو تعریف ارسطو نے کی ہے اس میں یہی تو بتایا گیا ہے کہ:

(۱) واقعہ مہتم بالشان ہو (۲) سالم ہو (۳) زبان مزین ہو (۴) رحم وخوف اور دہشت کے جذبات کو ابھار کے ان کا تزکیہ یا کیتھارسس کرے۔

اُردو شاعری نے اس طرح کے واقعات کی تلاش کی ہے اور حسن شوقی کا فتح نامہ' نصرتی کا علی نامہ یا دوسرے شعراء کے جنگ نامے یقیناً ملتے ہیں مگر ان میں تاریخ کی عظمت نہیں ہے' یہ قصے ہیں ان میں واقعات بڑی حد تک درست ہیں لیکن سب کچھ سچ نہیں ہے۔ پھر یہ ماضی کے ایوان کی تصویریں ہیں سجی ہوئی' خوبصورت' حسین خدوخال والی تصویریں مگر یہ بولتی نہیں ہیں نہ یہ مہتم بالشان ہیں نہ ان سے کیتھارسس ہوتا ہے۔

مرثیہ کی رفعت و عظمت کا کیا کہنا! اس میں مہتم بالشان واقعہ بھی ہے، زبان بجی ہوئی بھی ہے، کیتھارسس بھی ہے لیکن ہر شہید کے حال کا مرثیہ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے اور اس میں پورا واقعہ نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے رزم نامہ انیس و دبیر ضرور تیار کیا ہے مگر وہ رزم نامے ذہین نقاد کی تحسین آفرینی کا نقش ہیں، خالق کی تخلیق نہیں لیکن ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی طویل نظم "اٹھارہ سو ستاون" اردو کا واحد رزمیہ ہے جس کا واقعہ مہتم بالشان ہے جو سالم اور مکمل ہے جس کی زبان مزین اور آراستہ ہے اور جو ہمارے جذبات کے کیتھارسس کی پوری قوت رکھتا ہے نظم کے پس منظر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد نظر آتا ہے۔ "طوفان سے پہلے" عنوان کے تحت راہی لکھتے ہیں:

پاٹھ شالے ہیں پریشان صدا دیتے ہیں
مدرسے چاک گریبان دیئے ہیں

راہی نے اس کا خیال رکھا ہے کہ ان کی ساری ہمدردیاں مجاہدوں کے ساتھ ہیں وہ عہد فرنگی سے خفا ہیں مگر وہ معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

فکر مذہب کی نہیں ہے غمِ جاگیر تو ہے

اس مصرع میں "غمِ جاگیر" کی ترکیب اس پہلو کی اضاحت کر دیتی ہے کہ اس انقلاب میں جاگیردار اپنے ذاتی مفاد کے لیے بھی شریک ہوئے تھے۔ نظم میں اختتامیہ سمیت تیرہ عنوانات ہیں۔ ہر عنوان کے تحت فضا اور ماحول کے ساتھ شعری ہیئت بدل جاتی ہے اور ہر واقعہ یا جذبہ کے لیے اس کی مناسبت سے شعری ہیئت ملتی ہے۔ مسدس کی ہیئت کے بعد ایک دم سے تیز ذہن والے مصرعے ملنے لگتے ہیں۔

کٹ رہیں عقدوں کی نکل پڑیں خیال غیرت نے فیصلہ کیا
گھروں میں گونجنے لگیں کہانیاں بہن نے بھائیوں سے تذکرہ کیا

یہ تحریک کس طرح گھر گھر پھیلی، کنول کا پھول اور روٹی مذہبی افراد کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغام رسانی کا ذریعہ بنے۔ یہ سارے پہلو بھرپور شاریت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں پھر وہ داخلی احساسات کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ واقعات کے بیان کے ساتھ جس طرح سیاسی عدم مرکزیت نے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کو بے بس کر دیا تھا وہاں بحر بدل جاتی ہے وہ یہ مصرع نادرہ کاری ہے۔ یہ مصرع پوری سیاسی تاریخ سنا دیتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کیلئے یہ کہنا:

یہ مقطع غزل عشرت شبانہ ہے

سترہ سو چونسٹھ سے اٹھارہ سو چھپن تک کے مسلسل زوال کی داستان ہے۔ اور اس دور کی دہلی کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کا التزام کرتے ہیں کہ جس جس انداز سے اس زمانے میں غزلیں کہی گئی ہیں ان کی نمائندگی ہو جائے۔ آخر میں شاعر خود کہتا ہے:

بہادر شاہ اب کچھ بھی نہیں ہے
مگر وہ اک مقدس یاد تو ہے

نظم کی لے پھر بدلتی ہے اور ایسے شعر ملتے ہیں۔ جو اس دور کی اقتصادی اور معاشی حالت کی تصویر کشی کرتی ہیں:

انگریزوں کی جیب میں جا پہنچی اپنی بدحالی تک
گیہوں کی بالی سے لے کر کانوں کی ہریالی تک

اسی طرح راہی پھر مسدس پر آجاتے ہیں۔ ''کرانت کتھا'' حالاں کہ چھ مصرعوں کی ہے لیکن اس کا لہجہ خالص عوامی شاعری کا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے گاؤں کی چوپال میں لوگ جمع ہیں، ڈھولک گمک رہی ہے اور کوئی جیالا گا رہا ہے:

سنو بھائیو! سنو بھائیو! کتھا سنو ستاون کی

راہی نے تاریخی واقعات سے صرف نظر نہیں کیا ہے پٹنہ میں وہابی تحریک کے اثرات کی نشاندہی بھی پس منظر کے اشعار میں ملتی ہے جو بے اطمینانی، تہذیبی اعتبار سے شکست خوردگی کا جو حساس عام ہندستانی کے دل میں تھا یا دہلی میں جس طرح مغل بادشاہ کی بے کسی اور بے چارگی پر اس سے عقیدت بڑھ گئی تھی ان سب کو سمیٹتے ہوئے۔ ''کرانت کتھا'' میں راہی نے فضا آفرینی میں صوتی آہنگ کے ذریعہ شعری مہارت کا ثبوت دیا ہے یہ چھ مصرعے دیکھئے:

اتر بھارت میں پورب سے پچھم تک تیاری
ڈگڈگ ڈگڈگ باجی ڈگڈگی کیا کہتا ہے مداری
فٹ آئے تو کو پھاند میں ان کی مارا ماری
کٹھ پتلی کا ناچ دیکھنے آئے گیس نر ناری

کٹھ پتلی کے ناچ کی گت پر کرانت کی گرم ہوا نکلی سنو بھائیو، سنو بھیو کتھا سنو ستاون کی

اس طرح راہی نے گویا "منظوم اسباب بغاوت ہند" پیش کیا ہے نظم آگے بڑھتی ہے تو پھر تاریخی واقعات اور بیانات کے بجائے راہی تخیل کی مدد سے اس عہد کے افراد کے داخلی احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں "اکیلا طوفان" کے تحت انھوں نے بڑا خوبصورت شعری تجزیہ کیا ہے جب تک کردار اپنے جذباتی تصادم کا شکار رہتا ہے، بحر دوسری رہتی ہے جب اس پر خارجی اثرات مرتب ہوتے ہیں تو آہنگ بدل جاتا ہے۔ یہ بند دیکھیے:

نہا کے لوٹا تو راستے میں
وہ چودھری کے مکاں پہ ٹھہرا
اداس کیوں ہو نراس کیوں ہو
کنکھار کر زہلوں نے پوچھا

وہ بحر تو وہی رکھتے ہیں صرف ارکان میں اضافہ کر دیتے ہیں، اس سے زور بھی پیدا ہوتا ہے اور آہنگ میں رزمیہ خطابت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ دیکھیے:

اداس کیوں ہوں یہ پوچھتے ہو نراش کیوں ہوں یہ پوچھتے ہو
ہماری بے غیرتی نے غیرت کے ناگ کا سر کچل دیا ہے
اداس اس لیے ہوں کہ منگل لٹے ہے دار پر اور میں یہاں ہوں
یہ اس کو غیرت کا اور خاک وطن سے الفت کا پھل ملا ہے

یہ ایک طرح سے گریز ہے وہ بحریں بدلتے ہوئے منگل پانڈے کے واقعہ کی طرف آجاتے ہیں اب وہ آزاد نظم کا سہارا لیتے ہیں اور منگل پانڈے کے واقعے نے کس طرح فوجیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا تھا اس کی بڑی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔

تو چھے مہینے کا منا
مزے میں سویا ہوا تھا
اور مسکرا رہا تھا
تم اپنے منے کو پیار کر لو
میں جا رہا ہوں تم انتظار بہار کر لو

ملک کے حالات پر بھرپور شعری تبصرہ ہے جو اُردو شاعری میں منفرد بھی ہے اور بے حد شان دار ہے عمر رسیدہ لوگوں میں کس طرح احساس بیچارگی تھا وہ دیکھئے!

جھرّیوں کے دریچے کھلے ہیں' بے بسی جھانک کر ہنس رہی ہے
بوڑھے ہاتھوں میں ہے صرف لرزش' دھندلی آنکھوں میں بیچارگی ہے

وہ دھیرے دھیرے واقعات کے سہارے تاریخ کے اس موڑ پر آجاتے ہیں جہاں میرٹھ ہے۔ جس طرح میرٹھ میں سپاہیوں کی غیرت کو للکارا گیا اور اس طرح انقلاب کی فضا ہموار ہوئی یہ سارے گوشے ابھرتے ہیں جہاں وہ کہتے ہیں:

چھاؤنی میں میرٹھ کی
لال وردیاں پہنے
بہترین فوجیں ہیں

وہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

زندگی کی راہوں میں دار و رسَن بھی ہے
بے ستوں سے ٹکرانا عشق کا چلن بھی ہے

آگے چل کر کہتے ہیں۔

آج ہو اس ارضِ میرٹھ پر ہمارا فیصلہ
طاقتیں یکساں ہیں دونوں آج یہ اچھا ہوا

اس میں کہیں بحر پھر بدلتی ہے اور راہی نے فضا اور ماحول سے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے رباعی کی بحر بھی اختیار کی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ لحاظ رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کا کارواں کہیں ٹھہرنے نہ پائے۔ اس طرح کے مصرعے دیکھتے چلئے:

اس سمت تو مجلس سے وہ دیوانے چلے
بیرک میں ادھر گیارھویں پیدل بھی اٹھے
انیسویں دستے نے بھی ہتھیار ...... لئے

مرثیے کا، خصوصاً میر انیسؔ کا جو اثر راہیؔ کے ذہنی اُفق پر تھا، جگہ جگہ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

سُنتے ہیں فرنگی کی ہے جرأت مشہور
تدبیر بڑی ان کی سیاست مشہور
اپنا بھی ہے پُر عزم شہادت مشہور

اور اسی پر عزم شہادت کا نمونہ کرنل فنس کی موت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ گیارھویں پیدل فوج نے بغاوت کردی اور ''کرانت کتھا'' پھر آگے اس طرح بڑھی:

مئی گارہ (۱۱) کے دن کو تھا میرٹھ میں سناٹا
سورج نے ہر راہ پہ دیکھا انگریزوں کا لاشا
چار دشاؤں میں میرٹھ کے تھا بس خون خرابا
چوہے کی بل تک میں گھسنے کو انگریز نے سوچا
ساری اکڑفوں نکل گئی اک دن میں بس انگریزن کی
سنو بھیّو! سنو بھائیو! کتھا سنو ستاون کی

اس حصے میں راہی نے میرٹھ میں بغاوت کی ناکامی کی حالت بھی لکھی ہے۔ شیمن سنگھ کی شہادت کا ذکر بھی کیا ہے اور اسی حصے میں یہ معرکہ خیز شعر بھی ملتا ہے:

شاعر سے پوچھو تو شاعر بتلائے گا حالت
کیا جانے تاریخ بیچاری آخر کیا ہے صداقت

اور وہ صداقت یہ ہے کہ نفرت کو دبایا تو جا سکتا ہے لیکن نفرت مرتی نہیں ہے۔ راہی نے انگریزوں کے خلاف اس پھیلی ہوئی نفرت کو مکمل تاریخی تفصیل کے ساتھ میرٹھ سے دلّی منتقل کیا ہے۔ ''چاندنی چوک میں چراغاں ہے'' کے عنوان کے تحت انھوں نے دلّی پر قبضۂ ہندوستان کی تاریخ بیان کردی ہے، کہتے ہیں:

ساقی پلا شراب کے یہ روز عید ہے

تاریخ سے اس کی سند بھی ملتی ہے۔ وہ پھر ''کرانت کتھا'' کے عنوان کے تحت پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں اور کنور سنگھ کے بغاوت میں شامل ہونے کی طرف اشارہ کرکے ایک دستہ ''گنگا کے اُبلتے پانی پر'' کے عنوان کے تحت کانپور کے حالات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسدس اور مربع کی ہیئت میں تمام واقعات کی تاریخی تفصیل بیان کی ہے تاریخی کردار مثلاً نانا

صاحب عظیم اللہ، نیا سنگھ، شمس الدین وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا واقعہ نظم کر کے وہ اس نفسیاتی نکتہ کو نمایاں کرتے ہیں کہ جب اشتعال ہوتا ہے تو پھر دبا ہوا انسان بھی بہت کچھ کر ڈالتا ہے:

ایسی گورا شاہی کی اب ایسی کی تیسی اور
اب ہتھیار اٹھائیں ساتھی اب ہتھیار اُٹھائیں

کس طرح مذہب نے اس تحریک کو مثبت انداز میں حوصلہ بخش تھا اس کے کچھ پہلو ان اشعار میں دیکھئے:

جنوں کا سورج جو سر پہ آیا
تو گھٹ گئے مصلحت کے سائے
کھلی تھی آنکھیں جو مندروں کی
حرم کے در بھی تھے کسمسائے

اور یہاں سے بحر بدل جاتی ہے، کہتے ہیں۔

پھر وہی داستان دُہراؤ
زور بازوئے حیدری لاؤ
ذہنِ فاروق کی چمک دکھلاؤ
نورِ اسلام کی دمک دکھلاؤ
یوں کھنچے رام کی کمان ہو
کرشن کا چکر بن کے وار کرو
ہر طرف پھر وہی اُجالا ہو
پھر سے بھارت کا بول بالا ہو

وہ پہلے بھی بھوجپوری کو استعمال کر چکے ہیں، یہاں بھی ایک نمونہ دیکھ لیجئے

گوری تو ہرے گال پہ ماسا چلی گنزوا ساتا
چھم چھم چھم چھم باجے پا ایلیا
بورا نل بالال چنریا دیکھ پون کی چال
گوری ہو کہ گورا بھیا آج سبھی بے حال

راہی نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ معروف شخصیتوں کے ساتھ ان بے نام افراد کو بھی خراج عقیدت پیش کریں جو موت سے بے جھجک گفتگو کر گئے اور لڑے صرف اپنے وطن کے لیے۔

کان پور میں جس طرح انگریزوں پر برا وقت پڑا تھا اس کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے راہی نے مجاہدین آزادی کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے کہ انگریزوں کے سلسلے میں ان کے پاس جب بھی ہمدردی کا کوئی جذبہ اُبھرتا تھا تو اُن کھیتوں کی یاد آتی تھی جنھیں انگریزوں نے برباد کر دیا تھا، اُن گھروں کی یاد آتی تھا جو اب نہیں رہ گئے، اپنی گنگا کی لہریں بے چین کرتی تھیں کہ انھیں ٹیمز کی موجیں نگل گئی تھیں اور اس وجہ سے مجاہدین نے یہ طے کیا کہ یہ فرنگی ہیں، ان کی سزا موت ہے، مارلو مارلو لیکن راہی نے انھیں بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے جو بے گناہ مارے گئے، کہتے ہیں:

فرنگیوں کی جنگ ایک یادگار جنگ ہے
مرا قلم بھی ان کی جراتوں پہ دنگ ہے

فتح مندیوں اور کامرانیوں کی داستان دھیرے دھیرے تدبر کے وسط سے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور "میں ہوں اب ایک لفظ" کے عنوان کے تحت وہ بہادر شاہ ظفر کی نفسیات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں جسے اپنے قلعۂ احمر سے پیار تھا، دیوانِ خاص کے سنگِ مرمر سے الفت تھی اس نے خوابِ حکمت بھی دیکھا تھا لیکن وہ ہار گیا اور اب دادا کی قبر پر بیٹھا ہوا بخت خاں کے اصرار پہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ اسے جھرّیوں کی زنجیر نے جکڑ رکھا ہے اور وہ بخت خاں کے ساتھ نہیں جاتا، بخت خاں چلا جاتا ہے وہ اس عنوان کو ان اشعار پر ختم کرتے ہیں اور مقطع ظفر کا ہی ہے:

اب لطف ہجر میں، نہ کشش انتظار میں
دل پر خزاں نے زخم لگایا بہار میں
کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

راہی نے یہ نظم "بھوان سیٹی ٹوریم" سے واپسی کے بعد الٰہ آباد ہی میں لکھی تھی، وہ لکھتے جاتے تھے، ان کے احباب سنتے جاتے تھے داد و تحسین کے پھول نچھاور کرتے تھے۔ یہ نظم ۱۹۵۷ء میں تمام ہو گئی تھی۔ کتابت و طباعت میں بہت وقت لگ گیا، تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل یہ نظم کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی مگر اب کمیاب ہے۔

ان پر میر انیسؔ اور ان کے مراثی کا بہت گہرا اور دیرپا اثر تھا۔ یہ اثر ان کے مشہور ہندی ناول ''آدھا گاؤں'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے بلکہ ان کی ہر تخلیق میں یہ اثرات نمایاں ہیں۔ یہاں تک کہ مہا بھارت کے بیشتر مکالموں کو اگر اُردو میں ڈھال دیا جائے تو وہ میر انیسؔ کا مصرع بن جائیں گے۔ یہ انقلاب آفریں نظم لکھتے ہوئے راہیؔ جب دتی کے المیے سے گزر کر اور وہاں کے کرداروں سے رحم، خوف اور دہشت کی سوغات لے کر جھانسی کی طرف مڑتے ہیں تو میر انیسؔ کے مشہور مرثیے کے مطلع سے آغاز کرتے ہیں:

اے قلم منزلِ دشوار کو آساں کر دے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریباً سو بند میں راہیؔ نے مرثیہ شناسی کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مہارانی لچھمی بائی کو معرکۂ شہادت کا زندۂ جاوید کردار بنا دیا ہے۔ راہیؔ چہرہ، سراپا، رجز، آمد، جنگ تمام اجزائے مرثیہ کی پاسداری کرتے ہیں، یہاں تک کہ صنائع بھی اسی طرح نظر آتی ہے جس طرح مراثی انیسؔ میں! یہ بند دیکھیے:

گھن گرج بن کے ہر اک جسم کے جم جائیں قدم
جے کہے خاک میں ملتا ہے فرنگی کا حشم
عین آئیں تو اُڑتے ہوئے نصرت کے علم
قاف ہوں قلعۂ جھانسی کی طرح مستحکم
بے کہے لکشمی ؒ بائی کی بغاوت ہم ہیں
تے کہے تانتیا توپے کی روایت ہم ہیں

یہ مشکل صنعت ہے مگر راہیؔ نے مرثیے کی روایات کی پاسداری کی ہے اور اس کا انداز بالکل اس سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے بے شمار بند ایسے ہیں جو لاجواب ہیں اور کتاں کی طرح ہیں کہ لفظوں کی چاندنی اگر پڑے گی تو وہ شکستہ ہو جائیں گے۔ اس لیے ان پر تبصرہ کیے بغیر کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں:

دیکھیے چڑھتا ہوا سورج وہ ہے انداز خرام
قد موزوں کو کریں تیز بے بھی جھک جھک کے سلام
خم ابرو کی تمنا میں رہے ماہ تمام
آنکھیں کہتی ہیں کہ سیکھے کوئی اندازِ کلام

ہونٹ کہتے ہیں کہ بس اس سے زیادہ ہیں نہ کم
لاکھ مبہم ہیں مگر ایک بنی بات ہیں ہم
کٹ کے گر جائیں، یہ قبضہ کو نہ چھوڑیں ہیں وہ ہاتھ
پنجۂ شیر غضب ناک کو توڑیں ، ہیں وہ ہاتھ
جوش میں آئیں تو آہن کو نچوڑیں ہیں وہ ہاتھ
چاہیں جس راہ پہ تاریخ کو موڑیں ہیں وہ ہاتھ
ساتھ والوں میں بھی پھر جوشِ شہادت بڑھ جائے
ہاتھ ایسے ہوں تو سردار کی قیمت بڑھ جائے

اسی طرح جنگ کے مناظر کے سلسلے میں یہ بند ملاحظہ ہوں۔

غل ہوا رانی نے تلوار نکالی ، بھاگو
وار رانی کا ہے جائے گا نہ خالی، بھاگو
ٹالنے سے نہ اجل جائے گی ٹالی ، بھاگو
سب سے کہتی ہے یہ بہتی ہوئی لالی، بھاگو
یاد اس تیغ کو ہیں مارنے کے کتنے ہاتھ
ایک مکتب میں رہی ہے ملک الموت کے ساتھ
ایک بھگدڑ صفِ اعدا میں پڑی ہے ہر سو
موت بن کر صفِ دشمن میں کھڑی ہے ہر سو
مردہ پتّی کی طرح لاش جھڑی ہے ہر سو
ایک تلوار ہے پر آنکھ لڑی ہے ہر سو
روک بکتر نہیں، اور ڈھال کوئی آڑ نہیں
لکشمی بائی کی تلوار ہے کھلواڑ نہیں

اب رجز کے سلسلے کے بند ملاحظہ ہوں:

دُور سے لکشمی بائی کی پڑی اس پہ نگاہ
یہ بھی ڈر تھ کہیں ٹکرائے نہ بھارت کی سپاہ

پھن نکالے ہوئے آیا جو نظر مار سیاہ
ایسے میں اس کو نظر آئی فقط ایک ہی راہ
بولی! میدان میں میں اپنے قدم دھرتی ہوں
سندھیا آ، میں مبارز طلبی کرتی ہوں
دیکھ لوں تجھ کو، تو پھر یہ تیرا لشکر دیکھوں
لڑنا آتا ہے کہ نہیں بیٹھا ہے افسر دیکھوں
آ، کہ میں بھی تیری تلوار کا جوہر دیکھوں
تو بڑھے گا، کہ تجھے میں وہیں آکر دیکھوں
کیوں ہے چپ چاپ کھڑا راہ کے پتھر کی طرح
کیا یہ تلوار لگا رکھی ہے زیور کی طرح

پورے رجز میں کوئی بند ایسا نہیں ہے جسے ترک کیا جائے لیکن بعض اشعار تو وہ ابدی تاثیر رکھتے ہیں جو آفاقی شاعری کی اعلیٰ ترین میراث ہیں، کچھ شعر درج کیے جاتے ہیں:

دیکھ دُنیا تجھے دُھتکار رہی ہے بُزدل
ایک عورت تجھے للکار رہی ہے بزدل
بھاگنا بعد میں کر لے ذرا یہ چھوٹا سا کام
پہلے تاریخ کو بتلا دے کہ کیا ہے ترا نام
کیسا سردار ہے کیوں موت سے گھبراتا ہے
یہ ہے میدان ارے اس سمت کہاں جاتا ہے

لچھمی بائی کی لڑائی میں راہی نے مرثیہ سے ملی روایت کو شعری شخصیت کا جز بنا کے پیش کیا ہے:

داہنے بائیں جو آیا وہ قلم ہو کے گرا
سر اٹھائے ہوئے جو آیا وہ خم ہو کے گرا
جسم جو بھی گرا پورا نہیں، کم ہو کے گرا[91]

لچھمی بائی کی جنگ میں انہماک کی کیفیت صرف ان دو مصرعوں میں سامنے آجاتی ہے:

زخم سر باندھ سکے اتنی اسے فرصت ہی نہیں

دیکھ لے مڑ کے کبھی اس کی یہ عادت ہی نہیں

جو لوگ جھنی بائی کے ساتھ تھے اس کے سلسلے میں ان کی وفاداریوں کی متحرک تصویر اس شعر میں نظر آتی ہے۔

ایک اک کر کے ادا کر گئے سب حق وفا
اب فرنگیوں کے مجمع میں ہے رانی تنہا

بین یا شہادت کے منظر میں اگر راہی اور جھنی بائی کا نام نہ لکھا جائے تو بلا شبہ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیے سے اخذ کیا گیا ہے۔ خاتمہ سے پہلے یہ یادگار شعر

ہم نہ اس کو کبھی یوں جاں سے گزرنے دیں گے
ہم اسے یاد بنائیں گے نہ مرنے دیں گے

ندرت، اثر آفرینی، منجھی اور رچی ہوئی زبان رزمیہ کے تمام اصولوں کی پابندی اور ایک بے نظیر شاہ کار یہ حصہ ہے جو سو بند پر مشتمل ہے۔ راہی کو تشہیر کے وہ ذرائع نہیں ملے جو سبھدرا کماری چوہان کو ملے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی عوام نے بھی اٹھارہ سو ستاون سے وہ وابستگی نہیں رکھی جس کی وہ تاریخ مستحق تھی ورنہ اس کا ایک ایک بند گھر کی چار دیواری میں گونجتا، میدان جنگ میں سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا، اس کی للکار سے ایک نئی نفسیات کی تخلیق ہوتی۔

اس کے بعد یہ طویل المیہ منظوم ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں آٹھ کردار ہیں، نواں کردار نہیں ہے بلکہ اجتماعی نغمہ ہے جس کا عنوان ہے گومتی اور اس میں ایسے لازوال مصرعے بھی ملتے ہیں:

(۱) اپنے ہی خون میں ڈوب کر سُرخ رو
(۲) اب بھی زندہ ہے یہ مرکز رنگ و بو
(۳) لکھنؤ نار بھی ہے نور بھی ہے
(۴) لکھنؤ گل بھی دامنِ نم بھی
(۵) لکھنؤ سوز بھی ہے نغمہ بھی

ان مصرعوں کے ذریعہ سے راہی لکھنؤ کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں اور ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں جو متحرک ہیں۔ راہی نے مثنوی کی مخصوص بحر استعمال کی ہے اس لیے کہ یہاں بیان غنائی ہونے کے باوجود غم انگیز بھی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی درد بھرا، یاس سے

لبریز عزم و حوصلہ حضرت محل کے مکالمہ میں ہے، کہتی ہیں:

گو یہ صدمہ اٹھا رہی ہوں میں
یہ قسم کھا کے جا رہی ہوں میں
قید خانے میں مر نہیں سکتی
صلح گوروں سے کر نہیں سکتی

یہاں یہ احساس، یوں پیدا کرتا ہے کہ جنگ ہاری جا چکی ہے مگر یہ حوصلہ ہے کہ لڑائی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ گومتی نے اسے یہی نصیحت دی ہے۔

زندگی کا فریب کھانا مت
سر کٹا دینا سر جھکانا مت

اس طرح پورے رزمیہ کا اختتام ''کتھا سنو ستاون کی'' پر ہوتا ہے۔ اردو شاعری ہی میں نہیں بلکہ یہاں تک کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ عالمی شاعری میں کسی بھی زبان میں ایسی کوئی نظم نہیں ہے جس میں ہیئت کے اتنے تجربے ہوں اور ہر تاریخی واقعہ اپنی صداقت اور اپنی جزئیات کے ساتھ بھرپور شعری آہنگ کے ساتھ ابھرتا ہو۔ ہندوستان نے اس زبردست جدوجہد کے نوے برس بعد آزادی حاصل کر لی۔ آج اگر ہندوستان کو اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش، اپنی رزمیہ میراث کی جستجو ہے، تاریخ کے شہر خموشاں کو شہر آرزو بنانے کا حوصلہ ہے تو ایسے ہی ادبی کارنامے ہندوستان کو مشترکہ ہیروز دے سکیں گے:

آرزو ڈھال بھی تھی آرزو تلوار بھی تھی
آرزو دار بھی تھی آرزو دلدار بھی تھی

اسی شہر آرزو سے شاعر آواز دیتا ہے:

میری آواز پہ آواز دے اے ارضِ وطن
وادیٔ گنگ و جمن میرے خیالوں کے وطن
دیکھ وہ صبح ہوئی پھوٹ رہی ہے وہ کرن
سن مرے پیروں کی چاپ اور مرے دل کی دھڑکن
جاگ! دیوانوں کے دامن کی ہوا لایا ہوں
تحفۂ خونِ شہیدانِ وفا لایا ہوں

حواشی و مآخذ

1۔ منگل پانڈے تھا ہم سب سے بڑا دیوانہ رے۔
2۔ طراز ظہیری۔ ظہیر دہلوی
3۔ سولہ رمضان کو 11 رمئی تھی اور 13، 14 دن میں دلی پر مکمل تسلط ہو گیا تھا۔
4۔ ایک توپ کا نام جسے "کڑک بجلی" بھی کہتے تھے۔ غوث خاں کو یہ توپ بہت عزیز تھی۔
5۔ ان کی اُردو کی نمبر دیکھنے کے بعد انھیں لکشمی کے بجائے لچھمی بائی لکھا جائے گا۔
6۔ طوالت سے بچنے کے لیے پورا بند نہیں لکھا گیا ہے۔

اوّلین جنگ آزادی اور اردو شاعری

ممبئی کے عالمی شہرت یافتہ سائنسی اور تہذیبی ادارے نہرو سینٹر میں منعقدہ "میوزیکل کنسرٹ" کے لیے لکھے گئے اس بیانیہ Narration میں جو محقق و شاعر جناب شمیم طارق کے زور قلم کا نتیجہ ہے، خطابت کا رنگ غالب ہے۔ یہ اس شو کی ضرورت تھی۔ اس میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ مہینوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں مگر چونکہ یک ہی شعر الگ الگ نسخوں اور بیاضوں میں الگ الگ طرح بھی لکھا ہوا ہے اس سے ممکن ہے کوئی شعر بالکل اسی طرح نہ نقل ہوا ہو جس طرح شاعر نے کہا تھا لیکن اس میں بیانیہ کے، جو مضمون کی شکل میں شائع ہو رہا ہے مجموعی تاثر پر فرق نہیں پڑتا۔ اس کو 1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں اردو شاعروں کی جذباتی شمولیت کا دستاویز بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بیانیہ کی ترتیب میں ایک خاص انداز اختیار کرنے کا مقصد یہ باور کراتا ہے کہ جفائے محبوب کی مذمت کی صورت میں اردو شاعروں کا جذبۂ حریت 1857ء کے بہت پہلے سے آزادی کا صور پھونک رہا تھا اور 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بھی وہ جذبۂ حریت سرد نہیں پڑا اور 1947ء میں بالآخر یہی جذبۂ حریت ملک کی آزادی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا

احسن ثنیٰ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہ رو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذت صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
آ کے مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار

کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت تیرے جذبوں کے نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دلِ بسمل میں ہے

بہار آئی ہے شورش ہے جنونِ فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر رکھنا تو مرے جیب و گریباں کی
بھلا جذباتِ الفت بھی کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی
وہ گلشن جو کبھی آزاد تھا گزرے زمانے میں
میں ہوں شاخِ شکستہ یاں اسی اجڑے گلستاں کی
نہیں تم سے شکایت ہم سفیرانِ چمن مجھ کو
مری تقدیر میں ہی قفس تھا اور قید زنداں کی
زمیں دشمن زماں دشمن جو اپنے تھے پرائے ہیں
سنو گے داستاں کیا تم مرے حالِ پریشاں کی
بکھیڑے اور جھگڑے سب مٹا کر ایک ہو جاؤ
عبث تفریق ہے تم میں یہ ہندو اور مسلماں کی
سبھی سامانِ عشرت تھے مزے سے اپنی کٹتی تھی
وطن کے عشق نے ہم کو ہوا کھلوائی زنداں کی
بحمد اللہ چمک اٹھا ستارا میری قسمت کا
کہ تقلید حقیقی کی عطا شاہ شہیداں کی

ادھر خوف خزاں ہے آشیاں کا غم ادھر دل کو
ہمیں یکساں ہے تفریح چمن اور قید زنداں کی

ابھی آپ نے جو دو غزلیں سماعت کیں (ملاحظہ فرمائیں)۔ ان میں پہلی غزل بسمل عظیم آبادی کی تھی، جو عظیم مجاہد آزادی ور انقلابی رام پرساد بسمل پڑھا کرتے تھے۔ دوسری غزل اشفاق اللہ خاں کی تھی جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے ہنستے ہنستے پھانسی کے پھندے کو گلے کا ہار بنالیا تھا۔ ان دونوں غزلوں میں آزادی کے لیے مر مٹنے کے جذبے کا اظہار ہے۔ وطن سے محبت کی تڑپ ہے۔ دیش بھگتی کی وہ شان ہے جو قوموں کو قربانی کی تحریک دلاتی ہے۔ یہ دونوں غزلیں جنگ آزادی کی اس تڑپ کو پیش کرتی ہیں جو ہمارے قومی رہنماؤں اور ان سے تحریک لینے والے عام لوگوں کے دلوں میں موجزن تھی۔ یہ نظمیں، یہ گیت، وطن کی محبت میں سرشار ہو کر روح سے نکلے ہوئے یہ نغمے ہماری پوری قوم کا، ملک کا، اردو زبان کا اہم ترین سرمایہ ہیں۔ ان کو ہم جب بھی پڑھتے ہیں ہمارے دلوں میں ملک کی تعمیر کا جذبہ جاگ جاتا ہے۔ سورماؤں کی قربانیاں یاد آجاتی ہیں۔ یہ دونوں غزلیں اُردو میں ہیں۔ اُردو میں ایسی اور بھی نظمیں، غزلیں اور گیت ہیں جن میں ہماری اولین جنگ آزادی یعنی 1857ء کے انقلاب کی آواز اور کیفیت محفوظ ہے۔

ہندوستان میں بہت سی بولیاں اور زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں ادب اور شعر تخلیق کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی زبان کا ادب دوسری زبان کے شعر و ادب سے کم نہیں ہے۔ سب کی اپنی اپنی شان ہے، الگ الگ خوبیاں ہیں اور ہر زبان کے شعر و ادب نے 1857ء کے واقعات کے اثرات قبول کیے۔ اور نہ صرف اثرات قبول کیے بلکہ 1857ء سے پہلے کہے گئے ایسے شعروں کی پذیرائی کی جن سے عوام میں انگریزوں سے نفرت اور جنگ آزادی میں شرکت کا حوصلہ پیدا ہوا۔

اردو نے سب سے زیادہ اثرات اس لیے قبول کیے کہ وہ دلّی کی زبان ہونے کے سبب پورے ملک کی رابطے کی زبان تھی، قلعۂ معلّیٰ کی زبان تھی۔ میرٹھ سے مرشد آباد تک کے اس علاقے کی زبان تھی جہاں جنگ آزادی بڑی شدت سے لڑی جا رہی تھی۔ یہ بہادر

شاہ ظفر کی زبان تھی، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی زبان تھی جو استاذ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاذ مقرر کیے گئے تھے۔

اردو زبان وادب کی شعری روایت 1857ء کے بہت پہلے سے جابر وظالم حکمرانوں اور بدیسی حملہ آوروں کی مذمت کرنے میں اپنی ایک خاص شان اور شناخت پیدا کر چکی تھی۔ خان آرزو فرخ سیر کے ملازم تھے۔ ان کا انتقال 1757ء میں یعنی 1857ء سے سو سال پہلے ہو چکا تھا ان کے ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری نے جفائے محبوب کی مذمت کے نام پر حکمرانوں اور حملہ آوروں کی مذمت کا حوصلہ اور سلیقہ بہت پہلے حاصل کر لیا تھا۔

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دُکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

مرزا مظہر جانِ جاناں صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے 1871ء میں شہادت پائی۔ ان کے مکتوبات میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کا بھی ذکر ہے اور روہیل کھنڈ کے سیاسی مسائل پر تبصرے بھی۔ کئی اشعار تو ایسے ہیں کہ اشاروں کی نقاب سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے کہ ان میں سیاسی واقعات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی وہ غزل پیش کی جاسکتی ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کو غلامی کا عہد قرار دے کر اس عہد میں سانس لینے اور زندگی گزارنے کی تمنا کا اظہار کیا ہے جو آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو۔ مطلع ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

میر و مصحفی کی شاعری میں بھی ان شاعروں کے عہد کے سیاسی سماجی حالات پر تبصرے اور تاریخی واقعات کے حوالے موجود ہیں۔ انھوں نے درد میں ڈوب کر ہی یہ شعر کہا ہوگا جو سننے والوں کو بھی درد سے معمور کر دیتا ہے۔ یہ شعر صرف ایک شعر نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک مکمل باب ہے:

دلّی کی ویرانی کا تو مذکور کیا
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

جابر حکمرانوں اور حملہ آوروں سے نبرد آزمائی کی اس شعری روایت کے پس منظر میں یہ پوچھنا فطرت کے عین مطابق ہے کہ 1857ء کے واقعات نے بہادر شاہ ظفر اور غالب کی

شاعری کو کس طرح متاثر کیا یا 1857ء کی جنگ آزادی کا مشاہدہ کرنے والے شاعروں کی شاعری کے رنگ و آہنگ کو کس طرح دوسرے اردو شاعروں کی شاعری کے رنگ و آہنگ سے مختلف قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کی تلاش کے دوران عجیب و غریب حقیقتیں اور مثالیں سامنے آتی ہیں۔ یہ باعث تعجب بھی نہیں کیونکہ مورخین بھی 1857ء کی جنگ آزادی کے بارے میں متضاد بیانات دیتے رہے ہیں۔ اس کو شروع شروع بلکہ 100 سال تک غدر، بغاوت، شورش کہا جاتا رہا لیکن اب مطلع صاف ہو رہا ہے۔ اس حقیقت پر اصرار بڑھ رہا ہے کہ 1857ء میں جو ہوا وہ غدر، شورش یا بغاوت نہیں تھی، عوامی جنگ تھی، آزادی کی لڑائی تھی۔ ملک کو آزاد کرانے کی تڑپ نے سپاہیوں، دستکاروں، کسانوں اور عام لوگوں کو فرنگی حکمرانوں کے خلاف صف آراء کر دیا تھا۔

اردو شعر و ادب میں بھی شروع شروع میں اس کی صحیح تصویر کشی نہیں ہوئی۔ 1857ء میں کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ اس کو بیشتر تخلیق کاروں نے قہر الٰہی، فریب تقدیر، آسماں کی چشم بد، اعمال بد کی سزا اور انقلاب زمانہ کا نام دیا اور اس کا ماتم کرتے رہے۔ بہتوں نے سپاہیوں کی بغاوت کی مذمت کی۔ شاعروں کی بڑی تعداد کا انداز فکر یہی تھا کہ سپاہیوں کی بغاوت کی وجہ سے ان پر اور دلّی پر مصیبت آئی۔ اس دور کے ایک شاعر قاضی فضل حسین افسردہ نے یہی بات اپنی ایک مناجات میں کہی ہے۔ آیئے سنتے ہیں (ملاحظہ فرمائیں) ان کی مناجات کے دو شعر:

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی
چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی
فوج کیا آئی قیامت آگئی

افسردہ کے یہ اشعار اس حقیقت کا ثبوت تو ہیں ہی کہ جنگ آزادی کی حقیقت، اور وسعت کو اس وقت نہیں سمجھا گیا لیکن اس سے ایک حقیقت اور سامنے آتی ہے کہ سپاہیوں نے میرٹھ سے آکر دلّی شہر میں جو رویہ اختیار کیا اس کا وہاں کے عوام پر برا اثر پڑا۔ استاد ذوق کے ایک شاگرد تشنہ دہلوی نے اسی زمانے میں ''شہر آشوب'' کے عنوان سے ایک مسدس لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

تلنگوں، پوربیوں، سپاہیوں جیسے الفاظ عام طور سے ان مسلح فوجیوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو میرٹھ سے چلے تھے یا میرٹھ سے دلّی آنے والوں کے شریک کار ہو گئے تھے۔ ان کے طرز عمل کی شکایت زیادہ تر شاعروں نے کی ہے لیکن ان کی شکایت صرف سپاہیوں سے نہیں ہے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ شہر پر نازل ہونے والی آفت کے لیے قلعہ اور اہل قلعہ کو ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ غلام دستگیر مبین نے تمام مصیبتوں کو بداعمالیوں اور گناہوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آزردہ کے مسدس میں انگریزوں کے مظالم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ 'اعمالوں' کی اصطلاح بھی بہت وسیع ہے اور اس کو عام طور سے شاعروں نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ کنور بشن پرساد فرحت کے مخمس میں دوسروں کے مقابلے "شہر آشوب" کے عناصر زیادہ نمایاں ہیں۔ غریبی، بیکاری کے ساتھ انھوں نے ہنرمندوں اور پیشہ وروں کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے اور اس طبقے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حال سے خوار ہے
کوئی بے کسی میں اداس ہے کوئی رنج کے تہہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانے میں وہ الم سے زار و نزار ہے
کوئی قلق سے ہے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

1857ء کے بارے میں اب جو بات عام طور سے تسلیم کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس سال عوامی مزاحمت کے سبب ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ختم ہوا۔ عظیم تر ہندوستان برطانوی تاج کے زیر نگیں آیا اور ایک طرح سے انہیں واقعات نے ملک میں ایسی فضا تیار کی کہ ملک کو آزاد کرانے کی تحریکیں مختلف شکلوں میں اور مختلف سطحوں پر شروع ہوئیں اور ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1947ء کو ہمارا ملک آزاد ہو گیا۔

مغل حکومت 1857ء سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ ان کی برائے نام حکومت کا دائرہ جو دلّی سے پالم تک سمٹ گیا تھا یا اس کی جو علامتی حیثیت رہ گئی تھی 1857ء کے بعد وہ بھی

باقی نہیں رہی۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر کے جلا وطن کر دیے گئے۔ بہادر شاہ سے بہت سے ایسے اشعار منسوب ہیں جو ان کے نہیں ہیں۔ لیکن وہ شاعر تھے ان کے ایک دو نہیں پانچ دیوان میں سے چار دیوان موجود ہیں۔ پانچویں دیوان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ لیکن ان کے پہلے دواوین میں جو اشعار ہیں ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کیلئے اگرچہ بڑے سے بڑے القاب استعمال کیے جا رہے تھے مگر وہ خود کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔ انھیں احساس تھا کہ ملک ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے ان کی بادشاہت نام کی ہے اور ان کے انتقال کے بعد لال قلعہ سے بھی ان کی اولاد کو باہر نکال دیا جائے گا۔ آیئے سنتے ہیں (دیکھیں) ان کے وہ اشعار جو 1857ء سے بہت پہلے کے ہیں مگر یہ یاد دلاتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کو غلامی کے جڑوں کے ملک میں دور دور تک پیوست ہو جانے کا احساس بہت پہلے ہی ہو چکا تھا اور وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے:

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنانا تھا مجھے
کاش خاک در جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دل صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلف مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائق صحبت تو مجھے
قابل جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغ در میخانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر

ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

انھیں اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ ان کے ارد گرد انگریزوں کا ہی نہیں ان کے اپنوں میں سے بھی ایسے لوگوں کا ہالہ ہے جو وقت کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔

کبھی بن سنور کے جو آگئے، تو بہار حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے، وہ نیا شگوفہ کھلا گئے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل، کوئی کیوں کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے
مرے پاس آتے تھے دمبدم، وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم، کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے
جو ملاتے تھے مرے منھ سے منھ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انھیں پہ تھا، وہ سبھی غروروں کو ڈھا گئے

بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ کبھی یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہ شاعر ہی نہیں تھے۔ کبھی یہ مشہور کر دیا گیا کہ ان کے وہ اشعار جن میں رنج و غم ہے یا 1857ء کے واقعات کا حوالہ ہے۔ بے کسی کا ماتم ہے وہ دوسروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ صرف ان کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں لیکن تحقیق کرنے والوں نے ان الزامات کی تردید کی ہے۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اپنے تحقیقی مضمون میں واضح کیا ہے کہ:

> "ظفر کے کلام میں خالص جذبات، شاعرانہ احساس، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور ایک درد مندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کل کا کل ظفر کا ہے۔"

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ 1857ء کے بعد ظفر نے جو اشعار کہے، وہ سب محفوظ نہیں رہ سکے۔ ان میں دوسروں کے مصرعے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ مصرعوں میں توارد بھی ہوا ہے لیکن اس سے اس بات کی تردید نہیں ہوتی کہ ظفر کے کلام کا اپنا تاثر ہے اور اس

تاثر میں 1857ء کے واقعات نے اضافہ کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ غزل۔ اس میں ایک دو مصرعوں کے بارے میں دوسرے شعراء کے دعوے ہو سکتے ہیں مگر مکمل غزل ظفر کی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے انتخاب کلام بہادر شاہ ظفر میں اس غزل کو شامل کیا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں، میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے جس میں وہ مبتلا کر دیے گئے تھے۔ اس میں صرف ایک شخص کی بے بسی پر نہیں، ایک پورے عہد اور نظام کی بے بسی پر آنسو بہایا گیا ہے۔ ایک طرح سے پیشین گوئی کی گئی ہے کہ آنے والے دن اور زیادہ خراب ہوں گے:

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائدار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہہ دو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

غالب عظیم ترین شاعر تھے۔ وہ 1857ء میں زندہ تھے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہنگامے کے دوران وہ دروازہ بند کر کے روزنامچہ لکھ رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔ وہ خاندان مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر تو بہت پہلے سے متعین ہو چکے تھے لیکن ان کی شاعری میں 1857ء شعری تجربہ نہیں بن سکا ہے۔ بعد کے لوگوں نے ان کے بہت سے شعروں کے بارے میں کہانیاں گڑھی ہیں مگر وہ تمام شعر 1857ء سے کافی پہلے لکھے جا چکے تھے۔ 1857ء کے بعد وہ 21 برس زندہ رہے لیکن اس مدت میں ان کی توجہ زیادہ تر نثر پر رہی۔ غالب نے کلب علی خاں کے نام 10 ستمبر 1866ء کے اپنے خط میں خود لکھا ہے کہ:

"بعد غدر، ذوق شعر باطل اور دل افسردہ ..دو تین غزلیں فارسی ہندی لکھی ہیں۔"

1857ء سے متعلق غالب کے یہاں ایک شعر اور ایک 9 شعری قطعے کے علاوہ کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ 2 فروری 1859ء کو میر مہدی مجروح کے نام خط میں انھوں نے ایک شعر لکھا تھا جو پہلے کا کہا ہوا تھا

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

ایک 9 شعری قطعہ بھی انھوں نے 1858ء میں ہی علاء الدین احمد خاں علائی کے نام لکھا تھا:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے اب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک

آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

1857ء کے بعد غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں ہی کئی بار شائع ہوا لیکن اس قطعہ کو کسی دیوان میں جگہ نہیں ملی۔ یہ قطعہ ان کے انتقال کے بعد 1869ء میں ''اُردوئے معلّیٰ'' کے ذریعہ پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔ 1869ء غالب کا شعری تجربہ کیوں نہیں بن سکا؟ اس کی بہت سی تاویلیں ہوسکتی ہیں مگر ایسے اشعار نہیں پیش کیے جاسکتے جو 1857ء کے واقعات کا حوالہ ہوں۔ ہاں غالب کے کہے ہوئے 1857ء سے پہلے کے ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں انسان دوستی ہے۔ آزادی کا پیغام ہے۔ ظلم سے نفرت کا اعلان ہے۔ یہ قطعہ تو صرف دہلی کی تباہی کا مرثیہ ہے۔ اجڑی ہوئی دہلی کا آئینہ ہے۔

اسی دور کے ایک شاعر منیر شکوہ آبادی تھے جن پر ایک طوائف نواب جان کے قتل کی سازش کرنے کا مقدمہ چلا تھا اور وہ کالے پانی بھیج دیے گئے تھے۔ کالے پانی یعنی انڈمان بھیجے جانے سے پہلے منیر کو باندہ میں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ باندہ کی قید سے کالے پانی تک کی تکلیفوں کو انھوں نے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کو 1857ء کے واقعات کا مکمل حوالہ کہا جاسکتا ہے۔ فرنگیوں کے دورِ حکومت میں گرفتاری سے قید و جلاوطنی تک ایک ہندوستانی کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا ان اشعار میں وہ سب بیان کردیا گیا ہے:

کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر

تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غایط کی جگہ بستر کے پاس
تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی
سخت دانہ، دانۂ انجیر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک
کٹ گئی قید ستم تقدیر سے
یہ بھی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے "خانۂ زنجیر سے"

1277ھ

1857ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک عہد کا خاتمہ اور دوسرے عہد کا آغاز تھا۔ ہمارے شاعروں نے اس جنگ آزادی کا جب بھی ذکر کیا ہے اداسی اور افسردگی سے کیا ہے۔ مولانا حالیؔ نے جو غالبؔ کے شاگرد اور سوانح نگار ہیں دلّی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ایک پورے عہد کا مرثیہ ہے، 1857ء میں ہونے والی علم و ہنر کی تباہی کا مرثیہ ہے۔ اہل علم کی ناقدری کا مرثیہ ہے۔ آیئے سنتے ہیں دلّی کا مرثیہ حالی کی زبان میں:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی
ہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

اردو کے دوسرے شاعروں نے بھی 1857ء کے واقعات کے پس منظر میں دتّی کا مرثیہ لکھا تھا لیکن جیسا کہ حالی نے اپنے مقطع میں کہا ہے ان کا مقصد رونا رلانا نہیں تھا۔ وہ 1857ء کی لائی ہوئی تباہی کا حال بیان کر کے ملک وقوم کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تحریک دلانا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش کامیاب ہوئی۔ ان کی کوششوں، قربانیوں اور دعاؤں سے ہندوستانیوں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہوا۔ جو محبت کو غفلت وخود فراموشی کا سبب سمجھتے تھے وہ محبت کو ہی نسل نو کی تربیت کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ اختر شیرانی کو اردو شاعری کا کیٹس کہا گیا ہے۔ انھوں نے سلمٰی، ریحانہ، پروین اور عذرا...... نہ جانے کتنی لڑکیوں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ وہ محبت کے لیے دنیا سے کنارہ کشی پر آمادہ تھے اور آواز دیا کرتے تھے کہ:

اے عشق کہیں لے چل
نفرت گہہ عالم سے لعنت گہہ ہستی سے

لیکن جب ان کے کان میں یہ آواز پڑی کہ 1857ء میں ملک کی آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی جو کامیاب نہیں ہوئی تو ان کے دل سے آواز نکلی کہ جو جنگ ہمارے بزرگ نہیں جیت سکے وہ جنگ ہماری اولاد اور ہندوستان کی آنے والی نسل لڑے گی اور جیتے گی۔ آزادی کی یہی امنگ اور نئی نسل سے وابستہ امید نے ان کا شعری لب ولہجہ بدل دیا اور نظم کہلوائی:

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہوگا
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گلفشاں ہوگا
مسرت کا سماں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے
یہ اس شیدائے ملت باپ کا پرجوش بیٹا ہے
ابھی سے عالم طفلی کا ہر انداز کہتا ہے

وطن کا پاسباں ہوگا
میرا ننھا جواں ہوگا
ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا
ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کارزار اس کا
ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا
وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا
وطن کے دشمنوں کو کنج تربت میں سلائے گا
وہ اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا
غرور خانداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا
سر میدان جس دم اس کو دشمن گھیرتے ہوں گے
بجائے خوں رگوں میں اس کے شعلے تیرتے ہوں گے
سب اس کے حملہ شیرانہ سے منہ پھیرتے ہوں گے
تہہ و بالا جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

اولین جنگ آزادی برائے ہند یعنی انقلاب 1857 کی ایک سو پچاسویں برسی پر ہم تمام ہندوستانی سلام کرتے ہیں ان قومی رہنماؤں کو جنھوں نے ہمیں سامراجی انگریزوں سے نجات دلانے کیلئے جدوجہد کی اور ہم کو آزادی کی دولت عطا کی۔ اس عظیم موقع پر ہم بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم ملک و قوم کی آزادی کی حفاظت کے لیے تادم مرگ تیار ہیں اور تیار رہیں گے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم سب سے اچھے ملک کے سب سے اچھے شہری ہیں بقول شاعر مشرق علامہ اقبال:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

انقلاب ستاون کی تاریخ نویسی

1857 تاریخ عالم کا ایک ایسا سنگ میل ہے جس نے نوآبادیاتی نظام کے ایوانوں میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی جس کا اثر نہ صرف اس وقت دکھائی دیا بلکہ اسے برسوں سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ یہ ایسی جنگ تھی جس نے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا اور سامراجیت کے خلاف ایسی مہم چھیڑی کہ تاریخ نگار آج بھی اس پر سر دھنتے ہیں۔ چونکہ یہ جنگ Taiping (China) اور Boxer (China) کی بغاوت سے خاصی مختلف تھی اس لئے تاریخ نگاروں میں اسکو لے کر شدید اختلاف ہے کہ آیا اس واقعے کو بغاوت کا نام دیا جائے، انقلاب کہہ جائے یا غدر یا پھر اسے جدوجہد جنگ آزادی کہا جائے۔ اسے زمینداروں کا ایک حربہ کہا جائے جو جاگیردارانہ نظام کی بقا کے لئے تھا یا یہ ایک عوامی جنگ تھی یا محض ایک بلوہ جو نوآبادیاتی نظام میں مخالفت ایک جز ہوا کرتا تھا۔ ہندوستانی آزادی کے پہلے اور بعد کی تاریخ نگاری میں 1857 کو لے کر کافی اختلاف ہے کیونکہ محکوم ہندوستان کے مورخ کو وہ ہزاروں دستاویز میسر نہیں تھے جو موجودہ مورخوں کو ہیں اسی وجہ سے 1947 سے قبل اور اس کے بعد کی تاریخ نگاری میں ہمیں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ایسے میں سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ 1857 کا واقعہ محض ایک فوجی بغاوت ہے یا کہ ملک گیر سطح کی جدوجہد جس کا ذکر انگلستان کے نامور سیاستداں بنجامن ڈیزرائیلی نے بھی کیا تھا اور بغاوت کے تقریباً دو ماہ بعد اس مسئلے کو ہاؤس آف کامنس میں اٹھایا تھا۔ اسی سال نامور دانشور کارل مارکس نے نیو یارک ڈیلی ٹریبون میں سلسلہ وار مضامین لکھ کر اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ایک National Charachter ہے جسے سامراجیت کے خلاف ایک نئے دور کا آغاز کہنا چاہئے اس کے برعکس سامراجی مورخ اور برطانیہ کے حمایتی Chroniclers کے مطابق 1857 کمپنی بہادر اور اس کے سپاہیوں کے درمیان محض اختلاف کی عکاسی کرتا ہے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ نظریہ بالکل ہی لچر سا ہے اور منطق کے برعکس بھی۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں بنگال آرمی کے ایک لاکھ

اٹھائیس ہزار سپاہی باغی ہو گئے تھے اور ملک کا تقریباً 40 فیصد حصہ بغاوت کے حصار میں آ گیا تھا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا ایسے میں اس جدو جہد کو ہم صرف ایک غدر یا تصادم کا نام دے دیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اس سلسلہ میں J.W.Kaye جس نے History of the Sepoy War کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی ہے اور مندرجہ بالا نظریئے کا حمایتی ہے۔ بہر کیف کے نے اس سلسلے میں ایک اہم کام انجام دیا جس کی وجہ سے 1857 کے سلسلے میں بحث کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ چل نکلا جس پر تمام مورخین خامہ فرسائی کرتے نہیں تھکتے کہ اس واقعے کو کس نام سے یاد کیا جائے، بہر حال اس واقعے کی کیا تاریخی اہمیت ہے اس پر بحث ہونا بھی چاہئے کہ نہیں اس پر پھر سے توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں جب ہم ہندوستان کے تاریخ نویسوں کی طرف رخ کرتے ہیں تو سر سید احمد خان کا نام نمایاں نظر آتا ہے جو کہ اس پورے واقعے کے چشم دید گواہ تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے دو پرچہ اسباب بغاوت ہند اور سرکشی ضلع بجنور کے نام سے لکھ کر شائع کئے تھے، کچھ حد تک یہاں انھوں نے بھی سامراجی نظریہ کی پیروی کی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسوں کی تنقید بھی کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستانیوں کے اندر بارود کا ایک ڈھیر جمع ہو رہا تھا جس میں آگ لگانے کا کام باغی سپاہیوں نے کر دیا سر سید کو ہم اس نظریہ کیلئے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ انہوں نے کم از کم اتنی جرأت تو دکھائی کہ انگریزوں کو بھی مورد الزام ٹھہرایا ہر چند کے نرم لہجہ میں ہی کیونکہ وہ جس ظلم و تشدد کے ماحول میں اپنی باتیں کہہ رہے تھے یہ بھی قابل داد بات ہے کہ ایسے میں جب کہ ہر طرف قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو، سبھی اپنی جان بچانے کی فراق میں ہوں انگریزوں کی تنقید کرنا بڑے جگر کی بات تھی بقول شاعر ۔

یہ وہ جادہ ہے جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گزرے

ایسا اس لئے بھی ہے کہ غالب جیسا ذہین و فطین شخص ایسے ماحول میں دستنبو تصنیف کرتا ہے نہ کہ اسباب بغاوت ہند۔ اس ضمن میں Savarkar نے The Indian war of independence of 1857 نام سے ایک اہم کتاب لکھی اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی انقلاب 1857 محض ایک واقعہ یا حادثہ نہیں تھا بلکہ اسے ہندوستان سے برٹش سامراج کا قلع قمع کرنے کی یک منظم کوشش کہا جائے گا۔ جس میں ہندوستان کے تمام طبقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ کہتا ہے کہ بغاوت کی اصلی وجہ مذہبی جذبات تھے، وہ محبت تھی جو عوام اپنے دھرم اور اپنے وطن سے کرتے تھے اس کتاب میں

ساور کر نے کئی جگہوں پر تخیل کے سہارے تاریخ نگاری کرنے کی کوشش کی ہے اور بلا ثبوت اپنی بات منوانی چاہی ہے جو ایک تاریخ نگار کو زیب نہیں دیتا لیکن اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے آئندہ نسلوں میں جستجو پیدا کر دی، اس بات کو جاننے کی خواہش جگا دی کہ 1857 کے واقعے کو کس زاویہ اور نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ جب 1857 میں اس واقعے کی صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی تو اس موقع پر دو کتابیں منظر عام پر آئیں جس میں 1857 سے متعلق اب تک کے رائج نظریوں کو بخوبی چیلنج کیا گیا تھا۔ ان میں پہلی کتاب نامور مورخ آر سی مجمدار کی تھی جس کا عنوان تھا The Sepoy Mutiy and Revolt of1857 اس کتاب میں یہ بات ثابت کرنے کی گئی کوشش کی ہے کہ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس میں انھیں کہیں بھی وطن پرستی کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر یک شخص چاہے وہ جس عہدے پر تھا اپنے مفاد کی سلامتی کیلئے لڑ رہا تھا یا خاموش تھا۔ چنانچہ اس انقلاب کا کوئی قومی کردار نہیں ہے۔ آر سی مجمدار ان مجاہدوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "They were sweating under grievous njury done to them by the British.There is no evidence to suggest that they were inspired by patriotism."

مجمدار اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ 1857 کا واقعہ موت کا پسینہ تھا جو کہ عہد وسطی کی زمیندارانہ، جاگیردارانہ اور رجعت پسند کے عناصر کے ماتھے پر آیا تھا اس لئے اس جنگ کو ہم ایک نئے دور کا نقیب ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ نہرو بھی Discovery of India میں کچھ اسی طرح کے خیال لکھتے ہیں کہ:

> "It was a feudal outburst, heated by the feudal chiefs and there followers and added by the widespread anti foreign sentiments "

وہ اور آگے جا کر کہتے ہیں کہ:

> "It was essentially a Feudel uprising, though there were some Nationalistic elements in it."

اس موضوع پر اپنے عہد کے نامور مورخ سریندر ناتھ سین نے بھی ایک نہایت معروف کتاب لکھی جس کا عنوان "Eighteen Fifty Seven" ہے۔ اس میں وہ بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ 1857 کا آغاز مذہبی امور میں دخل دینا اور سور اور گائے کی چربی کا استعمال کروانا ایک بڑی وجہ تھی جو کہ بعد میں انقلاب کی شکل اختیار کر گیا سریندر ناتھ سین کے اس خیال سے اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایس بی چودھری نے بھی "Civil Rebellion in The Indian Mutinies (1857-1859)"

میں کم و بیش یہی نظریہ اختیار کیا ہے اس انقلاب میں عام شہری اور فوجی برابر کے شریک رہے تھے جس کا ثبوت غدر کی چنگاری کا آگ میں تبدیل ہونا اور گاؤں اور دیہاتوں کو اپنی چپیٹ میں لے لینا ہے اس واقعہ کی صد سالہ یادگار کے موقعے پر 1957 میں پی سی جوشی نے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں انقلاب 57 سے متعلق مختلف النوع موضوع مضامیں شامل ہیں اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں وہ کہتے ہیں:

"The central aim of the 1857-58 insurrection was to destroy the British state in India and establish an Indian state in its place. If this does not make this uprising a National Revolt, what else will?"

رودرانگشو مکھرجی نے "Avadh in Revolt 1857-58. A study in Popular Resistance" میں 1857 کے واقعے کو مختلف وجوہات کا ردعمل بتایا ہے چونکہ بنگال آرمی کا خاصا حصہ اودھ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے اودھ کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا ہے۔ وہ اپنے خصوصی مطالعے کے بعد اس انجام پر پہنچتے ہیں کہ بغاوت ایک شدید انکار تھا ایک ایسے نظام حکومت کے خلاف جس میں ہندوستانیوں کے جذبات، احساسات اور اخلاقی، سماجی، ثقافتی قدروں کا کوئی احترام نہیں تھا یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ 2003 میں مشہور مورخ رجت کانت رے نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے۔

The Felt Community Commonality and Mentality before the Emergence of Indian Nationalism

کتاب میں وہ مذہب کے پہلو پر کافی روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کس طرح مذہب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا وہ بہادر شاہ ظفر کے اس اشتہار کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہیں جس میں انگریزوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ دشمن قرار دیا گیا ہے اور ان کو اس ملک سے باہر نکال دینے کی بات کہی گئی ہے تاکہ ہندوؤں کا دھرم اور مسلمانوں کا دین سلامت رہ سکے۔

1857 کی ڈیڑھ سو سالہ برسی کے موقعے پر بھی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں ہیں جن میں سے صرف دو کا ذکر یہاں کرنا چاہوں گا پہلی کتاب ایک انگریز مورخ اور افسانہ نگار ولیم ڈیل ریمپل کی لکھی ہوئی ہے جس کا عنوان The Last Mughal ہے اس کتاب میں انھوں نے بہت سارے ماخذ کو بطور حوالہ استعمال کیا ہے لیکن کئی ماخذ تک یا تو انکی رسائی نہیں ہوسکی ہے یہ پھر وہ اسے اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں جس سے غلط فہمی کو راہ پا گئی ہے ایسا اس لئے کہ انھوں نے اس

کتاب کیلئے بیشتر مواد اردو اور فارسی کے دستاویزات سے لئے ہیں جسے وہ شاید اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ایسا شاید اس لئے بھی ہے کہ یہ سارے دستاویزات خط شکستہ میں ہیں ان کا کہنا ہے کہ تقریباً بیس ہزار دستاویز ابھی بھی نیشنل آرکائیوز میں Mutiny Papers کے عنوان سے محفوظ ہیں جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے یہاں ہم صرف انکی تصنیف کے حوالے سے بات کریں گے گو کہ ہم ان ماخذ کی تشریح و تعبیر اور ان کے حوالوں اور خیالات سے پوری طرح متفق نہیں ہیں لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انھوں نے اپنی تصنیف کے ذریعے 1857 کی تاریخ نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور یہ یاد دہانی کرانے کی کوشش کی ہے کہ 1857 سے متعلق تاریخ نگاری اُردو فارسی دستاویزات پر دسترس حاصل کئے بغیر ادھوری رہ جائے گی جس پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں ایک اہم کتاب 1857Re-Visited کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے مصنف پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی ہیں۔ انھوں نے بھی اس نکتہ کی طرف بارہا اشارہ کیا ہے کہ اردو فارسی دستاویزات 1857 سے متعلق کوئی بھی تجزیہ ناکافی اور بے معنی ہوگا اسی مقصد کے تحت انھوں نے فارسی کے ایک سو پچاس دستاویزات کو ادارتی مراحل سے گزار کر اس پر حاشیہ تحریر کر کے شائع کیا ہے۔ وہ کئی مقام پر ولیم ڈیلرمپل سے اختلاف رائے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ باغیوں نے ہمیشہ مذہبی رواداری کا ثبوت دیا اور ان پر لگائے گئے یہ الزام غلط ہیں کہ انھوں نے مجنونانہ حرکتیں کیں۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے شروع شروع میں کس طرح باغیوں کی قیادت سے انکار کیا اور اس وقت تک ان کی رہنمائی قبول نہیں کی جب تک کہ وہ مجبور نہیں کر دیے گئے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ 1857 سے متعلق جتنے مکتبہ فکر ہیں اتنے ہی باتیں ہیں کوئی حق پرستی دکھاتا ہے تو کوئی بددیانتی کا ثبوت دیتا ہے۔ لیکن ایسے میں چاہے وہ سامراجی نظریہ کا حامل تاریخ نگار ہو یا قومی نظریہ کا یا پھر اس کا تعلق مارکسی مکتبہ فکر سے ہو یا وہ Subalterns فکر اور سمجھ رکھتا ہو بھی تاریخ نگار اس عظیم واقعے کو الگ الگ انداز سے سمجھتے اور پرکھتے ہیں، تشریح و تعبیر کی کوشش کرتے ہیں لیکن اتنی بات تو یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ انیسویں صدی کے نوآبادیاتی نظام کی مخالفت میں کی گئی تحریکوں میں سے کوئی تحریک اس کرۂ ارض پر 1857 کے مقابلے کی نہیں ہوئی۔

اسے اب ہم بغاوت، غدر یا پھر جنگ آزادی چاہے جو بھی نام دیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی

لئے Stanley Wolpert جو ایک جدید تاریخ نگار ہے اس نے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ 1857 کا واقعہ پہلی جنگ آزادی سے کچھ کم ہے لیکن یہ سپاہی بغاوت سے کچھ زیادہ ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مورخ، ادیب اور صحافی نے اسے اپنے اپنے انداز سے پیش کرنے کی سعی کی ہے اسی کے پیش نظر یہاں ہم ان تصنیفات و تالیفات کی فہرست درج کر رہے ہیں جو 1857 کی تاریخ نویسی کے سلسلے میں اہمیت کی حامل ہیں تاکہ اس انقلاب کا قاری ان کتابوں کے حوالے سے انقلاب ستاون کے مختلف نکات و جہات سے آشنا ہو سکے۔

1 Chaudhary, S B, Civil Rebellion in the Indian mutinies (Calcutta 1957)
2 Chaudhary, S B, Theories of the Indian Mutiny (Calcutta, 1965)
3 Chaudhary S B English Historical Studies on the Indian Mutiny (Calcutta 1979)
4 Embree A.T, (edt) 1857 in India (Boston, 1963)
5 Eric Stokes , The peasant Armed , The Indian Revolt of 1857 (Oxford , 1986)
6 Hibbert C , The Great Mutiny (London, 1905)
7 Hussain, S M Azizuddin , 1857 Revisited (New Delhi-2007
8 Joshi P C ,(ed) Rebellion-1857 A Symposium (Delhi 1957)
9 Kaye Sir J W History of the Sepoy war in India 3 vols (London 1867)
10 Kaye Sir J W History of Indian Mutiny 6 vols (London 1888)
11 Majumdar R.C The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857 (Calcutta 1957)
12 Maleson G B History of Indian Mutiny 3 vols (London 1878)
13 Mukerjee Rudrangshu , Awadh in Revolt, 1857-1858 A Study of Popular Resistance (Delhi 1984)
14 Savarkar V D The Indian war of Independence of 1857 (London 1909)
15 Sen S N Eighteen Fifty Seven (New Delhi 1957)
16 Syed Ahmad Khan Sarkashi Zillah Bijnor, Ed Sharafat Hussain Mirza 2nd ed (Bijnor 1992)
17 Syed Ahmad Khan The Causes of Indian Revolt (Karachi 2000)
18 William Dalrymple The last Mughal, The fall of Dynasty Delhi 1857 (New delhi 2006)

مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہاں بہت سارے مباحث سے اجتناب برتا جا رہا ہے اور یوں بھی ایک مضمون میں ان سبھی تصنیفات پر رائے پیش کرنا یا انھیں تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنا مشکل ہے۔ آخیر میں عظیم سیاسی مفکر اور فلسفی کارل مارکس کا خیال درج کرنا درست معلوم ہوتا ہے جس نے 1857 کی تاریخی حیثیت کو New York Daily Tribune میں کچھ اسطرح بیان کیا ہے:

"It was not a Military Mutiney but a National Revolt"

ہم بھی اس کی اس بات سے متفق ہیں کہ یہ بغاوت ایک قومی جدوجہد تھی جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے اور یہ اسی بغاوت کا فیض تھا کہ انگریزوں کو دیر سویر اس ملک سے باہر جانا پڑا۔

ذرائع ترسیل و ابلاغ اور ۱۸۵۷

"..........اس بات کو لوگ نہ تو جانتے اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں اخباروں نے خبر شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا"۔

لارڈ کیننگ 13 رجون 1857

ڈاکٹر حسن مثنیٰ

اوّلین جدوجہد آزادی اور اردو پریس

پریس اور اخبار کی اہمیت کو ہر زمانے میں تمام ذی فہم اور باشعور انسانوں نے نہ صرف سمجھا اور سراہا ہے بلکہ اسے سماج کا آئینہ دار اور آئینہ ساز دونوں ہی قرار دیا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس ادارے نے سماجی بیداری لانے میں کس قدر اہم کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اسے Fourth Estate کا درجہ حاصل ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اس کے ذریعہ ہی مختلف صحافی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، تمام قید و بند سے آزاد ہو کر صحافی مختلف النوع موضوعات پر بیباکانہ اپنی رائے دیتے ہیں تاکہ سماج مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے آشنا ہو جائے۔ ایک ایماندار صحافی کا یہی کام بھی ہے کہ وہ اپنی تلاش و جستجو کو زبان قلم سے رقم کر کے اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائے تاکہ لوگ اس سے تحریک لے سکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔ کچھ اسی قسم کا خیال جان سلک بکنگھم نے بھی ظاہر کیا تھا۔ بکنگھم نے 2 اکتوبر 1818 کو اپنے اخبار "کلکتہ جرنل" کا اجراء کیا اور اخبار کے سرورق پر صحافتی آزادی سے متعلق اپنے نظریہ یوں پیش کیا:

> "اخبار نویس کا فرض ہے کہ وہ عائدین سلطنت کو ان کے فرائض یاد دلاتا رہے اور ان کے فروگذاشتوں پر شدت سے فہمائش کرتا رہے اور تلخ حقائق کو منظر عام پر لاتا رہے۔ کیوں کہ اگر کوئی قانون ساز دارہ موجود نہ ہو تو حکومت غیر ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر صحافتی تنقید ضروری ہے۔"1

صحافتی آزادی سے متعلق یہ نظریہ بالکل درست ہے کیونکہ اخبارات میں رائے عامہ تیار کرنے کی عجیب قوت ہوتی ہے، یہی طاقت جو عوام کی ذہنیت تبدیل کر کے کسی خاص نہج پر ڈال دیتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ جدوجہد آزادی ہند کی پہلی جنگ 1857 کے وقت بھی دیکھنے کو ملا جب

اخباروں نے اپنی خبروں اور رپورٹوں سے مجاہدین آزادی کے اندر جوش و جذبہ پیدا کیا، ان میں سامراجی ذہن رکھنے والے انگریزوں سے لڑنے کی قوت پیدا کی۔ اس سے قبل کہ ہم اردو کے اخبارات کا ذکر کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی قلعی کھولتے چلیں کہ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اخبارات یا ہندوستانی پریس کو آزادی ملے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اخبارات کو آزادی مل گئی تو اس سے انگریز مخالف رائے عامہ ہموار ہوگی، ان کی ظلم و زیادتی کا پردہ فاش ہوگا، جو ان کی حکومت کی چولیں ہلا دے گا۔ انہیں یہ بخوبی معلوم تھا کہ انہوں نے نانا صاحب کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا ہے، انہوں نے کنور سنگھ کے ساتھ کیا زیادتی کی ہے، جھانسی کی رانی کو کون کون سی اذیتیں دی ہیں، راؤ صاحب کے ساتھ کس قسم کا فراڈ کیا ہے اور وہ اودھ کی سلطنت پر کس طرح قابض ہوئے ہیں یا پھر ملک کے مختلف علاقوں کے زمینداروں پر کس طرح زیادتیاں کی گئی ہیں۔ اپنے اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے کئی قانون بھی بنائے تھے لیکن حق کی آواز کب دبنے والی تھی اسے تو ایک دن بلند ہونا ہی تھا جو ہو کر رہا اور پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ اس ضمن میں ایک انگریز James Augistus Hicky نے ہی اخبارات کی رہنمائی کی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ ان کے اخبار ہکی گزٹ کا مقصد لارڈ ولزلی کی مخالفت کرنا تھا نہ کہ ہماری جنگ آزادی میں ہاتھ بٹانا۔ بہرحال انگریز اخبارات کی طاقت سے کس قدر خوف زدہ تھے اس کا اندازہ سر تامس منرو (Sir Thomes Munro) کے اس بیان سے ظاہر ہو جائے گا۔ دیکھیں یہ جملے جس میں وہ ہندوستانی اخبارات کو اس کا جائز حق نہ دینے پر مصر ہے:

"ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔ آزاد اخبار کا پہلا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ ملک کو بدیسی حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔ اگر یوروپین اور ہندوستانی اخباروں کو آزادی دی گئی تو اس کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔"[۱۲]

تامس منرو کا یہ خیال صدفی صد درست تھا کیوں کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ہکی گزٹ (1780) کی اشاعت سے ہی ہندوستانی اخبار نویسی کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے جس کی بنیاد ہی مخالفت پر رکھی گئی تھی۔ یہاں یہ باور کرانا ضروری ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اخبارات سنسر شپ سے آزاد تھے یعنی اس سلسلے میں کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ ہکی گزٹ کی اشاعت کے 14 برسوں بعد اخبارات پر مختلف پابندیاں لگانے کی خاطر حکومت نے غور کرنا شروع کیا لیکن اس درمیان 1794 میں انڈیا ہیرالڈ جس کے ایڈیٹر مسٹر فریزر تھے۔ جنوری 1795 میں مدراس گزٹ جس کے ایڈیٹر مسٹر ولیم سن تھے، 1790 میں بمبئی گزٹ اور کلکتہ سے بنگال ہرکارہ جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر میکلین تھے اس کے علاوہ کلکتہ سے ہی 1799 میں اشیاٹک مرر (ہفتہ وار) جیسے انگریزی اخبارات شائع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ان سبھی اخبارات نے اپنی حریت پسندانہ فطرت کا کچھ ایسا ثبوت دیا کہ ویلزلی نے ایک حکم صادر کیا کہ ان اخبارات کے ایڈیٹروں کو ان کے کام سے باز رکھا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان کو نہ روکا گیا تو اس کے نہایت مضر اثرات ہوں گے۔ اس نے اپنی شاطرانہ چال کا ثبوت دیتے ہوئے مخالفت کرنے والوں کو یوروپ روانہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ان اخبارات کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ اپنے کام سے باز آجائیں دیکھیں ویلزلی کا یہ جملہ جس میں اخبارات کی مخالفت کرنے کا غضب کا جذبہ دکھائی ہے وہ کہتا ہے کہ:

''ایڈیٹروں کی قوم کے لیے میں جلد ایک قانون بنانے والا ہوں''۔

اس نے اپنی ذہنیت کا ثبوت دیا اور 1799 میں ایک قانون بنایا جس سے اخبارات کی آزادی پر قدغن لگائی گئی اور انگریز حکمرانوں نے اس قانون کو بڑی بے رحمی سے بطور ہتھیار استعمال کیا۔ یہاں ہم اس قانون کی چند اہم شقیں درج کرتے ہیں تاکہ آئندہ اخبارات پر ہونے والے مظالم کا اندازہ ہو سکے۔

(1) ہر اخبار کا ایڈیٹر اور مالک اپنے پتہ سے حکومت اور سکریٹری کو مطلع کرے۔

(2) اخبار کے آخری صفحہ پر ناشر اور پرنٹر کا نام شائع کیا جائے۔

(3) حکومت کا سکریٹری یا کوئی افسر جس کو اس کام کے لیے مقرر کیا جائے جب تک اخبار کے پروف کا معائنہ نہ کر لے اس وقت تک اخبار نہ چھاپا جائے۔

(4) اتوار کے دن کوئی اخبار شائع نہ کیا جائے۔

(5) ان قاعدوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کو یورپ بھیج دیا جائے۔

اس قانون میں سب سے اہم دفعہ نمبر (3) تھی جسے ہم سنسر محکمہ کا بانی محکمہ قرار دے سکتے ہیں۔ سینسر کا محکمہ قائم کیے جانے کے بعد کچھ ایسی چالیں چلی گئیں کہ کسی حریت پسند اخبار کی ایک نہ چلی در کئی بار بلکہ بار بار ایسے مواقع آئے جب حق کی آواز بلند کرنے کیلئے انہیں سزائے شر سے دوچار ہونا پڑا۔ جن میں ضمانت کا ضبط کیا جانا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا جانا تو معمولی سزا تھی حد تو یہ ہے کہ اس کی پاداش میں ہمارے جیالے اور بے باک صحافی شہید تک کیے گئے۔

انگریزوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ صحافت اور سامراجیت میں ازلی دشمنی ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ہندوستان میں جس طرز حکومت کو پروان چڑھانے میں لگے ہیں آزاد اخبار نویسی سے اس پر آنچ آئے گی کیوں کہ یہ دریا کے ایسے دو کنارے ہیں جو کبھی مل نہیں سکتے۔ ظلم و زیادتی کا یہ دور 1835 تک جاری رہا لیکن کہا جاتا ہے کہ ظلم کی ٹہنی صدا پھلتی نہیں۔ آخر کو 1835 میں مٹکاف کو اس قانون کو منسوخ کرنا پڑا۔ قانون منسوخ ہوتے ہی ہندوستانی اخبارات نے کھل کر لکھنا شروع کیا لیکن ایک بار پھر اینگلو انڈین اخبارات کو ہندوستانی اخبارات کی آزادی راس نہیں آئی اور انہوں نے ہندوستانی اخبارات پر پابندی لگانے کی مانگ شروع کر دی نتیجتاً ایک نیا قانون نافذ کیا گیا جو 1835 تک رائج قانون کی طرح ہی بد دیانتی پر مبنی تھا۔ یعنی ہندوستانی اخبارات کے لیے پرانی شراب نئی بوتل میں پیش کی گئی۔ یہاں ایک انگریز مورخ گارساں دتاسی کا بیان پیش کرنا چاہتا ہوں جو اس نے ہندوستانی اخباروں سے متعلق اپنے خطبات میں کہے تھے۔ پیش ہے ایکے خطبہ نمبر 218 سے یہ اقتباس:

''اس منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخباروں نے جو بددلی پھیلانے میں پہلے ہی سے مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہندو کارتوس کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا، اور یہ باور کرایا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔''3

کچھ یہی خیال گورنر لارڈ کیننگ کا بھی تھا جس کا اظہار اس نے اپنے انداز سے کیا تھا۔ اس قانون کو صحیح ٹھہراتے ہوئے لارڈ کیننگ نے 13/ جون 1857 کو کاؤنسل میں کہا تھا کہ:

''اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں اخباروں نے خبر شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور

عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔"4

یہاں درج لارڈ کیننگ کے بیان کا آخری جملہ نہایت عیارانہ ہے کیوں کہ 1857 کی بغاوت سے پہلے تک کے اخبارات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبارات خصوصاً اردو اخبارات کا رویہ انگریزوں کے تئیں معاندانہ نہیں تھا بلکہ متحیرانہ تھا لیکن جوں جوں ان سامراجیوں کی حرفت بازیاں بڑھیں ان اخبارات خصوصاً دہلی اردو اخبار کی حیرت مخالفت میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور یہ اخبار کھل کر انگریزوں کی مخالفت اور بہادر شاہ ظفر کی حمایت کرنے لگے۔ ان اخبارات میں راجہ رام موہن رائے کے ذریعہ شائع کردہ بنگلہ اخبار۔ سمبد کمودی، فارسی اخبار۔ مراۃ الاخبار، اردو اخبارات دہلی اردو اخبار یہ اخبار الظفر (دہلی)، صادق الاخبار (دہلی)، اخبار بہار (پٹنہ) دوربین (کلکتہ)، سلطان الاخبار، کلکتہ (فارسی) گلشن نور بہار کلکتہ (فارسی) حبیب الاخبار بدایوں اور عمدۃ اخبار بریلی۔ نے نہ صرف ملک و قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دیا بلکہ اس کے ذریعہ عوام میں فکر اور جذبہ کو بھی پروان چڑھایا اور انہیں ان کے اعلیٰ اقدار، ان کی تہذیب و تمدن اور ان کے اسلاف کی کارکردگیوں کی یاد دہانی کرائی جو برطانوی سامراج کے لیے سوہان روح کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کارکردگی کے لیے ان اخبارات کے ایڈیٹروں، مالکوں اور ناشروں سے جی کھول کر بدلہ لیا گیا۔ انہیں جیل بھیجا گیا، عدالتوں کے چکر لگوائے گئے، ضمانت ضبط کی گئی، لائسنس منسوخ کردیے گئے، مال و اسباب ضبط کیا گیا۔ یعنی تمام طرح کے ظلم کیے گئے جو پوری انگریز قوم کے کردار کو داغدار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدوجہد آزادی کی پہلی جنگ 1857 میں شروع ہوئی تو دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار اور سراج الاخبار دہلی میں جنگ کی خبریں نہایت اہمیت کے ساتھ چھپنے لگیں۔ اس میں دیگر اخبارات نے بھی اپنا اپنا کردار ادا کیا اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں، مضامین، نصیحتیں اور انقلابی فتوے شائع ہوتے گئے تاکہ مجاہدین آزادی کو حوصلہ دیا جاسکے، ان کے جذبات مہمیز کیے جاسکیں۔ ملاحظہ فرمائیں ایک رپورٹ جس میں پٹنہ سے شائع ہونے والے اردو اخبار "اخبار بہار" نے 3 جولائی کو پٹنہ میں رونما ہونے والے واقعے کے بارے میں تفصیلی رپورٹ کچھ یوں پیش کی ہے:

> "پٹنہ سٹی میں 65-60 افراد پر مشتمل ایک گروہ نے 'یا علی یا علی' کا نعرہ لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں کوچہ بہ کوچہ گزرتے ہوئے پادری کی حویلی کے گرجا گھر کے پاس پہنچ کر پادری کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔"5

یہ تو اخبار کی رپورٹ تھی جب کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس گروہ میں تین گنا افراد یعنی تقریباً دو سو لوگ تھے جو جلوس کی شکل میں ایک بڑا سا پرچم اٹھائے ہوئے تھے اور دین بولو دین، کا نعرہ لگا رہے تھے اور راہ گیروں سے بھی مدد کی درخواست کر رہے تھے ان کا نعرہ تھا یار و مدد کرو یہی مدد کا وقت ہے اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''اخبار بہار'' نے بھی اپنی رپورٹوں کے ذریعے مجاہدین میں جوش بھرنے کا کام کیا اور لوگوں کو باور کرایا کہ یہ وقت مدد ہے اور وہ حضرت علی سے مدد کے خواستگار تو ہیں ہی انھیں عوام سے بھی مدد درکار ہے تا کہ انگریزوں کا قلع قمع کیا جا سکے۔ 11 جولائی 1857 کے اخبار بہار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں 23 جون سے 6 جولائی تک مختلف اوقات میں دس مجاہدین آزادی کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا ان میں سے پیر علی کو پھانسی دیئے جانے کی خبر 21 جولائی کے اخبار میں سرکاری اشتہار کے ساتھ شائع کیا گیا کہ اس جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزا دی جائے گی نیز مال و اسباب کی ضبطی بھی ہوگی اور ایسے لوگوں کا ٹرایل کورٹ مارشل کے ذریعے یا کمشنر کے ذریعے کیا جائے گا۔

اس ضمن میں ان اردو اخبارات کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ جنھوں نے اپنی خبروں اور رپورٹوں وغیرہ سے 1857 کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار نبھایا اور اسی جنگ کی نذر بھی ہو گیا۔ دیکھیں مجاہدین کی بغاوت کا ایک انداز جس کی جھلک 17 مئی 1857 کے دہلی اردو اخبار کی رپورٹ میں اس طرح دکھائی دیتی ہے۔

> '' روز شنبہ 16 تاریخ شہر رمضان الذی نزل فیہ القرآن وفی لیلۃ القدر سنہ رواں مطابق 11 مئی 1857، مسیحائی کو باعث موسم گرما اول وقت کچہری ہو رہی تھی، صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرم حکمرانی تھے اور سب حکام اپنے اپنے محکموں میں سرگرم اجرائے احکام تھے اور حکم قید اور حبس سزائے جسمانی وطلبی مجرمین وغیرہ جاری ہو رہی تھی کہ سات بجے کے بعد میر بحری یعنی داروغہ پل نے آکر خبر دی کہ صبح کو چند ترک سوار چھاؤنی میرٹھ کے پل سے اتر کر آئے اور ہم لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنے لگے اور محصول مجسمہ کا لوٹنا چاہا قلعہ دار بڑے صاحب اور ڈاکٹر صاحب و میم لوگ وغیرہ دروازے میں مارے گئے اور سوار قلعہ میں چلے آئے شہر میں اول چند سوار آئے اور دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے اور دو بنگلے جلاتے ہوئے پیش اسپتال اسپر قلعہ آئے اور چمن لال ڈاکٹر کو بھی

دارالشفاء اصلی میں پہنچا دیا۔ کہتے ہیں بڑے صاحب دفتر اور ڈاکٹر وغیرہ چند انگریز کلکتہ دروازے پر کھڑے ہوئے دوربین لگائے سڑک میرٹھ کا حال دریافت کررہے تھے کہ دو سوار آئے اس میں سے ایک نے تپنچہ اپنا جھاڑا اور ایک انگریز کو مار گرایا اور باقی جو بچ کر آئے حسب تحریر مذکور الصدر دروازے قلعے میں آکر مارے گئے اور پھر اور سوار بھی آپہنچے اور شہر میں غل ہو گیا کہ فلاں انگریز وہاں مارا گیا اور فلاں انگریز وہاں پڑا ہے۔"6

اس میں شک نہیں کہ 1857 کی بغاوت میں چربی والے کارتوسوں نے آگ میں گھی کا کام کیا تھا اور اخبارات نے اس خبر کو خصوصیت کے ساتھ شائع کر کے ہندوستانیوں میں جذبۂ حریت پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا دیکھیں صادق الاخبار میں اس خبر کو کس انداز میں پیش کیا گیا:

"ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی کرنا شروع کر دی ہے چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹنیں پھر گئی تھیں۔ ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ پلٹنیں گورکھا نمبر 16 مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل درآمد سے انکار کر دیا۔ از روئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہو کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کی قواعد سے کتراتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں۔ لوگوں کے دل کا شک بالکل رفع نہیں ہوا۔"7

اب صادق الاخبار (دہلی) کا یہ تراشا ملاحظہ فرمائیں جو 17 رذی قعدہ 1273ھ کے شمارے میں "خبر پشاور" کے عنوان سے درج ہے جس میں ایران وافغانستان کے فوجیوں کے ہندوستان میں آنے اور انگریزوں پر حملہ آور ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

"ایک دوست کی زبانی ایک قاصد آنے والے خاص پشاور کے راوی ہیں کہ کئی ہزار سپاہ نے بہت سے انگریزوں کو قتل کیا اور یہاں سید محمد اکبر والی سوات کو بڑے دین دار ہیں تخت شاہی پر بٹھا دیا اور ان کا انتظام بخوبی کرا کر لاہور کو آن گھیرا۔ اب اہل لاہور محصور ہیں۔ یقین کہ سپاہ منصور اردہ شجاعت ذاتی فتح حاصل کرے اور جو تھوڑے بہت گورے لب گور ہیں در گور ہیں۔"8

دیکھیں صادق الاخبار (دہلی) کے 13 راگست 1857 کی یہ خبر جس میں مورچہ کی خبر کے

عنوان سے انگریزوں کے خلاف کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

"سنایا گیا ہے کہ نویں تاریخ ماہ سعید عید قرباں کو افواج الظفر امواج نے مخالفین دین سے بوقت نواخت نوگھنٹہ روز کے بادلہ پر خوب مقابلہ و مقاتلہ کیا۔ دیر تک کشت و خون مردمان طرفین ہوتا رہا۔ من بعد رحمت الٰہی نے نزول کیا، گورے بھاگ نکلے۔ یہ حال دیکھ کر سپاہ منصور واپس آئی کہتے ہیں گورے اس روز لڑائی میں بہت کام آئے بارش کا پانی جو تمام ندی نالوں میں بھرا ہوا تھا، مثل جوئے خون ہو گیا غرض کے بہادران نیچہ نے سب گوروں کو قتل کیا اور دونوں توپیں چھین لیں۔ واقعی یہ فوج ظفر ایسی جری ہے کہ آج تک نہ چشم فلک نے دیکھی اور نہ گوش زمانہ نے سنی ہوگی۔" 9

اس ضمن میں دلی سے شائع ہونے والے تمام اخبارات میں دہلی اردو اخبار یوں اہم ہو جاتا ہے کہ اسے ہی اردو کا پہلا سیاسی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے جس نے ہماری جنگ آزادی میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا۔ گو کہ "جام جہاں نما" کو اس کے ضمیمے کی رو سے اردو کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا ہے لیکن اس اخبار نے جنگ آزادی میں کسی قسم کا کردار نہیں نبھایا تھا اور نہ ہی اس میں اس قسم کے مواد شائع ہوا کرتے تھے۔ جب کہ ہندوستانی پریس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ "دہلی اردو اخبار" نے آزادی ہند کو ہی اپنا نصب العین بنا لیا تھا اور شعوری طور پر جنگ آزادی کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا تھا۔ اس اخبار نے اس دور کی تمام حشر سامانیوں کا بیان کچھ اس طرح شائع کیا کہ آزادی کے جیالوں اور متوالوں میں جوش و ولولہ پیدا ہو اور وہ فتح و ظفر سے ہمکنار ہو سکیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مقدمہ "دہلی اردو اخبار" میں اس اخبار کے متعلق رقمطراز ہیں:

"دہلی اردو اخبار شاہ جہان آباد دہلی کا پہلا اردو اخبار تھا جس کے مطالعے سے مومن، غالب، شیفتہ، آزردہ، ذوق اور ظفر کا سارا ماحول اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ہم اس جام جم میں دو دنیاؤں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں جس میں ایک ابھرتی ہوئی اور دوسری ڈوبتی ہوئی ہے۔" 10

اگر ہم 1857 یا اس کے آس پاس شائع ہونے والے اخبارات کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو

یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان سیدھے سادے اور معصوم اخبارات میں جن کا مقصد بظاہر اصلاحی ہو کرتا تھا کہیں نہ کہیں احتجاجی اور باغیانہ خیالات کسی ساکت سمندر میں زیریں لہروں کی شکل میں موجود رہتے ان میں دہلی اردو اخبار نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے تک کے "دہلی اردو اخبار" کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوئی ہے کہ اس اخبار میں بھی دیگر اخبارات کی طرح دہلی کی سیاسی، معاشی، مجلسی اور تمدنی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی تھی، رپورٹیں پیش کی جاتیں تھیں لیکن جابجا مضامین میں انگریزوں کی مشنری سرگرمیوں کا جواب بھی دیا جاتا تھا لیکن ہندوستان کے خلاف جوں جوں ان سامراجیوں کی حرفت بازیاں بڑھیں دہلی اردو اخبار کا رویہ بھی مخالفت میں تبدیل ہوتا چلا گیا جس کا احساس انگریز افسران کو بھی تھا اور اس کا اظہار لارڈ کیننگ نے بھی ایک بار بڑے ہی عیارانہ انداز میں کیا تھا جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ یعنی کہ اخبارات انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔

یہاں شہید صحافت، مولوی محمد باقر کا خصوصی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ میدان صحافت کے جاں باز اور حق پرست سپاہیوں میں سے ایک تھے بلکہ وہ اس قبیل کے سردار و پیشوا تھے جنہوں نے اپنے اخبار "دہلی اردو اخبار" میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حکام کی کارکردگی پر مردانہ وار حملہ کیا۔ مولوی صاحب برائی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی غلامی اور ان کے ذریعہ تھوپی گئی سامراجی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ان کا اخبار بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں جب تک پہلی جنگ آزادی (1857 کا غدر) کی مہم جاری رہی اس وقت تک دہلی اردو اخبار نے اپنی صفحات جنگ آزادی کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر دیے۔ مولانا نے اپنے خبار میں غدر کی خبریں بڑے ہی اہتمام سے شائع کیں، جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں شائع کیں، پر جوش ولولہ انگیز باغیانہ مضامین اور نصیحتوں کو روزانہ شائع کیا یہاں تک کہ علمائے کرام کے انقلابی فتوؤں کو بھی اخبار کی زینت بنایا۔ انہوں نے اس اخبار میں روحانی بزرگوں کے خواب بھی نمایاں طور پر شائع کیے۔ جس میں انگریزی حکومت کے خاتمے کی بشارت کا ذکر ہوتا یعنی مجاہدین آزادی کی رگوں میں روانی خون تیز کرنے کے تمام لوازم کو اخبار میں جگہ دینا ہی دہلی اردو خبار کا اولین مقصد تھا۔ مولانا نے اس بات کا خاص اہتمام کیا تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے مجاہدین آزادی کے دہلی آنے اور یہاں ان کے جنگی کارناموں، انگریزوں سے مجادلوں و مقابلوں اور ان پر فتح و ظفر حاصل کرنے کی رپورٹیں اور

ان کی تفصیل خصوصی طور پر شائع کی جائیں اور یہ بھی بتایا جائے کہ ہندوستان کے کن کن مقامات پر انگریزی فوجوں کا مجاہدین آزادی نے قلع قمع کر دیا ہے۔ شاید یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر دہلی اردو اخبار کے چند نمبروں میں اس کا نام بدل کر ''اخبار ظفر'' کر دیا گیا حالانکہ تبدیلی نام کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ اسے بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام سے مناسبت دی تھی۔ پیش ہیں ''دہلی اردو اخبار'' کے چند اقتباسات جس سے محولہ بالا نکات پر روشنی پڑتی ہے۔ 18 رمئی 1857 کے دہلی اردو اخبار کے ایڈیشن میں میرٹھ کا حال اس طرح قلم بند ہے:

''.....رسالہ ترک سواران غازی کا اور پلٹن نام پہلے سے برسر پرخاش تھی اور ان سے بابت کارتوس کے کہ چربی اور تیلی وغیرہ اس پر منڈھی ہوئی ہے۔ مثل پلاٹن مقامات دیگر حسب مندرجہ اخبار سابق تکرار در پیش تھی کہ انجام کو بجرم انکار 85 سوار اس میں سے قید ہوئے کہ یوم یکشنبہ حمیت دینی اور حمایت مذہبی نے جوش کیا اور دفعتاً تمام اہل پلٹن اور رسالہ جو شخص جس حال میں تھا ہتھیار سنبھال کر اول جیل خانہ سے اپنے برادران اسلامی کو چھڑا لائے اور معہ پلٹن درپے انگریزوں اور گوروں کے ہوئے......''11

اسی طرح 24 رمئی 1857ء کا اخبار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں مولانا آزاد کی ایک نظم جو کہ 19 اشعار پر مشتمل ہے، شائع ہوئی ہے۔ عنوان ''تاریخ انقلاب عبرت افزاء'' ہے۔ جس کے ہر شعر میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ اسی اخبار میں کول، بلند شہر، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، بھکسر، سکندر، غازی آباد، علی گڑھ، میرٹھ اور دہلی میں جاری جنگ آزادی کی رپورٹیں شامل ہیں اور تقریباً سبھی میں مجاہدین آزادی کے ذریعہ انگریزوں کو قتل کیے جانے، ان کے مال و اسباب لوٹ لیے جانے وغیرہ کی خبر درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیں بلند شہر سے متعلق یہ خبر جہاں مجاہدین آزادی نے انگریزوں کو مار ڈالا اور قیدیوں کو جیل سے چھڑا لیا:

''بلند شہر میں بھی سنا ہے کہ سپاہ نے انگریزوں کو مار ڈالا جو کوئی قسمت سے بھاگ گیا سو بھاگ گیا۔ باقی سب مارے گئے۔ قیدی جیل خانے کے تمام چھوٹ گئے اور کوٹھیاں انگریزوں کی تباہ و برباد ہوئیں''12

یہ تو تھیں چند جھلکیاں جو مولانا محمد باقر کے اخبار کی زینت بنیں۔ حق تو یہ ہے کہ یہی ہندوستان کا واحد سیاسی اخبار تھا جس نے ہندوستانیوں کے جذبات کو بیدار کرنے کا کام لیا اور

اردو کے دیگر اخبارات کو راہ عمل دکھائی تاکہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف آزادی کے حصول میں کوشاں ہوں اور اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔ اس کی بہترین مثال ''دہلی اردو اخبار'' کی وہ اپیل بھی ہے جس میں مولوی محمد باقر نے عوام سے جان کی بازی لگانے اور مجاہدانہ عمل بجالانے کا اعادہ کیا تھا اور کہا تھا کہ:

''ہندو، مسلمان متحد ہو کر جان کی بازی لگا دو اور مجاہدانہ شان سے انگریزوں کا خاتمہ کر دو۔۔''

مندرجہ بالا بیانات سے مولانا کے سیاسی شعور اور جذبہ حریت کا اندازہ ہوتا ہے کیوں کہ اس قسم کی اپیلوں، مضامین، خبروں، رپورٹوں، نظموں وعظوں اور فتوؤں وغیرہ سے انگریز افسران نہ صرف ان سے برہم ہو گئے تھے بلکہ ان پر اپنے اخبار کے ذریعہ بغاوت بھڑکانے کا الزام بھی لگانے لگے تھے۔ پھر بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی منزل کی جانب گامزن رہے۔

ان کی انہیں مجاہدانہ کاوشوں کی پاداش میں ان پر جھوٹے الزام لگائے گئے اور 14 ستمبر 1858 کو انہیں گرفتار کر لیا گیا جس کے بعد 16 ستمبر 1857 کو ان کی شہادت واقع ہوئی جسے اردو صحافت کی اولین قربانی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

مولوی محمد باقر کے علاوہ دیگر اخبارات کے کئی مدیروں نے اپنے اپنے طریقہ سے اس جنگ میں حصہ لیا اور اس بناء پر ان پر مختلف قسم کے مظالم بھی کیے گئے لیکن ان اذیتوں کا کوئی ایسا ریکارڈ موجود نہیں ہے جس پر تکیہ کیا جا سکے ہاں سرکاری رپورٹیں اور دستاویزات کے ذریعہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی ہوتی ہے اور ان میں درج حقائق کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ کس کس اخبار کے مدیر، مالک یا ناشر کو کن کن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سراج الاخبار کے بانی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے متعلق تو سبھی کو معلوم ہے کہ جنگ آزادی میں حصہ لینے بلکہ اس کی قیادت کرنے کے جرم میں انہیں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ اسی طرح صادق الاخبار کے ایڈیٹر محمد جمیل الدین کو تین برس کی سزا ہوئی۔ گلشن نوبہار، دوربین اور سلطان الاخبار کے ایڈیٹروں پر کئی مقدمات چلائے گئے ان کے مال و اسباب ضبط کر لیے گئے خصوصاً گلشن نوبہار پریس ضبط کر لیا گیا۔ کچھ یہی حال بریلی سے شائع ہونے والے اخبار عمدۃ الاخبار کا بھی ہوا جس نے روہیل کھنڈ کے انقلابیوں کی حمایت کرنے والے بہادر خاں کی حمایت کی تھی اور ان سے متاثر ہو کر اپنے اخبار کا نام ''فتح الاخبار'' رکھ کر ہر چہار جانب جدوجہد آزادی کا ڈنکا بجا رکھا تھا۔ اسی طرح کا

کارنامہ" حبیب الاخبار" بدایوں نے بھی انجام دیا تھا جس کی پاداش میں اس کے مدیر کو سزا ملی اور پریس ضبط کر لیا گیا۔ یعنی وہ سبھی اخبارات ، مدیر و مالکان جنہوں نے جدوجہد آزادی میں انگریزوں کی مخالفت کی ان پر انتہائی درجہ کی زیادتی کی گئی اور ان کی آواز دبانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی لیکن جنگ آزادی کے متوالے اور قلم کے عظیم سپاہیوں نے سچے محب وطن ہونے کا پختہ ثبوت دیا اور آخر دم تک اپنے طور پر سامراجیت کے خلاف نبرد آزما رہے۔

1857 کی جدوجہد آزادی جسے انگریزوں نے غدر کے نام سے موسوم کیا تھا کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ بغاوت ہوتے ہی تمام اخبارات پر 13 رجون 1857 سے پابندی عائد کردی گئی جس سے حریت پسند ہندوستانی اخبارات اور پریس کو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرش یہ سبھی اخبارات دم توڑ گئے اور اب یہ صرف ہمارے سنہرے ماضی کا حصہ ہیں۔

حواشی و مآخذ

1۔ نادر علی خاں، ہندستانی پریس صفحہ 308

2۔ پیش لفظ: ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں: محمد عتیق صدیقی صفحہ 5

3۔ گارساں دتاسی خطبہ 218

4 تقریر لارڈ کیننگ 13 جون 1857 ہاؤس آف کامنس

5۔ اخبار بہار، پٹنہ 6 جولائی 1857

6۔ دہلی اردو اخبار 17 رمئی 1857

7۔ صادق الاخبار۔ شمارہ 2 راپریل 1857

8۔ صادق الاخبار 17 رذی قعدہ 1273ھ

9۔ صادق الاخبار۔ شمارہ 13 اگست 1857

10۔ خواجہ احمد فاروقی: مقدمہ دہلی اردو اخبار

11۔ دہلی اردو اخبار، 18 رمئی 1857

12۔ دہلی اردو اخبار، 24 رمئی 1857

اولین جہاد آزادی اور فارسی اخبارات

ہندوستان کی آزادی اور عوامی بیداری میں فارسی اخبارات کا ایک اہم رول رہا ہے۔ اگر چہ یہ درست ہے کہ اس عہد کے ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات نے انگریزی اخبارات کی تقلید کی ہے، لیکن فارسی زبان میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر اخبارات ہندوستانیوں کی ذاتی ملکیت میں تھے اور انھیں کی نگرانی اور نگہداشت میں اس کی نشر و اشاعت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان اخبارات کے توسط سے عام ہندوستانیوں کے احساسات اور ظلم و جبر کے خلاف ان کے جذبات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے، جب سراج الدولہ کے ساتھ انگریزوں کی فریب کاری، ٹیپو سلطان کا دردناک انجام اور دیگر ریاستوں کے ساتھ ان کی نازیبا چھیڑ چھاڑ نے عوام و خواص کے دلوں کو انگریزوں کی طرف سے مکدر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کی اپنی سماجی اور معاشرتی برائیاں اور غلط رسوم و رواج انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی تھیں۔ ان حالات کی زہرناکی اور سمیت کو کچھ حساس اور روشن دماغ لوگوں نے محسوس کیا اور ان معاشرتی برائیوں کے قلع قمع کرنے کی نیت سے کوششیں کیں۔ فارسی اخبارات کی اشاعت بھی انھیں کوششوں کا ایک اہم حصہ تھی۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے نے مرآۃ الاخبار کے پہلے شمارے میں اپنے مقاصد کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''اخبار جاری کرنے سے میری غرض نہ تو امیروں کی یا اپنے دوستوں کی مدح سرائی کرنا ہے اور نہ عزت و جاہ اور لطف و عنایت کا حصول ہی میرے پیش نظر ہے۔''
>
> مختصر یہ کہ اس اخبار کی ذمہ داری لینے سے میرا مقصد صرف عوام کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنی ہیں، جن سے ان کے تجربوں میں اضافہ اور ان کی سماجی ترقی ہو سکے۔ ارباب حکومت کو بھی رعایا کا صحیح حال بتلایا جائے اور رعایا کو ان کے حکمرانوں کے قانون اور رسم و رواج سے آگاہ کیا جائے تاکہ حکمرانوں کو اپنی رعایا کی تکلیفیں دور

کرنے کا موقع ملے اور رعایا کی داد رسی ہو سکے۔" (۱)

اس میں شک نہیں کہ فارسی صحافت نے ابتداء سے ہی سماجی بیداری اور جدو جہد آزادی کا بیڑا کسی نہ کسی روپ میں اٹھائے رکھا ہے، جس کی درخشاں مثال فارسی صحافت کے بانی راجہ رام موہن رائے ہیں۔ وہ فلسفۂ ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی اور دیگر کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ جہتی تھا۔ مختلف مذاہب اور افکار ونظریات سے آشنائی کے سبب ان کا طبعی میلان ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کا تھا، جو ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے تہذیب وتمدن کا ایک خوبصورت سنگ میل ہو اور ملک میں ایک ایسی فضا قائم ہو جائے، جہاں بھید بھاؤ کے بجائے محبت اور رواداری کا دور دورہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانیوں میں سیاسی اور فکری آزادی کی اہمیت کو ذہن نشیں کرانے کی خاطر کوشاں رہے۔

اس طرح انھوں نے ہندو سماج میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی اور اپنے ان افکار ونظریات کی نشر و اشاعت میں روزناموں اور مجلوں کی مدد لی۔ ان کا فارسی اخبار مرآۃ الاخبار اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس سے قبل سے دسمبر 182۰ء میں تارا چند دت اور بھوانی چرن بندھو پادھیائے کی ادارت میں "سمواد کومدی" کے نام سے ہفتہ وار جاری کر چکے تھے۔ افسوس کہ مرآۃ الاخبار کی کاپیاں دستیاب نہیں ہیں، ورنہ ان کوششوں کی مزید تفصیلات ملتیں۔

راجہ رام موہن رائے کے بعد بڑی تعداد میں فارسی اور دیگر دیسی زبانوں میں اخبارات جاری ہوئے۔ اس نئی تبدیلی کے ساتھ ہی ہندوستان کی عمومی صحافت میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ انگریزی اخبارات جو اب تک کمپنی کے حمایتی اور مخالف گروپوں میں منقسم تھے، آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور بالآخر دیسی زبانوں میں چھپنے والے اخبارات اور انگریزی اخبارات ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں عام طور سے دیکھا گیا کہ انگریزی اخبارات حکومت کے ہر غلط صحیح قدم کا جواز پیش کرنے لگے۔ نتیجتاً ہندوستانی اخبارات کے احتجاجی رویہ میں سختی آتی گئی اور یہ شدت 1856ء میں اودھ ریاست کی انگریزی حکومت میں انضمام اور 1857ء میں جنگ پلاسی کے صد سالہ موقع پر نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، جس کی تصدیق مشہور مستشرق گارسیں دتاسی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

"ان نئے کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخباروں نے جو بددلی پھیلانے میں پہلے سے مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ

اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ باور کرا دیا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔'' (2)

بغاوت کے زمانے میں دیسی اخبارات پر پابندی لگاتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ان اخباروں کے 'منفی' رول کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ:

''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔'' (3)

اگرچہ 1857ء کے ایکٹ XV کی رو سے دیسی اور غیر ملکی انتظام کے تحت جاری ہونے والے اخبارات کے درمیان کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا گیا تھا، لیکن انگریزی اخبار ''فرینڈز آف انڈیا'' نے اجازت نامہ حاصل کرتے ہی اس کے ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ''پلاسی صد سالہ'' کے عنوان سے اداریہ لکھا، جس پر اسے تنبیہ کی گئی اور اس تنبیہ کا اس نے جواب بھی دیا۔ اس کے مالک مارش مین، جو اس وقت لندن میں تھے، انھوں نے وہاں سے کسی قانونی خلاف ورزی نہ کرنے کی ہدایت بھیجی۔ انھیں حکومت کو صفائی بھی دینی پڑی۔ (4) بعد ازاں فضا اتنی مکدر اور مسموم ہو گئی کہ جلد ہی اخبارات کے دو خیمے یعنی حکومت مخالف اور حکومت کے حامی بن گئے۔ (5) یہی نہیں، بلکہ اس سے قبل ہندوستانی سیاست کی مسموم فضا کو اس کے پیش رو لارڈ ڈلہوزی نے بھی بھانپ لیا تھا اور 1856ء میں استعفیٰ دے کر انگلستان واپس چلا گیا۔ جب لارڈ کیننگ کو یہ ذمہ داری دی گئی تو اسے ہندوستان کے نازک حالات کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ ہندوستان آنے سے پہلے اس نے اپنے الوداعیہ تقریر میں کہا تھا:

''میں ایک پر امن حکومت چاہتا ہوں، لیکن میں یہ بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کا آسمان جو بظاہر پر سکون ہے، وہاں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہو کر ساری فضا پر چھا سکتا ہے اور ہم کو تباہیوں سے شرابور کر سکتا ہے۔'' (6)

بغاوت کے زمانے میں ہی نہیں، بلکہ فارسی اخبارات نے ابتدا ہی سے ایسی خبریں، تبصرے چھاپے اور ایسا انداز اور لہجہ اختیار کیا، جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان اخبارات نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں کس طرح سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ البتہ بغاوت کے وقت ان کے لہجہ میں مزید شدت آگئی جو فطری امر تھا۔ چنانچہ

جے۔لونگ (Rev. J. Long) نے 1859ء کے اپنے رپورٹ میں ہندوستانی اخبارات کے لب ولہجہ اور تیور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ دیسی پریس کو مجموعی طور پر Safety Valve کہا جاسکتا ہے، جو خطرے کی وارننگ دیتا ہے۔اس طرح اگر یوروپی اہل کاروں نے جنوری 1857ء میں دہلی کے دیسی اخباروں سے رجوع کیا ہوتا تو انھیں بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ ہندوستانی کس حد تک بغاوت کے لیے کمربستہ تھے اور انھیں ایران اور روس سے مدد کی امید بھی تھی۔(7)

مذکورہ حقائق کی روشنی میں History of Indian Journalism کے مصنف مسٹر جے۔نٹراجن کی بات غلط اور بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ:

> ''ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس بغاوت میں ہندوستانی اخبارات نے ادنیٰ قسم کا رول بھی ادا کیا ہو۔''(8)

رجب علی حسینی لکھنوی کی ادارت میں شائع ہونے والا اخبار'' سلطان الاخبار'' انگریزوں کی ظلم وزیادتی، فریب کارانہ اور متعصبانہ سازشوں کی نقاب کشائی میں سب سے آگے بڑھا ہوا تھا۔اس لحاظ سے دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔اس میں ہندوستان کے علاوہ عالمی سطح پر بدلتی سیاسی صورت حال سے متعلق خبریں اور مضامین شائع ہوتی ہیں۔پریس کی محدود آزادی کی وجہ سے اس زمانے میں اخبارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاہ کارناموں کی طرف انگشت نمائی کرنے سے گھبراتے تھے، لیکن اس کے برعکس'' سلطان الاخبار'' برطانوی حکومت کی ہر ناانصافی یا عوامی مفادات کے خلاف ان کے ہر فرمان کی مخالفت اور اس کے منفی اثرات سے عوام کو باخبر رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور جس بے باکی سے ان پر تبصرے کرتا تھا اس کی نظیر اس وقت کی صحافت میں ملنی مشکل ہے، مثلاً موصوف نے 2 ر ستمبر 1835ء کے شمارے میں'' خبر رسم و عادات انگریزان در ملک ہندوستان'' کے عنوان سے تین صفحہ پر مشتمل ایک طویل مضمون شائع کیا ہے۔جس میں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے مستبدانہ رویہ کا ذکر کیا ہے بلکہ ہندوستانیوں کو اس بات پر غیرت دلائی ہے کہ مٹھی بھر انگریز یہاں آکر لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں اور لوگ بے چوں و چرا اسے برداشت کر رہے ہیں۔اس مضمون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

> ''مردم می گویند کہ انگریزان قلیل و کمتر اند و ہندوستانیان کثیر و بیشتر و در سرکار انگریز بہادر تدارک و عدل ہمین است کہ ہر کرا کشندہ می دانند میکشند لیکن عجب

است کہ درین معنی غور و تامل بکار نہ برند کہ آخر ہر جا کارکنان انگریزی وگری و حبس وقید وقتل وقصاص واخراج ملک وضبط تمغا و ملک می سازند و کسی دم نمی زند "(9)

اسی طرح اخبار نے اپنے پہلے ہی شمارہ میں صوبہ بنگال میں رونما ایک لڑکی کی انگریز تاجر کے ہاتھوں آبرو ریزی کے واقعہ اور عدالت کے متعصبانہ رویہ کی رپورٹنگ (یکم اگست 1833ء کے شمارہ میں) "خبر عدالت کلکتہ" کے عنوان سے ان الفاظ میں کیا:

"شنیدہ ام کہ دختری ہندوی بحضور حاکم مرافعہ برد کہ فلان انگریز تاجر نیل خواہرم را از کنار آب دربر بود و آغوش خویشتن از تن آن نازک بدن گرم نمود۔ مادرم و برادرم از این واقعہ در آتش کدہ غم افتادہ اند و از این پردہ دری و بی ناموسی چو شمع لگن بہ سوختند۔"(10)

ملزم انگریز کو جب اس مرافعہ کی خبر ملی تو اس نے پولیس سے ساز باز کر کے لڑکی کے سارے خاندان پر چوری کا الزام لگا کر جیل میں بند کرا دیا۔ اس کی بوڑھی ماں نے "بہ زندان وداع حیات واپسین نمود"۔ اس کے بعد رجب علی لکھنوی نے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "این است ظلم انگریز بر رعیت" اور آخر میں لکھا کہ اس کارروائی کی وجہ سے عوام "ظن بردہ اند کہ شاید رعایت ابنائے جنس از انصاف بہتر است۔"(11) ایک دوسری خبر سرکاری دفاتر کی بے راہ روی، خاص طور سے عدالتوں اور کچہریوں میں کام کرنے والے منشی ور دیگر ملازمین کی خالمانہ حرکات، بد تمیزیوں اور رشوت ستانیوں کے بارے میں تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق:

"از حال منشیانِ عدالت چہ نویسم کہ بر ہمہ چیرہ دست اند و سرہنگان شحنہ در عقوبت و آزار بہ ہلاکوی وقت برابر نمایند وعیش و شحنہ رئیس جفا کاران است و چپراسیان پرمٹ از نقد بازرگانان و مسافران کیسہ ندارند۔ ونوکران خانہ ڈاک خصوصاً کرانیان آن جا در خیانت بی باک اند۔ اگر مظلومی بہ حضور حکام مرافعہ برد یا شکایت نماید حکام اغماض فرمایند۔ بی چارہ را از بارگاہ می رانند۔"(12)

اس دور کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد موصوف کے انتہائی بے باکانہ اور بے لاگ انداز تحریر کو دیکھ کر لوگ آج بھی حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، چنانچہ ایک بار انھوں نے اودھ کی سلطنت میں رہنے والوں اور کمپنی کے زیر انتظام علاقے میں رہنے والوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اگر انصاف و تعصب را راہ نہ دہم زمینداران مملکت انگریزی پریشان حال و رعیت مملکت آودھ فارغ البال، قتل نفوس بنی آدم در یک شہر کلکتہ بیشتر در قلمرو آودھ کمتر... بازار رشوت در ہر عدالت انگریزی گرم است۔''(13)

چنانچہ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''رجب علی لکھنوی یقیناً بڑے باہمت آدمی تھے۔ ان کے اخبار کی خبریں اور ان خبروں پر ان کا جلا کٹا تبصرہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا کہ کمپنی انگریز بہادر کے دار السلطنت کلکتے میں بیٹھ کر وہ اخبار نہیں نکالتے تھے بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھاتی پر کودوں دلتے تھے۔''(14)

اسی طرح سلطان الاخبار نے لوہارو کے نواب شمس الدین اور ان کے رفیق کریم خاں گل کو ایک انگریز عہدہ دار ولیم فریزر کو قتل کرنے کے جرم میں تختۂ دار پر چڑھائے جانے کے واقعہ کی رپورٹنگ کی ہے، اس سے اس اخبار کے شدید قوم پرستانہ اور انگریزی سامراج کے خلاف بھڑکتے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس اخبار کے 2 ستمبر 1835ء کے شمارہ کی سرخی بھی یہی ہے:

''بہ بست و ہشتم اگست کریم خاں را بمقابی کہ اشتباہ خون ریختن ولیم فریزر داشتند بردند حسب دستور انگریزی بکشتند۔''

اس خبر کی تفصیلات اس طرح ہیں:

''مسلمانان شہر دہلی برطبق وصیت او بہ بست و ہشتم روز جمعہ در جملہ مساجد فراہم آمدند دعاءِ خیر بہر او نمودند و مغفرتش از خدا خواستند۔ لیک در مسجد جامع مسلمانان را بہر دعا کردنش رفتن ندادند۔ شاید کہ این ممانعت خیر ز طرف سلطان بہ ایمائے انگریزان است۔ اہل اسلام از این معنی خیلی منغص و مکدر اند۔ وہمین ورد زبان دارند کہ ممانعت انگریزان از دعائے خیر نقصانہ ی بہر ما مسلمانان را و کریم خان ندارد۔ چہ او در ابد رگاہ خدا مستحق جنت، ثواب است نہ مورد عتاب و عذاب کہ کافری را کشتہ است۔ نامش گل شہید نہادہ اند و ہر شب عوام بر مزارش ہجوم می آورند، چراغان روشن سازند و خنیا گران دلولیان ہم ہزاران ہزار بر گورش مجتمع شوندہ بہ نغمہ و رقص دل عالم بہ ربایند۔''(15)

دہلی کے مسلمانوں نے کریم خاں کے اس جرأت مندانہ اقدام کی دل کھول کر داد تحسین دی، جس سے انگریزوں کی ناانصافی اور ظلم و ستم کے خلاف ان کے دلوں میں بھڑکتے غم و غصہ کے جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے لیکن کلکتہ کے اندر انگریزی اخبارات نے صحافتی بددیانتی اور ناسمجھی کا ثبوت دیتے ہوئے گھٹیا اور مبتذل لہجہ کا استعمال کیا اور کریم خاں کے متعلق یوں لکھا کہ:

"اگر جسد کریم خاں را بجائے تدفین می سوزانند ہرگز ہجوم مردم بر قبرش نشدے۔"

سلطان الاخبار نے دہلی کے عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے کلکتہ کے ان انگریزی اخبارات کی گھٹیا رپورٹنگ اور انتہائی گری ہوئی زبان کی سخت لہجہ میں تنقید کی اور ان خبروں کا ترجمہ کرنے کے بعد اس کا منہ توڑ جواب دیا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

"این امر زیادہ باعث توحش و نکدر خلائق شدے بلکہ یقین بود کہ مردم بر سر بلوہ آمدندہ و عاقبت کار نمیند شیدہ قیامتی برپا می کردند۔ آن وقت چارہ کار مشکل بود۔"

اور آخر میں انگریزی اخبارات کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"اہل اخبار را لازم است کہ سخن فہمیدہ گویند واز ہرزہ سرائی در گزرند۔" (16)

کریم خاں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد نواب شمس الدین کو تختہ دار پر چڑھانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر منصفوں کا ایک مخصوص پینل ترتیب دیا گیا۔ سرکاری گواہوں فتح اللہ خاں اور کرنل اسکو وغیرہ کی یہ پوزیشن تھی کہ وہ گواہی دینا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے اور اس پر زیادتی یہ کہ بیانات انگریزی میں قلمبند کیے گئے۔ جو عدالت چاہتی وہ لکھوا لیتی۔ گواہ یہ بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا بیان کس طرح لکھا جا رہا ہے اور اگر تردید و انکار کرتا تو بیڑیاں پاؤں میں ڈال کر جیل بھیج دیا جاتا تھا۔(17) چنانچہ اس واقعہ کو سلطان الاخبار نے 19 اگست 1935ء کے شمارے میں بڑے طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ:

"اظہار گواہان بعبارت انگریزی حوالہ قلم نزاکت رقم می شود۔ شاہد بیچارہ دریافت نمی شود کہ انکار را اقرار شمردہ یا اقرار را انکار، اگر عذری بہ میان آوردند فوراً زنجیر در پا شدہ بزندان می روند۔ اگرچہ بہ چنین ثبوت چشم سزا و عذاب در حق ثواب

از گورنمنٹ انگریزی دار ندیمین روا است۔"(18)

آخر کار ان نام نہاد منصفوں نے حسب منشائے ارباب دولت نواب شمس الدین کو تختہ دار پر چڑھانے کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے سلطان الاخبار نے 11 اکتوبر 1835ء میں اس خبر کو شہ سرخی کے طور پر چھاپا اور اس تعصب اور یک طرفہ فیصلہ پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"افسوس در مقدمہ اش انصاف نہ رفت۔"

بعد ازاں 25 اکتوبر کو اس واقعہ کی پوری تفصیلات کو شائع کیا اور معاندانہ فیصلہ کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے قتل سے تعبیر کیا اور اس خبر کا عنوان بھی "خبر قتل نواب شمس الدین" رکھا جس کا اقتباس یوں ہے:

"اہل اخبار حکایت کنند کہ بروز شنبہ ماضیہ، بوقت شام از طرف دہلی در کلکتہ خبر رسید کہ نواب شمس الدین بہ ہشتم اکتوبر 1853ء و روز پنجشنبہ سپیدہ دم بعذاب پھانسی کشتہ گردید۔ شرح این اجمال در اخبار بنگال ہیرلڈ بدین طریق است کہ سہ ہزار تلنگی آتشباز از افواج راجل و سپاہ صف دیدہ و تو پچیان جلادت نشان با چند توپ دشمن کوب بہ متصل چوب پھانسی صف بستہ و سواران رسالۂ اول و رسالہ اسکیز و یک رسالہ غلامی بہ یمین و یسار پیادگان چون کوہ البرز قائم گشتند، نواب مظلوم را در محافہ یعنی پالکی نشانیدہ بمقتل گاہ در آوردند۔ آن وقت اصلاً آثار ملال و اندوہ بر چہرہ اش نمایان نبود۔ بقدم مردانہ و ہمت جوانانہ خود را اسپرد، جل نمود۔ بعد از یک ساعت حسب دستور انگریزی فرود آوردند و ہر بند اعضا لیش جدا ساختند ـ۔۔ سوائے فوج انگریزی کسی از سکنائے دہلی و نواحی آن چہ از امیر و چہ از فقیر، از زنان و چہ از طفلان بہر تماشا نیامدہ ـ۔۔ ہر چند قتل گاہ بر متصل شہر قرار دادند لیکن متنفسی بہر دیدن قتل نواب نیامد ـ۔۔۔۔(19)

اگرچہ سلطنت برطانیہ کے کارندوں اور ایجنٹوں کی پوری کوشش رہی کہ نواب شمس الدین کو ایک سر پھرے قاتل اور مجرم کا درجہ دے دیں لیکن مولوی رجب علی نے سلطان الاخبار کے توسط سے زوردار طریقہ سے ایسی کوششوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی اور نہیں وطن عزیز کے ایک جانباز سپوت کے طور پر پیش کیا۔ چنانچہ کریم خاں اور نواب شمس الدین کو تختہ دار پر چڑھانے میں شریک گواہوں اور جاسوسوں کو جب حضور سلطان دہلی کی طرف سے خلعت اور مال و دولت

عطا کیا گیا تو مدیر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"این انعام و مشاهره بقدر فراست و زبان آوری و شهادت است که اهل استحقاق راز زر عطا کردند با میر انداده انداگر گوئی همه مردم فقیران و محتاجان درگاه سلطان اندو بس۔"(20)

انگریزوں نے انتقام کا یہ سلسلہ یہیں بند نہیں کیا بلکہ سلطان الاخبار (6 ستمبر 1835ء) کی اطلاع کے مطابق دیوان کشن لال پر بھی یہ الزام لگایا گیا کہ وہ بھی فریزر کے قتل میں ملوث تھے۔ اس خبر پر بڑے طنزیہ انداز میں مولوی رجب علی لکھتے ہیں کہ:

"شاید که ارباب انصاف بقتل نواب شمس الدین رفع ملال نه کرده اند که بقتل هندوی دیده طمع دوخته اند، باید دید که این مقدمه چه رنگ بروی آورد۔"(21)

اس دور کے تقریباً سارے فارسی اخبارات کی تحریروں سے انگریزوں کی مذکورہ استبدانہ روش کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی نوع کے اخبارات میں ماہ عالم افروز بھی شامل ہے، جو انگریزی سرکار کے کالے کارناموں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ چنانچہ جب ایک موقع پر فوج کے کچھ افسروں کے ہاتھوں ایک عورت کا قتل ہو گیا تو اخبار "ماہ عالم افروز" نے "خبر خون ناگہانی" کے عنوان سے یہ خبر چھاپا کہ:

"شور محشر برپا شد و مردمان ده برین واقعه وقوف یافتند و چون مور و ملخ بمشاهدهٔ زن مهلوکه فراهم شدند و بمحله پولیس آنجا خبر کردند بعد ازین بصاحب مجسٹریٹ اطلاع این معنی گردید۔"

قاتل انگریز افسر نے مجسٹریٹ کے سامنے اس قتل کا اعتراف یوں کیا کہ:

"فی الواقع این عورت از دست من بهلاکت رسیده است، اما در حالت نادانستگی۔ چرا که ارادهٔ من به هلاکت زن نبود۔ نشانه بر سگ نمودم ناگاه غلوله بندوق از نشانه خطا کرد ۔"

'فاضل مجسٹریٹ' نے انگریز کو اس بنا پر بری کر دیا کیوں کہ اس کے مطابق مقتول عورت عمداً قتل نہیں کی گئی تھی۔ اس پر "ماہ عالم افروز" نے اعتراض کیا اور کسی بزرگ کا ردعمل نقل کیا جنھوں بڑے تلخ انداز میں کہا تھا کہ:

"صاحب مجسٹریٹ پاس قومیت خود فرمودہ قاتل را کہ مقتول بود بلا جرم وتقصور از علت خون بی گناہی مخلصی دادند۔ اگر کسی مرد غریب واز قومیت دیگر بودے البتہ سپر دورہ می شدے و پنج و شش ماہ حاجت و حوالات بسر اوقات خود ساختے۔ بعدہ ہر آن چہ از پیشگاہ حکام ذوی الاحتشام بر حالش شرف نفاذ گردیدے، مستوجب آن بودے۔" (22)

اس کے علاوہ دوسرے فارسی اخبارات جو ہمیشہ ہر قسم کی ناانصافی اور ظلم و جبر کے خلاف دبی دبی یا بہ بانگ دہل صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور عوام و خواص کے دلوں میں اس استبدادی نظام کو ختم کرنے کے لیے آگ بھڑکاتے رہے، ان میں احسن الاخبار، سراج الاخبار، آئینۂ سکندر، دور بین وغیرہ کا نام آتا ہے لیکن "گلشن نو بہار" ان میں سب سے جری اور بے باک تھا۔ چنانچہ کلکتہ سے متعلق پارلیمانی کاغذات سے اس کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے:

"متعدد ہندوستانی مدیر اس ایکٹ (پریس ایکٹ) کی زد میں آئے۔ باغیانہ قسم کے مضامین شائع کرنے کے جرم میں دور بین، سلطان الاخبار اور سماچار سدھا برشن کے طابع اور ناشر پر سپریم کورٹ میں مقدمے چلائے گئے   ایک اور اخبار گلشن نو بہار کا مطبع بحق سرکار ضبط کر کے اس اخبار کو بند کر دیا گیا۔" (23)

"گلشن نو بہار" کے ایڈیٹر عبدالقادر کی بے باکی بے مثل تھی۔ وہ بڑے سخت اور طنز و تشنیع سے لبریز زبان استعمال کرتے تھے اور بقول محمد عتیق صدیقی کمپنی بہادر کی حکومت کے پورے ہیبت و جبروت کے سامنے اس قسم کی باتوں کو لکھ کر چھاپنے کے لیے رستم و سکندر ہی کی ہمت درکار تھی۔ (24) چنانچہ عین اس زمانے میں جب بغاوت اپنے شباب پر تھی اور انگریزی حکومت کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اس موقع پر ہندوستانی اخبارات نے حکومت پر طنز کرتے ہوئے یہ خبر شائع کی کہ اودھ کی طرح ہی ریاست ٹراون کور (Travancore) کو بھی بدانتظامی کی بنا پر سرکار ضبط کرنے والی ہے اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ الور کا علاقہ بھی سرکار انگریزی کے قلم رو میں شامل کر لیا جائے گا۔ (25) اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے بڑے طنزیہ انداز میں لکھا، جس کا ترجمہ Martin نے اپنی کتاب Indian Empire کے جلد اول، صفحہ 23 پر درج کیا ہے کہ:

"پہلے تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس فتنہ و فساد کو روکے جو ہندوستان کے

چپہ چپہ میں پھیل گیا ہے، اس کے بعد ہی جہانگیری کی حرص وہوس زِل میں لائے۔ کرمان کو چٹ کر جانے کی ہوس میں نے کی تھی، لیکن اچانک یہ کیڑے میرا ہی سر چاٹ گئے۔ خدا قادر مطلق ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ایک لمحہ میں کائنات کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے اور اب تو خداوندان الحاق (انگریزی حکومت) کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا کہ لکھنؤ کی ضبطی نے کیسا قیامت برپا کیا ہے اور خود انھیں کے ہمنواؤں کو کس قدر تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس برے دور میں اس کا جو بھی نتیجہ نکلے لیکن سچ تو ہے کہ دہلی والوں کو ہمت و شجاعت میں رستم کا فرزند اور سکندر وقت کہنا چاہیے۔ اے خدا! ہمارے دشمنوں کو نیست و نابود اور ہمارے سلطان کی مدد و اعانت فرما۔"

اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک خط میں (4 جولائی 1857ء) بغاوت کے حالات سے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو مطلع کرتے ہوئے مذکورہ نوعیت کے مضامین کے حوالے سے "گلشن نوبہار" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"کلکتے کے ایک لیتھوگرافنگ پریس کا اجازت نامہ بھی ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپے خانے کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے۔ یہ قدم ہم نے اس وجہ سے اٹھایا کہ اس چھاپے خانے میں ایک فارسی اخبار گلشن نوبہار چھپتا تھا، جس میں 21 ماہ حال کو دو انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔" (26)

چنانچہ گلشن نوبہار کی طرح ہی دوسرے فارسی اور دیسی اخبارات کے ساتھ بھی حکومت بڑی سختی سے پیش آئی اور ایکٹ نمبر XV 1857ء تمام ہندوستانی اور یوروپی اخبارات پر ایک سال کے لیے نافذ کر دیا گیا۔ (27) انفرادی طور پر مختلف اخبارات یا مختلف علاقوں کے لیے احکامات جاری ہوئے اور مجموعی طور پر بھی، لیکن یہ بات طے ہے کہ بغاوت کی ناکامی کے ساتھ ہی اخبارات پر بڑی آفت نازل ہوئی، مدیران جن دار و رسن کی آزمائشوں سے دوچار ہوئے، ان کی اطلاع کہیں کہیں مل جاتی ہے۔ بعض کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بعض کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان کے بارے میں سرکاری دستاویزات سے بھی خبریں مل جاتی ہیں، مثلاً پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ:

"پنجاب کے اخبارات پر بہ آسانی شدید سنسر عائد کر دیا گیا۔ پشاور میں مر تضائی کے ایڈیٹر کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں قید کر کے اس کا اخبار بند کر دیا گیا۔ اسی طرح ملتان کے دیسی اخبار کی اشاعت بھی روک دی گئی۔ چشمۂ فیض کے ایڈیٹر کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اخبار کو سیالکوٹ سے لاہور منتقل کرے مدار السلطنت (لاہور) میں، جہاں پہلے ہی سے دو اخبار شائع ہوتے تھے، ان کے ساتھ ہی اس اخبار (چشمۂ فیض) کی بھی کڑی نگرانی کی گئی۔" (28)

10 مئی 1857ء کو سرزمین میرٹھ سے عظیم بغاوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آزادی کے جیالوں نے فرنگی جبر و استبداد کے چنگل سے وطن کی بازیابی کے لیے پورے جوش و خروش سے علم بغاوت بلند کیا اور اس جبروتی نظام کو ختم کرنے کا عہد کیا، لیکن اس دن کے واقعات کی تفصیل فارسی یا اردو اخبارات میں دستیاب نہیں، البتہ ان باغیوں کا براہ راست اپنے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے تھا اور قلعہ کو ان واقعات کی پوری خبر تھی، چنانچہ "سراج الاخبار" کے توسط سے اس دن کے واقعات کی خبر ملتی ہے:

"یوم دوشنبہ شانزدہم رمضان (مطابق 11 مئی 1857ء)

سحر چون خسرو خاور علم بر کوہساران زد فرمانروائے اقلیم ہند بعد نماز دست دعا پیش داور داد... (پس ازآن) شرف نبض شناسی بہ احترام الدولہ بہادر (حکیم احسن اللہ خان) بخشیدند و حضار دربار ذی اقتدار حاضر بارگاہ شدند۔ بگذشت ہشتم ساعت نجومی روز۔ بعرض رسید کہ سوار پیادہ ملازمان انگریزی کہ از ضلع میرٹھ عدول حکمی از حکام وقت آن جا نمودہ وافسران خود بقتل رسانیدہ جوق در جوق و خیل خیل بفضائے زیر جھروکہ حاضر شدند و می شوند و بالفتاح دریچۂ جھروکہ آواز می دہند۔ ہمان دم سیف الدولہ بہادر را یاد فرمودہ گہر ریز ارشاد گشتند کہ قلعہ دار بہادر (کیپٹن ڈگلس) را برین ماجرا مطلع نمایند۔ چنانچہ وکیل سلطانی حکم والا را کار بند شدہ قلعہ دار بہادر را بحضور حاضر آورد۔ ان بہادر از بالائے دیوان خاص بجمیع انبوہ سوار و پیادہ کہ مجتمع زیر جھروکہ بودند آواز داد کہ بحضور تکلیف نہ دہید وازاین جائے دیگر بروید۔ چنانچہ ازین ندا بطرف راج گھاٹ روانہ گردیدند۔ وحکم والا تبار بہ مسدودی دروازہ ہائی قلعہ شرف نفاذ یافت۔ درین اثنا قلعہ دار

بہادر اجازت خواہ گردید کہ بزیر جھروکہ رسانیدہ بان جمع کثیر مانع و مزاحم آید۔
حضور پرنور و ہم حکمت پناہ ازاین ارادہ باز داشتہ آن بہادر بمکانش مرخص ساخت
، مبادا کہ از دست آن گروہ کشتہ شود۔ چنانچہ قلعہ دار بہادر بصد اصرار حکمت پناہ بر
مکان خود رفت و نیز برای عطای دو پالکی برای سواری میم ہا و دو ضرب اتواپ رعد
آواز معروض نمود۔ فرمودند کہ ہمین وقت ہمراہ آن بہادر نمایند وقتی کہ آن دو پالکی
ہا و توپہا نزد بہادر (کمشنر سائمن فریزر) بہ کوٹھی قلعہ دار بہادر آمدہ بہ سواری بگھی و
ہمراہی سواران بہ در کلکتہ رفتہ باز مراجعت بہ قلعہ مبارک نمود و در اثنائی آن از یک
دو ترک سوار مقابلہ و مجادلہ گردید۔ بوقت ادخال ارک مبارک از بگھی فرود آمدہ
ہمرہی یک کس دیگر انگریز در چھتہ لاہوری دروازہ بہ دست سیف گرفتہ بچل قدمی
پرداخت و حکم بہ مسدودی همان در جاری ساخت۔ درین تردد مردر یک دو ترک
سوار و تلنگہ بہ سازش سپاہیان متعینہ در مذکور در آمدند و کاران بہادر بہ انجام
رسانیدند۔ بعدہ تلنگان متعینہ ہر دو در دروازہ ارک در وا کردند۔ بلکہ دروازہ ہای شہر
پناہ ہم بکشودند و آن گروہ چون مور و ملخ از ہر دری تاختند و قلعہ دار و دیگر میم ہا بہ خون
آغشتند و مکانش بہ غارت بردند بلکہ جمیع اہالیان انگریزی را، چہ اہل سیف و قلم
رہ عدم فرستادند و مکنۂ آنہا بہ سوختند۔ شہر یار از استماع چنین خبر وحشت اثر
کمال مشوش شدہ درین شورش و طغیان بی تمیزی صوہا جائے قلع و قمع واقع
شد۔ قریب دو پہر گروہ ہا گروہ بہ حضور حاضر شدند و التماس نمودند کہ فرزندان والا
تبار را بر سرمایان افسر فرمایند تا انتظام شہر بوسیلہ آن شہریار زادہ ہا پردازیم۔ چند
شہنشاہ دین پناہ شنای بحر حیرت گشتہ غواص تفکر نمودند مگر در شاہوار بجز چنین رائے
بکف نیاوردند کہ بنا بر نظم و نسق شہر برخورداران کامگار را برگمارند۔ بدون آن
چارہ ندیدند کہ تنظیم کوچہ و برزن حسب مراد بہ ظہور گیرد۔ ورنہ ازاین گروہ بی دانش
بسا دشواری و خرابی بر سر رعایا و برایا خواہند آورد۔ حتی الوسع ازین امر پہلو تہی کردن
و اعراض نمودن خرمن ہستی بے چارگان رعیت درون و بیرون شہر سوختنی است۔
ناچار فرزندان ذیشان مثل مرزا بخت بہادر و مرزا عبید اللہ بہادر وغیرہ برگزیدند و

افسر فرق آن گروہ ساختند تا صورت امن و آسائش شہر بمعصۂ ظہور آید "(29)

ان اخبارات نے پہلی جنگ آزادی 1857ء کے لیے لوگوں کی ذہن سازی کی اور لوگوں کو انگریزوں کے ظلم واستبداد سے آگاہ کیا اور آزادی کی جو چنگاری عوام کے دلوں میں جل رہی تھی، اسے جذبہ قربانی کی ہوا دے کر شعلہ فشاں کیا۔ بلاشبہ ملک وملت کے لیے ان کی یہ خدمات نا قابل فراموش ہیں ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حضرات کے کارناموں کو صرف آرکائیوز کی زینت نہ بنایا جائے، بلکہ عام لوگوں کو ان سے آگاہ کیا جائے۔ خاص طور سے ب جب کہ آزادی کے ساٹھ سال پورے ہو جانے کے بعد آزادی کے فراموش شدہ جیالوں کے کارناموں کو نئے سرے سے یاد کرنے کی کوششیں جاری ہیں ۔ فارسی اخبارات اور ان کے مدیران کے کارنامے بھی بہر صورت یاد کیے جانے کے مستحق ہیں۔

حواشی و مآخذ

1۔ Calcutta Jounalism, Vol. II, No 98, April 23 1822, Page-583 بحوالہ محمد عتیق صدیقی

2۔ خطبات گارسیں دتاسی، ۲۱۸

3۔ Donogh, History of Law & Sedition, Page-184-83

4۔ Home Dept., June 29, 1857, Parliamentry Paper, House of Commons 1857-58, Vol 43, Paper253, page 41.

5۔ M. K. Chanda, History of English Press in Bengal, Page 358.

6۔ Hutchinson, Empire of the Nabobs, Page-135

7۔ Dr. S. P. Sen, The Indian Press, Page 39

8۔ J. Natrajan, Page 66

9۔ سلطان الاخبار، 2 ستمبر 1835ء، شمارہ: 8

10۔ سلطان الاخبار، یکم اگست 1833ء، شمارہ یکم

11۔ سلطان الاخبار، یکم اگست 1833ء، شمارہ 1

12۔ سلطان الاخبار، 9 اگست 1833ء، شمارہ 2

13۔ ایضاً

14۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: 247

15۔ سلطان الاخبار، 2 ستمبر 1835ء

16۔ ایضاً

17۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، حصہ اول، ص: 87

18۔ سلطان الاخبار، 9 اگست 1835ء

19۔ سلطان الاخبار، 25 اکتوبر 1833ء
20۔ سلطان الاخبار، 30 اگست 1835ء
21۔ سلطان الاخبار، 6 ستمبر 1835ء
22۔ ماہ عالم افروز، یکم مارچ 1836ء
23۔ Natrajan, History of Indian journalism, Page-68
24۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: 405
25۔ ایضاً
26۔ Parliamentary Papers, Vol 44, Pt.I, Page-363 بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: 404
27۔ Dr. S. P. Sen, The Indian Press, Page3
28۔ Punjab Government Records, Vol, Pt. 2, page-20 بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: 399-398
29۔ سراج الاخبار، 11 مئی 1857ء

ذرائع ترسیل وابلاغ اور ۱۸۵۷

ہندوستان کی اولین جدوجہد آزادی (1857) میں ترسیل ذرائع وابلاغ نے نہایت اہم کارنامہ انجام دیا اس سے مفر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں اگر ہندوستانیوں نے اپنے طریقے اپنائے تو انگریزوں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور ذرائع ترسیل وابلاغ ٹیلی گراف کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا، جس سے ڈلہوزی نے Engine of Power کے نام سے یاد کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریز جب یہاں آئے تو اس وقت پوری دنیا میں صنعتی انقلاب کا دور دورہ تھا ہر طرف مختلف ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں کی جارہی تھیں، انگریزوں نے بھی اس میں اپنا حصہ ادا کیا اور جوں جوں اس ملک میں ان کا اقتدار وسیع ہوتا چلا گیا توں توں ان کیلئے انتظامی مسائل پیدا ہوتے چلے گئے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پورے ملک میں ٹرینوں کا جال بچھایا، پوسٹ آفس کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی ٹیلی گرام کا نظم ونسق تیار کیا تاکہ نقل وحمل میں آسانی ہو، اطلاعات جلد از جلد ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائی جاسکیں، یہ سارے کام ہندوستانیوں کی خیر خواہی میں کیئے گئے ایسا ہرگز بھی نہیں کیوں کہ اس وقت تک ہندوستانی اپنے پیغامات ہرکاروں اور پیغام رسانوں کے ذریعہ ہی پہنچاتے تھے جس کیلئے یہ افراد گھوڑوں، اونٹوں، بیل گاڑیوں، تانگوں، کشتیوں، بہنگی اور پالکی جیسی مروجہ سواریوں کا استعمال کرتے تھے خواہ پیغامات کس قدر اہم کیوں نہ ہوں۔ عام ہندوستانی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ڈاک تار یا ٹیلی گرام کے نظام کا فائدہ اٹھا سکے۔ کیونکہ اگر ٹیلی گرام کی سہولت کی ہی بات کی جائے تو بہت دنوں تک اس پر انگریزوں کا ہی قبضہ تھا ۔ ہندوستان میں پہلی بار ٹیلی گراف 1839 میں ڈبلیو بی او شاگنے (ہندوستانی ٹیلی گراف کے بابائے آدم) اور ان کے امریکی معاون ایف بی مورسے کی ایما پر کلکتہ سے ڈائمنڈ ہربر کے درمیان بچھائی گئی لیکن اس کا آغاز ایسٹ انڈیا کی منظوری کے بعد 5 نومبر 1850 سے ہی ہوسکا۔ اس ضمن میں کام جاری رہا اور 1854 میں

ہندوستان کا پہلا ٹیلی گراف ایکٹ وجود میں آیا اس طرح یہ سہولت ہندوستانیوں کو بہت بعد میں یعنی (1855) میں نصیب ہوئی، وہ بھی بہت مہنگی یعنی عوام کو 16 رالفاظ کو 400 رمیل تک روانہ کرنے کے لئے ایک روپے کی خطیر رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اس وقت تک رائج ذرائع ترسیل وابلاغ کو بہتر بنانے کی جو بھی کوشش کی اس کا خو طرخواہ فائدہ انھوں نے خود ہی اٹھایا۔ 1857 میں جب اولین جدوجہد آزادی شروع ہوئی اس وقت تک انگریزوں کے ذریعہ یہاں تقریباً 4250 میل لمبی تار لائن بچھادی گئی تھی اور پیغامات حاصل کرنے کیلئے چھیالس Recieving Offices بنائے جا چکے تھے۔ اس سب کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام اہم مقامات خصوصاً فوجی اہمیت کے مقامات کو رابطہ میں رکھا جا سکے ،انگریزوں کا یہ ایسا کارنامہ تھا جس کے ذریعہ انگریز مجاہدین کے خلاف اپنی فوجی مہم بخوبی چلانے میں کامیاب رہے۔ جب مجاہدین آزادی کو اس آلۂ ترسیل سے شدید نقصان ہونے لگا تو انھوں نے بھی اپنے طور پر کوشش کی کہ وہ اس نظام ترسیل وابلاغ کو زک پہنچائیں بلکہ اسے نیست و نابود کردیں جسے سامراجی اپنی مقصد برآوری کے لئے استعمال کررہے تھے۔ اپنی اس کوشش کے تحت انھوں نے 918 رمیل لمبی تار لائن کو نقصان بھی پہنچایا تھا جس سے انگریزوں کو تقریباً 5 رلاکھ کا خسارہ اٹھانا پڑا تھا۔ اس قسم کی پہلی کارروائی 25 رجنوری 1857 کو اس وقت دیکھنے کو ملی جب بیرک پور کا تار گھر جلا ڈالا گیا۔

اس بغاوت میں انگریزوں نے ابتداء سے ہی ڈاک تار نظام کا فائدہ اٹھایا لیکن جوں ہی مجاہدین کو معلوم ہوا کہ اس محکمے کے ذریعہ خبروں کی ترسیل کا عمل انجام دے کر ان کی بیخ کنی کی جارہی ہے اور اس طرح ان کے مقاصد پر آنچ آرہی ہے، انھوں نے ڈاک تار کے نظام پر متواتر حملے کیے تاکہ یہ نظام مفلوج ہوجائے اور کامیابی ان کے قدم چومے۔ 1857 کی ایک رپورٹ کے مطابق صرف ممبئی سرکل میں دس ڈاک بنگلہ اور سات ڈاک گھر جلادئے گئے تھے۔ نیز دس ڈاک گھروں کو جبراً بند کردیا گیا تھا یہاں تک کہ ڈاک کے ریکارڈ اور ٹکٹ وغیرہ بھی جلادئے گئے۔ ڈاک کے ملازمین اور افسران کا قتل ہوا ان میں شملہ کے پوسٹ ماسٹر ایف ڈائسن کا دلی میں مجاہدین نے صفایا کردیا۔

1857 اور 1858 کے دوران جب ہر چہار جانب تحریک آزادی کا شور وغوغا تھا محکمہ ڈاک نے تقریباً 23 رلاکھ خطوط متعلقہ افراد تک نہیں پہونچائے بلکہ انھیں "ڈیڈ لیٹر آفس" پہونچا دیا گیا۔ یہ خطوط کس قدر اہمیت کے حامل تھے اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان خطوط میں یقیناً اس دور کی سچی تصویر کشی کی گئی

ہوگی ،عوام الناس نے اپنے خطوط میں رشتہ داروں ،عزیزوں کو اس وقت کے سماجی کرب سے آشنا کرایا ہوگا۔ اگر وہ خطوط آج موجود ہوتے ،ان کے ذریعہ بھی ہم اس دور کی ایک سچی تاریخ مرتب کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ انگریزوں نے انتہائی بد دیانتی کا ثبوت دیا اور خطوط Dead Letter Office بھیج کر امانت میں خیانت کی ورنہ ان خطوط سے یہ ضرور مترشح ہو جاتا کہ اس جنگ کے دوران انگریزوں نے کس قدر بے رحمی کا ثبوت دیا تھا اور انھوں نے ہندوستانیوں کی مزاحمت کو کچل دینے کے لئے کون کون سے حربے اپنائے تھے۔ نیز یہ بھی کہ ملک کے کس علاقے کے کس جیالے نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر انگریزوں سے لوہا لیا تھا اور وہ کس قدر کامیاب ہوئے تھے۔ انگریزوں نے ان لاکھوں خطوط کو اس منطق کی بنا پر متعلقہ افراد تک نہیں پہنچایا کہ یہ افراد جو ان خطوط کے Addressee ہیں یا تو شہید ہو گئے ہیں یا نقل مکانی کر کے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ یقیناً ان کا یہ جواز قابل قبول نہیں ہے اور بہ فرض محال اگر ایسا ہے بھی تو اس سے انگریزوں کی سامراجی ذہنیت اور ان کے ذریعہ روا رکھی جانے والی بربریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط اصل پتہ پر نہیں پہونچانے کی اصل وجہ وہ نہیں ہے جسے انگریزوں نے اپنا دامن بچانے کے لئے بتائی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جن ذرائع کے ذریعہ خطوط عوام تک پہونچائے جاتے تھے انھیں انگریزوں نے اپنی جان بچانے کے لئے استعمال کیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ڈاک محکمہ کی بیل گاڑیوں اور دوسرے ذرائع کے سہارے تقریباً 18000 افراد کو محفوظ مقامات پر پہنچایا گیا تھا خصوصاً رانی گنج سے الہ آباد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے نقل وحمل میں اس محکمہ کی سواریوں نے بہت مدد کی تھی ،یعنی ڈاک محکمہ کی گاڑیاں جب انگریز افسروں کی جان بچانے میں لگی ہوئی تھیں تو خطوط کو انکے متعین مقام تک پہونچانے کی زحمت کون کرتا اور کیوں کرتا جب کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے ذریعہ سماج میں موجود کرب میں اضافہ کے قوی امکانات ہیں۔ اس کی ایک مثال 17 رفروری 1856 میں انھوں نے دیکھ ہی لی تھی جب اودھ کے غاصبانہ الحاق سے ناراض 19 ویں اور 34 ویں پلٹن نے اسے نا انصافی قرار دیتے ہوئے خط و کتابت کے ذریعہ ہی تختہ پلٹنے کی کوشش کی تھی ،کیونکہ مجاہدین نے دستی خطوط کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا تھا لیکن اس سے انگریز چوکنا ضرور ہو گئے تھے ،اس سلسلے کی ایک کامیاب کارروائی جنوری 1857 میں اس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب رانی گنج الہ آباد میں ایک یورپین کا مکان جلا دیا گیا ساتھ ہی ایک تار گھر بھی ،یہ ایک علامتی کارروائی تھی کہ کبھی مجاہدین آزادی اور عوام اس قسم کے عمل کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے لئے ایک پلٹن سے دوسرے پلٹن کے نام خطوط بھی روانہ کئے گئے تھے۔ خصوصاً کمل کے پھول نے ایک علامت کی شکل اختیار کر لی تھی کمل کا پھول ایک پلٹن سے دوسری پلٹن میں گھمایا جاتا اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب کمل کا پھول ایک پلٹن میں

پہنچتا تو اسے تمام سپاہی یکے بعد دیگرے اپنے ہاتھوں میں لیکر جہاد میں شامل ہونے کا عہد کرتے۔ اس طرح پلٹن کے آخری سپاہی کے ہاتھوں کمل کا پھول دوسری پلٹن تک پہنچایا جاتا تاکہ ان کی رضامندی بھی حاصل کرلی جائے اور عہد و پیمان بھی لے لیا جائے کہ وہ سب جدوجہد آزادی کے لئے تیار ہیں تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے لاتعداد کمل کے پھول خاموش ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بنے۔

اس ضمن میں چھوٹی چھوٹی چپاتیاں پیغامات کے ارسال کی علامت کے طور پر استعمال ہوئیں جسے انگریز آخر آخر تک سمجھ نہیں پائے اور نہ ہی انھیں سراغ پانے میں کوئی کامیابی ملی۔ اس طرح کے پیغام پہنچانے میں گاؤں کے چوکیداروں نے اہم کام انجام دیا۔ چوکیدار اسے ایک دوسرے کو Pass on کر دیتے تھے جب چپاتی دوسرے گاؤں پہنچتی تو چوکیدار اس کا ایک ٹکڑا خود کھا کر بقیہ گاؤں والوں کو بطور تبرک تقسیم کردیتا پھر دوسرے گاؤں سے چپاتیاں بنا کر اپنے پاس کے گاؤں روانہ کی جاتیں جس کا مقصد یہ اعلان کرنا ہوتا کہ ہم بھی گاؤں والے اس قومی جدوجہد آزادی کیلئے تیار ہیں اور اب ان کی باری ہے اس طرح یہ ذریعہ ترسیل آزادی کے مشن کو آگے بڑھانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ دیگر چیزوں مثلاً لوک گیت، صوفیانہ پیغامات وغیرہ نے بھی مجاہدین کیلئے پیغام رسائی کا عمل انجام دیا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ ان مجاہدین آزادی کے پاس ڈاک تار کا کوئی نظام نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ اس سے ان کا راز فاش ہونے کا بھی خدشہ تھا، علامتی پیغام رسانی کا یہ عمل ان متحدہ کوششوں کا حصہ تھیں جس کے تحت 31/ مئی کو ملک میں جنگ آزادی چھیڑی جانی تھی جس کا منصوبہ عظیم اللہ خان نے بنایا تھا لیکن منگل پانڈے کے جوش وجذبہ سے جنگ آزادی کا یہ بگل مقررہ وقت سے پہلے بج اٹھا ورنہ اگر منصوبہ بند طریقہ پر کام کیا جاتا تو اس جدوجہد آزادی کو سیکڑوں سامراجی طاقتیں بھی مل کر ناکام نہیں بنا سکتی تھیں۔ بہر حال یہ ذکر تو ضمناً آگیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ بغاوت کی خبریں ارسال کرنے کیلئے اگر انگریزوں نے اپنے طریقہ ہائے کار کو استعمال کیا جو ان کے بس میں تھا تو ہندوستانی مجاہدین آزادی نے قدیم ذرائع ابلاغ کو اپنا ہتھیار بنایا اس عمل میں ہرکاروں اور خبر نویسوں کا اہم رول رہا جو نہایت خاموشی سے انگریزوں کے نقل وحرکت کی خبر مجاہدین تک پہونچاتے تھے یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بغاوت فرو ہونے کے بعد ہرکاروں تک کو بھی نہیں بخشا انھیں تختہ دار پہ لٹکایا اس قسم کی انتقامی کارروائی کے شکار ہونے والوں میں اشوری پرساد مہا جن کا نام نامی سر فہرست ہے انھوں نے نہایت خوبی سے متبادل ڈاک نظام چلانے کا اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہ عظیم مجاہد آزادی بنارس کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس کام کے لئے بھوانی بھیکھو،

مہندی، نارائن کرمی، مخدوم، شیتل، بدھن، ایودھیا اور مدھئی کو بطور ہرکارہ استعمال کیا تھا جنہیں 14 ستمبر کو جلال پور (جون پور) کے تھانہ دار گنگا شرن نے گرفتار کرلیا۔ انہیں H.G. Aistel کی عدالت نے 16 اکتوبر 1857 کو پھانسی کی سزا سنائی۔ انہیں انگریزوں نے ان سبھی افراد کو مجاہدین سے وفاداری کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انگریزوں نے اپنی منتقمانہ ذہنیت کے تحت ہرکاروں خبرنویسوں کے ساتھ ساتھ گویوں، شاعروں اور مغنیوں کو بھی اپنا نشانہ بنایا جنھوں نے اشعار اور لوک گیت کے ذریعہ خبروں اور پیغامات کے ترسیل کا عمل انجام دیا اور اسی کی پاداش میں انہیں دار و رسن سے نبرد آزمائی کرنی پڑی۔

1857 کی اولین تحریک آزادی (غدر) کے متعلق پہلا ٹیلی گرام 10 رمئی کی شب میں میرٹھ سے دلی کے چیف کمشنر بریگیڈیر سائمن فریزر (Brigadier Simon Frazer) کو روانہ کیا گیا تھا جس میں مجاہدین کی پیش رفت سے متعلق اطلاعات تھیں۔ لیکن جب چوکیدار نے انہیں یہ ٹیلی گرام دینے کی کوشش کی تو سے انھوں نے قابل اعتناء نہ گردانا اور وہ اسے پڑھے بغیر کھانا کھا کر اپنی کرسی پر سو گئے۔ ان کے ملازم خاص نے تار کی اہمیت کی پیش نظر جب انہیں جگا کر یہ پیغام دینا چاہا تو وہ اس پر برہم ہو گئے اور ٹیلی گرام اپنی جیب میں ڈال لیا۔ بہر حال یہ خواب ان کیلئے خواب غفلت ثابت ہوا اور 11 رمئی کی صبح جب وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے تب تک مجاہدین آزادی دہلی پہونچ چکے تھے سائمن فریزر نے اپنی سکت بھر کوشش کی کہ مجاہدین کو دہلی میں داخل ہونے سے روکا جائے انگریزوں نے ہنڈن ندی پار کرتے وقت پوری کوشش کی کہ مجاہدین پر قابو پایا جاسکے۔ لیکن ناکامی ان کا مقدر رہی۔ ملاحظہ فرمائیں فریزر کے ذریعہ روانہ کیے گیے تار کی نقل جس سے کئی حقیقتیں واضح ہو جائیں گی۔

ایک ٹیلی گرام کے مطابق ان کے مقابے کیلئے 54 ایں فوجی پلٹن روانہ کی گئی لیکن انہوں نے اپنے بھائیوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان کا ساتھ دینا بہتر سمجھا اور ان کے ساتھ اس جدوجہد میں شریک ہوگئے اور لال قلعہ پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ اور رہنما بنانے کا اعلان کر دیا۔ نیز جدوجہد کی کمان ان کو سونپ دی۔ جن کی قیادت میں دلی تقریباً ساڑھے چار ماہ تک آزادی کا جشن مناتی رہی۔ پہلی بار دھوکا کھا جانے کے بعد انگریز چوکنا ہو گئے اور اس آلۂ ترسیل کا سہارا لیکر آگے کی خبر بڑی مستعدی اور چالاکی سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک اہم افراد تک روانہ کرتے رہے جس کی سب سے اچھی مثال 11 رمئی 1857 کو دن سے انبالہ سے روانہ کیا گیا وہ تار ہے جو یوں تو محض 78 الفاظ پر مشتمل تھا لیکن اس کے اندر پیغامات کی کئی کڑیاں موجود تھیں۔ دیکھیں اس تار کی اصل کاپی جو نیشنل آرکائیوز سے حاصل کی گئی ہے۔

HONBLE EAST INDIA COMPANY'S ELECTRIC TELEGRAPH

Message, from Delhi 11th May
From Brigadier Frazer
Comdg at Delhi
Comdg at Amballa
Number of words 78 Services

To: Amballa
To: Brigadier

Cantonment in a state of siege. Mutineers from Meerut. 3rd Light Cavalry number not known said to be one hundred and fifty men cut off. Communication with Meerut taken possession of Bridge of Boats. 54 th N.I sent against them but would not act. Several officers killed and wounded. City in a state of considerable excitement. Troops sent down but nothing certain yet. Further information will be forwarded. Copy to be sent to Brigadier in command Rqwelpindie.

L.N. Frazer
Inspector in charge

Electric Telegraph Officer
12th May, 1857
Dispatch 7.20 a.m.

Recd. For trans-Date 11th May, 1857

From Amballa To All Stations

The following just recd. from Delhi. We must leave office all the Bungalows are being burnt down by the sepoys of Meerut. They came in this morning. We are off don't roll down today. Mr. C.Todd is dead we think. He went out this morning and has not returned yet. We heard that nine Europeans were killed. Good Bye

L.N.Fraser Rawelpindee

یہ چند الفاظ انگریزوں کو خبردار کرنے کیلئے کافی ثابت ہوئے۔اس ٹیلی گرام میں سی ٹاڈ اور دیگر نو یوروپین افراد کے مارے جانے کی اطلاع تو تھی ہی دیگر اطلاعات بھی دی گئی تھیں جس سے انگریز چوکنا ہو جائیں۔اس ٹیلی گرام کی ایک کاپی راولپنڈی میں بریگیڈیئر ان کمانڈ کو بھی بھیجی گئی تھی۔اس جنگ آزادی میں انگریزوں نے ہر وقت یہ کوشش کی کہ اس آلۂ ترسیل کے ذریعہ ہر اہم خبر اور معلومات گورنر جنرل تک جلد از جلد پہنچائی جائے تاکہ وہ اس پر مستعدی سے کام کر سکیں۔دی لندن ٹائمس کے نامہ نگار رسل نے بھی جو اس وقت یہاں رپورٹنگ کرنے آیا تھا ان ذرائع ترسیل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ٹیلی گراف انگریزوں کی فوج کیلئے نہایت کامیاب ہتھیار تھا۔اس کی مدد سے فوجیوں کی تعیناتی، فتح وظفر کی خبر روانہ کرنے اور فوجیوں کا

حوصلہ بڑھانے کا کام تو لیا ہی گیا مختلف مقامات پر ان کی موجودگی کا پتہ لگانے کا کام بھی لیا گیا، اس کی مدد سے مجاہدین سے درپیش خطرات کی نشاندہی کا کام بھی لیا گیا۔ اسی طرح پنجاب کے سر جان لارنس نے دعویٰ کیا ہے کہ ہمیں ٹیلی گراف نے بچالیا۔ دراصل یہ بیان مانٹگمری کا ہے۔ جنھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ الکٹرک ٹیلی گراف نے ہندوستان کو بچالیا ان کا یہ بیان صد فیصد درست ہے کیوں کہ اگر انگریز اس ذریعہ ترسیل کو استعمال نہ کرتے تو مجاہدین کے جذبہ حریت کے سامنے وہ ٹھہر نہیں پاتے اور انھیں اس ملک سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑتا۔

اس میں شک نہیں کہ ان ذرائع ترسیل وابلاغ کے سہارے انگریزوں نے جدوجہد آزادی کے شعلے کو بجھانے میں بڑی حد تک مدد لی اور یہ سچ بھی ہے کہ جن جن مقامات پر جدوجہد آزادی کا شعلہ جلد بجھا وہاں وہاں ٹیلی گراف اور دیگر ذرائع ترسیل وابلاغ نے نمایاں رول ادا کیا۔ یہ اسی آلہ ترسیل وابلاغ کا کمال تھا کہ ولیم براڈش نے میرٹھ میں بغاوت کی خبر جلد از جلد انگریزوں تک پہنچائی اور انھیں خبردار کیا کہ وہ اپنے جان ومال کی حفاظت کریں اس سے ایک بیان اور منسوب ہے کہ اس نے ٹیلی گراف کے تار کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ وہی تار ہے جس نے ہمارا گلا گھونٹ دیا اس قول کو صد فیصد درست نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اسی آلہ ترسیل نے انگریزوں کی خوب مدد بھی کی تھی۔ ہاں یہ بات مجاہدین پر صادق نظر آتی ہے کہ اسی آلہ ترسیل کے ذریعہ ان کے مشن پر کاری ضرب لگائی گئی اور مجاہدین کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ جبھی تو مجاہدین نے اسے "تار کی مار" سے تعبیر کیا اور اسے گزند پہنچانے کی اپنی سی سعی کی۔ اس آلہ ترسیل کے ذریعہ مدد بہم پہنچانے کی ایک مثال اس وقت بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ جب کنور سنگھ کی پیش قدمی روکنے کیلئے گورنر جنرل نے بہت جلد حکمت عملی بنائی، ہوا یوں کہ 13 رفروری 1857 کو اسے خبر ملی کہ کنور سنگھ اجودھیا میں ہیں اور ان کے پاس آٹھ سو سپاہی ہیں تو ان کے مقابلے کیلئے گورنر جنرل نے ایسی حکمت عملی تیار کی کہ انہیں میدان چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح 27 رمئی 1857 کو بنارس کے کمشنر نے گورنر جنرل کو خبر دی کہ محمد حسن نے مان سنگھ پر حملہ کر دیا ہے تو انکی مدد کیلئے فوراً ضروری تیاری کی گئی مختصر یہ کہ انگریز جدید آلہ ترسیل وابلاغ کا سہارا لیکر اپنی حکمت عملی بناتے رہے اور پیش رفت کرتے رہے جب کہ ہندوستانی مجاہدین نے اپنے جوش، جذبے اور ولولے کی بدولت آگے بڑھنے کی کوشش کی گو کہ اس کام میں ہرکاروں اور مخبروں نے انکا ساتھ ضرور دیا لیکن برق رفتار ٹیلی گرام کے آگے مجاہدین آزادی کا کچھ بس نہ چل سکا اور ناکامی ان کا مقدر بنتی چلی گئی لیکن اس جنگ آزادی میں مارے جانے والے سورما سپوتوں نے ہمیں یہ پیغام دے دیا کہ عزم مصمم ہو تو بڑے بڑوں کو ناکوں چنے چبوایا جاسکتا ہے۔ اور اسی عزم کے ساتھ ہندوستان کی جدوجہد آزادی 1947 تک جاری رہی اور 15 راگست 1947 کو ہم آزاد فضا میں سانس لینے کے اہل بن سکے۔